خیالاتِ
مہاتما گاندھی

جس میں اُن کی تحریرات کے منتخبات بھی شامل ہیں

مصنّفہ

سی۔ ایف۔ اینڈریوز

حصّہ ۱

نقشِ اوّل

تعدادِ اشاعت ۱۰۰۰

فہرستِ مضامین

۱- عرضِ حال منجانب مترجم ...
۲- تمہید ...
۳- عام ہندوستانی الفاظ کی مختصر فہرست
۴- دیباچہ ...

حصۂ اوّل

مذہبی ماحول

ابواب

۱- ہندو مذہب کا پس منظر ... ...
۲- ہندو مسلمانوں کا مسئلہ ... ...
۳- عیسائیت سے تعلق ... ...
۴- "حضرت عیسیٰ کا مرتبہ" ... ...
۵- روحی قوت کا آشرم ... ...
۶- سودیشی کا مذہبی مفہوم ... ...
۷- اہنسا کی تعلیم ... ...
۸- کھدّر کا اخلاقی پہلو ... ...
۹- ہماری اور اُن کی ذلت ... ...

بلبلِ ہند

مسز سروجنی نائیڈو

کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

"جس دور میں سے ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں خصوصیت کیساتھ صحیح ترجمہ کی ضرورت ہے یعنی ایک زبان میں جو کچھ شائع ہوا ہے، اُسکا پورا پورا مفہوم دوسری زبان میں ادا ہو جائے، ایسا مفہوم جو اصل روح کے عین مطابق ہو" ہلیئر بیلاک

جو کتاب آپ پبلک کی خدمت میں پیش کیجا رہی ہے، وہ مسٹر اینڈریوز کی ایک نہایت دلچسپ کتاب کا ترجمہ ہے جو مسٹر گاندھی کے متعلق تحریر کی گئی ہے۔ چونکہ اصل کتاب ضرورت سے زیادہ مشرح ہے اس لئے میرے لئے اس امر کی ضرورت نہیں کہ میں بھی اس کے مضامین کے بارے میں کچھ عرض کروں تاہم میں ترجمہ کے متعلق کچھ عرض کروں گا

ترجمہ کرتے وقت مترجم کو بالعموم تین قسم کی عبارتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اولاً ایسی طرز عبارت جسکی مثال اردو میں پہلے سے موجود ہے اس قسم کی عبارتوں کا ترجمہ کرنا نسبتاً سہل کام ہے۔ دوسری قسم کی طرز عبارت وہ ہے جسکی مثال اردو لٹریچر میں موجود نہیں یہ بہت مشکل کام ہے ا۔ مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت رکھنے کے باوجود اسکی اصل روح کو واضح کرنے کی غرض سے محنت شاقہ اٹھانی پڑتی ہے اور اس کے بعد بھی شبہ رہتا ہے کہ آیا وہ اس میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں تیسری قسم کی عبارت وہ ہے جو بلحاظ تراکیب وابستہ انگریزی ہے (بشرطیکہ اصل کتاب اُس زبان میں ہو) ایسی عبارتوں کا جوں کا توں ترجمہ کر دینا یا اس طرح سے ترجمہ کر دینا جس سے اُن کا قریب ترین مفہوم ادا ہو جائے، اگرچہ مشکل امر ہے تاہم دوسری شق سے زیادہ نہیں ایسی عبارتوں کے ترجمہ سے ہم زبان اردو کے دامن کو دن بدن زیادہ وسیع کر سکتے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ ایسی عبارتوں کا استعمال اب روز بروز ترقی پر ہے

اس کتاب میں مجھے تینوں قسم کی تراکیب سے واسطہ پڑا ہے اور میری تمامتر کوشش یہی رہی ہے کہ اُنکا

ترجمہ پڑھتے وقت محض اردو داں اور انگریزی سے کلیتاً نابلد طبقہ کوئی غرابت محسوس نہ کرے اسکے علاوہ میں نے ایک اور امر کا التزام ملحوظ رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے حتی الامکان ایک لفظ کو بھی نظرانداز نہیں کیا کیونکہ میرا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے اصل روح کے نظرانداز ہوجانیکا خطرہ رہتا ہے۔ بہرحال ترجمہ ترجمہ ہے اور تصنیف تصنیف۔ ترجمہ پڑھتے وقت یہ امید ہرگز نہیں رکھنی چاہیئے کہ اُس میں اصلی کلام کا سا پورا رنگ یا زور موجود ہوگا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کئی جگہ عبارت کا زور گھٹ گیا ہے یا اس کا ایسا انداز ہوگیا ہے جو مقابلتہً پست تر ہے لیکن میں نے ایمانداری کیساتھ جس بات کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ زیادہ سے زیادہ اصل کے قریب رہے

مسٹر گاندھی کی مشہور و معروف تصنیف جو اُن کی خود نوشت سوانح عمری پر مشتمل ہے، "تلاش حق" کے نام سے جامعہ مِلیّہ کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ میں نے کہیں کہیں اس سے استفادہ کیا ہے اور میرا فرض ہے کہ میں شکریہ کیساتھ اس حقیقت کا ذکر کردوں اسکے ساتھ ہی میں اپنے مخلص دوست ڈاکٹر سید سجّاد صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی) کا بھی شکرگذار ہوں کہ انھوں نے اپنے قیام بمبئی کے زمانہ میں بعض انگریزی الفاظ کے بہترین اردو مترادف بہم پہونچائے

میں استادی مسٹر سی، الیف، اینڈریوز کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دلوائی بلکہ میرے لئے آسانیاں بھی بہم پہونچائیں۔ آخر میں میسرز جارج ایلن اینڈ اَنون لمیٹڈ، پبلشرز، لندن کا بھی شکرگذار ہوں کہ انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے ترجمہ کی اجازت عطا کی۔ اگر اُن کی پیدا کردہ آسانیاں موجود نہ ہوتیں تو ممکن ہے کہ کتاب سرے سے منصۂ شہود پر ہی نہ آتی۔

حصۂ اول

مذہبی ماحول

MAHATMA GANDHI

(As a law-student in London 42 years ago)

کا ذاتی طور پر مطالعہ کرنے کے بعد بہت عرصہ قبل کھینچا تھا۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ مہاتما گاندھی کے خیالات کے بارے میں میری ذاتی رائے بہت وسیع حد تک اُن کی رائے کے ساتھ تطابق کھا گئی ہے۔ ایک اعتبار سے موجودہ کتاب کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ رولینڈ کی زبردست کتاب کے ضمیمہ کا درجہ رکھتی ہے معرکہ الآرا تصنیف ہونے کی حیثیت سے اسمیں گاندھی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی مثال کسی زبان میں نہیں مل سکتی، مگر مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے اُسے انفرادی تصویر کی حیثیت سے ممکن ہے قابل قدر قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ اسکی بنیاد مہاتما گاندھی کے ساتھ پندرہ سال سے زیادہ کی دوستی، ذاتی تعلقات اور ذاتی روابط پر قائم ہے

میں نے بعض مشمولہ اقتباسات کو اور زیادہ مختصر کرنیکی جرأت کی ہے تاکہ جو محدود جگہ میرے پاس ہے اُس کا بہترین استعمال کیا جا سکے۔ اُن ہندوستانی الفاظ کی مختصر فہرست جو متن کتاب میں متعدد بار استعمال میں آئے ہیں، اِس جلد کی ابتدا میں درج کر دی گئی ہے اور میں نے اُن مزید مشکلات کی جو مغربی قارئین کو پیش آ سکتی تھیں حواشی میں تشریح کر دی ہے

میرے عزیز رفیق پرنسپل رابرٹ روسا موٹن؎ اور اُن کے عملہ نے (ٹسکیگی واقع الاباما میں) طباعت کی غرض سے اس کتاب کی تیاری میں اُس زمانہ میں جبکہ میں ٹسکیگی میں اُن کے یہاں مقیم تھا، ازراہ نوازش بے حد

؎ ROBERT RUSSA MOTON

امداد فرمائی ہے۔ میرے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ میں اس کتاب کو اُن کے نام نامی کے ساتھ نسبت دے رہا ہوں۔ ساتھ ہی میں نہایت خوشی کے ساتھ مس اسٹوری[1]، رگھوناتھ راؤ اور جولیٹ[2] راؤ مقیم جنیوا کا اور امریکہ کی اِس جدید دنیا میں بشپ پیڈک[3] اور مسز پیڈک، کربی پیج[4]، رچرڈ گرگ[5]، ڈاکٹر اینسن فیلپس سٹوکس[6]، ڈاکٹر جیس جونز[7]، چارلس گالکی[8]، ولبر تھامس[9]، ہریداس موزمدار، بین چیرنگٹن[10] و ایڈیتھ چیرنگٹن، مسز روتھ کرینسٹن[11]، ڈاکٹر ہیلن ریڈ[12] اور کرتار سنگھ کا بھی شکر گزار ہوں

اس طویل فہرست سے جسے اور بھی طویل بنایا جا سکتا تھا، ظاہر ہو سکے گا کہ مجھے اپنے دوستوں کی محبت آمیز خدمت پر کس حد تک اعتماد کرنا پڑا ہے تاکہ میں مطلوبہ مدت میں اس کتاب کو منصۂ شہود پر لا سکوں مسٹر ایچ، ایس، ایل پولک[13] نے جو مہاتما گاندھی کے اور میرے مدت العمر کے دوست ہیں انگلستان میں پروفوں کی تصحیح کی ذمہ داری قبول فرمائی ہے کیونکہ میں برطانوی گائنا میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے کتاب کی طباعت کے وقت انگلستان میں موجود نہ ہونگا

---

[1] MISS STOREY [2] JULIETTE [3] BISHOP PADDOCK [4] KIRBY PAGE [5] RICHARD GREGG [6] DR ANSON PHELPS STOKES [7] DR JESS JONES [8] CHARLES GILKEY [9] W THOMAS [10] B. CHERRINGTON [11] MRS. RUTH CRANSTON [12] HELEN REID [13] H. S L POLAK

اِس جلد سے اور آنے والی جلد سے جو کچھ بھی منافع ہوگا، وہ مہاتما گاندھی کی محبت آمیز منظوری سے پیئرسن ہموریل ہاسپٹل واقع شانتی نکیتن کی نذر کیا جائے گا۔ ولکی پیئرسنؒ ہم دونوں کے بہت ہی عزیز دوست تھے اور اس لئے ہمیں بہت خوشی ہوگی اگر ہم اِس طریقہ سے ان کی یاد کو تازہ رکھنے میں ممد و معاون ہوسکیں گے

میں اس امر سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اب بھی مہاتما گاندھی کے بہت سے معرکۃ الآرا خیالات ایسے رہ گئے ہیں جو اِس کتاب میں جگہ نہیں پاسکے، ان میں سے بعض کو دوسری جلد میں شامل کرلیا گیا ہے جس کا تعلق اُن کی زندگی سے ہوگا۔ لیکن تنگ حدود خواہ وہ دو جلدوں ہی کے کیوں نہ ہوں اس امر کو مشکل بنا دیتے ہیں کہ ایک ایسی سیرت کو جو اُن کی طرح اتنے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہو، کما حقہٗ پبلک کے روبرو پیش کیا جاسکے۔ کتاب اور اقتباسات کو کافی طریقہ سے مختصر کرنے کا کام سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے

اگر میری تحریر کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا تو میں بعد کے زمانہ میں شاعر یعنی رابندرا ناتھ ٹیگور کی زندگی اور تصانیف کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کروں گا، اس لئے کہ مغرب میں انہی دو نمایاں شخصیتوں کے گہرے مطالعہ سے جدید ہندوستان کے جذبات اور محسوسات کو بطریقِ احسن سمجھا جاسکتا ہے

سی۔ ایف، اینڈریوز

ہیلی فیکس، نوواسکوشیا

Wilkie Pearson ol

عام ہندوستانی الفاظ کی مختصر فہرست جو کتاب میں استعمال کیے گئے ہیں

احترام کے القاب

لفظ	معنی
مہاتما	مہاتما گاندھی کا لقب جس کے معنی بڑی روح کے ہیں
گورودیو	ٹیگور کا لقب جس کے معنی محترم استاد کے ہیں

دو مذہبی ادارے

سابرمتی آشرم	مہاتما گاندھی کا مذہبی ادارہ جو احمد آباد کے قریب واقع ہے
شانتی نکیتن آشرم	رابندر ناتھ ٹیگور کا مذہبی ادارہ جو کلکتہ کے قریب واقع ہے

الفاظ جو ستیاگرہ میں استعمال کئے گئے تھے

اہمسا	عدم تشدد
ستیا	سچائی
ستیاگرہ	سچائی کی طاقت یا روحی طاقت
ستیاگرہی	روحی طاقت پر عمل پیرا ہونے والا

مسلمانوں کے مذہبی مصطلحات

اسلام	حضرت محمد (ص) کا مذہب

معنی	لفظ
متعلق بہ اسلام یا مسلمان	مسلم
پیروِ اسلام	مسلمان
خلیفۃ المسلمین کا عہدہ	خلافت
مسلمانوں کا مذہبی پیشوا	خلیفہ

سنسکرت کی کتبِ مقدسہ

قدیم ترین مذہبی گیت	وید
قدیم ترین مذہبی فلسفہ	اپنشد
ہندوؤں کے مقدس قصص	پُران

ہندو مذہب

مذہب	دھرم
ذات پات کا دھرم	ورن آشرم دھرم
قدیم ہندو مذہب	سناتن دھرم
راسخ الاعتقاد ہندو	سناتنی

چار ذاتیں

پہلی ذات (علم)	برہمن

لفظ	معنی
چھتری	دوسری ذات (حکومت)
ویش	تیسری ذات (حرفت و تجارت و زراعت)
شودر	چوتھی ذات (محنت و مزدوری)

چار مذہبی منازل

برہمچریہ	مذہبی زندگی کی پہلی منزل (عصمت و عفت و پاکبازی)
گرہست	مذہبی زندگی کی دوسری منزل (خانگی زندگی)
ونا پرست	مذہبی زندگی کی تیسری منزل (تدریجی ترک دنیا)
سنیاس	مذہبی زندگی کی چوتھی منزل (کلی ترک دنیا)

دو عظیم الشان رزمیہ نظمیں

مہابھارت	قومی رزمیہ نظم جس میں سری کرشن جی خدا کے اوتار کی حیثیت سے ظاہر ہوئے ہیں بھگوت گیتا اسی رزم کا ایک حصہ ہے
رامائن	شمالی ہندوستان کی مقدس رزمیہ نظم جس میں رام خدا کے اوتار کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں

لفظ		معنی

سیاسی مصطلحات

لفظ		معنی
سودیشی	. . . .	وطنی یا وطن کی بنی ہوئی
سوراج	. . . .	حکومت خود اختیاری مکمل حکومت

دیباچہ

موہن داس کرم چند گاندھی پوربندر میں جو ساحل کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے، ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد ریاست کے دیوان رہ چکے تھے۔ اور یہ عہدہ چند پشتوں سے اُن کے خاندان میں گویا موروثی ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر اُن کے خاندان کو اُس حصۂ ملک میں نہایت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اس کے افراد سیرت کی مضبوطی اور صیانت کے لئے کافی مشہور تھے۔ موہن داس گاندھی کے والد ماجد کے بارے میں ایک کہانی بہت شہرت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب وہ کچھ عرصہ کے لئے خود اپنی ریاست سے برطرف ہو گئے اور انھوں نے دوسری ریاست میں ملازمت اختیار کر لی تو انھوں نے دوسرے راجہ کو سیدھے ہاتھ سے سلام کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میری معزولی کے باوجود میرا دایاں ہاتھ میرے پہلے آقا کے لئے مخصوص ہے اور اُس سے میں کسی دوسرے شخص کو سلام نہیں کر سکتا

نوعمر لڑکے کی ماں مذہب کی پابند تھی اور اپنے عقیدہ میں نہایت پختہ اور یہی دو باتیں زندگی بھر اُسکی سیرت پر بہت گہرا اثر ڈالتی رہیں لڑکے کی مذہبی فطرت پر کسی اور شخص کے مقابلہ میں ماں کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ اُنکی خود نوشت سوانح عمری سے یہ بات عیاں ہو جاتی

کہ جن میں ان کی زندگی پر جس نے سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ ان کی وطن تھی
کہ کاٹھیاواڑ کی ہندو ریاستوں میں باوجود مغرب سے تعلقات قائم
ہو جانے کے پچاس سال پہلے کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی
وہاں کے لوگ زیادہ تر اور قدرے آزاد طبع واقع ہوئے ہیں۔ اور اگرچہ مغرب
نے اپنی جدت طرازیوں سے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا تاہم انھوں
نے اپنی روش اور رسم و رواج میں کسی قسم کی تبدیلی مناسب نہیں سمجھی
یہی وجہ ہے کہ نو عمر لڑکے کی پرورش ایسے ہندو ماحول میں ہوئی جسکا بیرونی دنیا سے کم تعلق تھا
میں نے ایک سے زائد مرتبہ ملک کے اس خطہ کی سیاحت کی ہے،
اس غرض سے کہ بشرط امکان میں اس راز کو معلوم کروں جو مہاتما گاندھی
اور سوامی دیانند سرسوتی (بانی آریہ سماج) جیسے نمایاں اشخاص کی
زندگیوں کی تہ میں جلوہ گر ہے، اس لئے کہ فی الحقیقت یہ حیرت انگیز
امر ہے کہ جدید ہندوستان کے دو زبردست معاشرتی اور مذہبی رہنما
یعنی دیانند اور گاندھی دونوں کے دونوں کاٹھیاواڑ جیسے چھوٹے
سے جزیرہ نما میں پیدا ہوئے تھے۔

پوربندر سوامی دیانند کے مقام پیدائش موروی سے قدرے
مختلف ہے۔ وہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور سمندر میں دور تک چلا
گیا ہے اور اپنے گرد و پیش پہنائے سمندر کی غیر محدود اور گوناگوں
دلچسپیاں اور دل آویزیاں رکھتا ہے۔ غیر معمولی خوبصورتی رکھنے
والے بادل ہمیشہ سمندر سے اٹھتے ہیں اور ساری سرزمین پر

چھا جاتے ہیں۔ خود سمندر عام طور پر ایک چمکدار منظر پیش کرتا ہے جس کے پانی کا رنگ سبز ہے اور جہاں مچھلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ پڑے رہتے ہیں میں نے اونچائی پر بیٹھ کر گھنٹوں اس کے تغیر پذیر رنگوں کا مشاہدہ کیا ہے بالخصوص اُسوقت جبکہ سورج کی کرنیں اُس پر رقص کرتی ہیں۔ وہ چھوٹا سا شہر جہاں موہن داس گاندھی پیدا ہوئے تھے تقریباً سمندر ہی سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت جب ترچھی کرنیں اُسپر گرتی ہیں تو وہ نور کا پیکر بن جاتا ہے، اور اس کے مینارے، برجیاں اور کلس سنہری رنگ میں رنگ جاتے ہیں

برخلاف اسکے مورووی اندر کی طرف صحرائے راجپوتانہ کے لق و دق ویرانہ کے قریب واقع ہے جو شمال کی جانب مسلسل میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ موروی کی زمین پہاڑی ہے اور سارے کا سارا ملک ناہموار سطح رکھتا ہے۔ غالباً یہ قیاس کی کارفرمائی نہ ہوگی اگر اس امر پر یقین کرلیا جائے کہ ان دونوں بڑے ریفارمروں میں سے ہر ایک کا بچپن اپنے ماحول سے بیحد متاثر ہوا ہے

گاندھی جی کے مکان کے قریب سمندر کی لہریں ٹکرا کر ہر وقت آواز پیدا کرتی رہتی ہیں، اپنی فطرت میں مستور رنگ بھی رکھتے ہیں جو دیانند میں اس قدر واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ سیرت کے اعتبار سے ہر دو مذہب کو ہر قسم کی آلائش سے پاک رکھنے کے حامی ہیں اور جنوب میں یعنی ہندو کے ہندوستان میں ہندو مذہب کو جس کثرت و افراط کے ساتھ علامتوں

اور تصاویر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اُس سے دونوں کو کوئی محبت نہیں۔ لیکن جہاں دیانند نے جوشِ اصلاح میں مورتی پوجا کو کلیتاً مسترد کر دیا ہے وہاں موہن داس گاندھی نے امورِ دنیا کی مذہبی اسکیم میں اس کے لئے گنجائش نکال رکھی ہے۔ وہ دیانند سے کہیں زیادہ قدامت پسند واقع ہوئے ہیں

ایک اور خیال کاٹھیاواڑ کے زمانۂ قیام میں میرے دل میں آیا۔ صحرا ہمیشہ سے قریب رہا ہے ہندوستان کے اِس مغربی خطہ میں عرب سے بہت نزدیک آ گئے ہیں۔ اس طرح برِ ایشیا کے بڑے بڑے صحراؤں کے بالکل قریب ہی بود و باش رکھنے والے ہندوؤں میں جو اشخاص نہایت زیادہ غور و فکر کے عادی ہیں اور جو خدا کی طرف سے نہایت ہی حساس فطرت لیکر آئے ہیں اُنہیں اسلام کے مستور پہلو (تصوف) اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت کے بارے میں اسکی ہمہ گیر اور مرکزی صداقت کو سمجھنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ سندھ میں جو جانب غرب ذرا زیادہ فاصلہ پر نیز صحرا کی سرحد پر واقع ہے جتنے ہندو صوفی گذرے ہیں وہ ایسی نظمیں لکھ گئے ہیں جنہیں اسلام کے صوفی منش بزرگوں کے کلام سے ممیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے

اس دیباچہ میں میں مہاتما گاندھی کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن میں صرف اُنکی زندگی کا ہلکا سا خاکہ کھینچ دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ آنے والے ابواب کے لئے

راستہ صاف کردے۔ دوسری جلد میں میری یہ بہت بڑی تمنا ہے کہ میں
اُس احوال پر تبصرہ لکھنے کے قابل بنوں جسے خود انھوں نے اپنی کتاب
"ایکس پیری مینٹس وِد ٹروتھ"[1] میں تحریر کیا ہے۔ اس خود نوشت سوانح
عمری میں انھوں نے حیرت انگیز صفائی اور فروتنی کے ساتھ اپنے ذاتی
کیرکٹر پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا کوئی مستند احوال ایسا نہیں ہے جو اس
کتاب کی طرح حیرت انگیز طریقہ سے روشنی ڈالنے والا ہو اور اس لئے
اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اُسے مغرب کے لوگوں کے لئے
ایڈٹ کرکے پیش کیا جائے

موہن داس گاندھی کی زندگی میں انقلاب انگیز موقع اُس وقت
آیا جبکہ وہ اپنی تعلیم ختم کرنے اور بیرسٹری کی پوری ٹریننگ کرنے
کے لئے بالآخر انگلستان جانے کے قابل ہوگئے۔ انگلستان میں چند
سال انھوں نے بسر کئے وہ اُن کی تمام زندگی میں پُر از حوادث
ثابت ہوئے ہیں۔ کاٹھیاواڑ سے لندن کی تبدیلی بہت زیادہ تھی،
وہ تنہائی سے بہت زیادہ گھبرائے اور متعدد بار ان کے ارادوں
میں لغزش پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن اُنکی والدہ کے اثر اور اُن کی
آخری نصائح نے جو اُنہوں نے انگلستان روانہ ہوتے وقت انہیں
کی تھیں۔ اُنہیں تمام آزمائشوں میں نہایت ثابت قدم رکھا۔ وہاں انھوں
نے بالکل تجرد اور سادگی کی زندگی بسر کی جس نے جوں جوں سال
گذرتے گئے ان کی سیرت کو اخلاقی لحاظ سے اور زیادہ طاقتور بنا دیا

[1] اس کتاب کا ترجمہ "تلاش حق" کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوچکا ہے۔ مترجم

موہن داس گاندھی کے والد کا انتقال اُن کے بچپن ہی میں ہو گیا جبکہ وہ اُن کے پاس کاٹھیاواڑ میں رہا کرتے تھے۔ نوعمر لڑکے کی شادی ابتدائی عمر میں اس طرح سے کردی گئی کہ اس میں انکی پسند کو کوئی دخل نہ تھا چنانچہ جب وہ گھر سے انگلستان روانہ ہوئے تو وہ باپ بن چکے تھے۔ اس طرح سے وہ قبل از وقت اپنی جوانی کو پہنچ گئے اور دنیاوی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لئے تن تنہا رہ گئے۔ اُن کی والدہ ان کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی سرگباش ہو چکی تھیں، اس نوجوانی میں یہ صدمہ اُن کے لئے سب سے زیادہ جاں گداز ثابت ہوا

انگلستان سے اپنے وطن واپس آ جانے پر انھوں نے بمبئی اور کاٹھیاواڑ دونوں میں بیرسٹری کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ اُن کی فطری جھجھک اُن کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئی۔ اور اُن کی درشتی آمیز ایمانداری اور عریاں صداقت نے انہیں اُن مختلف ترکیبوں کے اختیار کرنے سے روکا جسکے ذریعہ نوعمر بیرسٹر اپنے لئے موکل حاصل کیا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں چند سال تک مقابلتہً ناکام رہنے کے بعد کم سے کم جہانتک دنیاوی امور کا تعلق تھا، انہیں جنوبی افریقہ میں جانے کی دعوت ملی تاکہ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک مسلمان باشندے کی طرف سے ایک مقدمہ کی پیروی کریں جس نے جنوبی افریقہ میں سوداگر کی حیثیت سے بے انتہا دولت کمائی تھی۔ جب وہ جنوبی افریقہ پہنچے ہیں تو اسوقت اُن کا ارادہ نہ تھا کہ اس مدت سے زیادہ ٹھہریں جو مقدمہ کی تکمیل کے لئے ضروری تھی

لیکن جن سخت تکالیف کے ماتحت اُن کے اہل ملک وہاں زندگیاں بسر کر رہے تھے اس نے انہیں ترغیب دی کہ وہ انہی کے ساتھ ٹھہریں اور اُن کی مصائب میں حصہ لیں۔ جنوبی افریقہ میں انہیں بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرنے کی اجازت مل گئی اور ہندوستانیوں کے مقدمات چلانیوالے مشہور وکلا میں اُن کا شمار ہونے لگا یا یک زمانہ میں اُن کی آمدنی ۵۰۰۰ پونڈ سالانہ سے تجاوز کر گئی۔ اِس دنیاوی خوشحالی اور ظاہری کامیابی کے دوران میں ٹالسٹائی کے جاری کردہ مطمح نظر نے جو عرصہ دراز سے اُن کے زیر غور تھا عقیدہ کی ایسی پختگی کے ساتھ اُن کے دل پر اثر کیا کہ انھوں نے بالآخر مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر مفلسی کی زندگی اختیار کر لیں تاکہ وہ اپنے تمام افعال و اعمال میں راہبانہ زہد اور کلی عدم تشدد کو عملی جامہ پہنا سکیں

ٹالسٹائی کی تعلیم نے انہیں پہاڑی کے وعظ کا مطالعہ کرنیکی طرف متوجہ کر دیا اور اِس نے ان کے اندرونی مقاصد کو واضح تر اور روشن تر بنا دیا انھوں نے اس وعظ کو ان نصائح سے جا ملایا جو بچپن میں انہیں بحیثیت دشنو کے اُن کی والدہ کی طرف سے کی گئی تھیں جس طور پر یہ سب باتیں ظہور پذیر ہوئیں اخود ان کے الفاظ سے عیاں ہو جائیگا جو موجودہ جلد میں مختلف مقامات پر درج کئے گئے ہیں

ٹالسٹائی کی اور پہاڑی کے وعظ کی براہ راست تعلیم کے متعلق

مہاتما گاندھی نے ہمیشہ یہ بات ظاہر کی ہے کہ اگرچہ انہیں ان دونوں میں کوئی نئی یا عجیب غریب بات نہیں ملی تاہم اس کے باوجود حضرت عیسیٰ کے الفاظ اُن کے لئے زندہ الہام اور روحانی طاقت ثابت ہوئے اور یہ کہ وہ الفاظ ذاتی طور پر ان کی زندگی کے نازک ترین موقع پر نہایت ہی قیمتی ثابت ہوئے۔ بالخصوص جبکہ وہ لندن میں دہریت کے سیلاب میں بہنے کے قریب ہو گئے تھے۔ بالآخر اس گڑھے سے وہ بچا لئے گئے

اِس زمانہ کے بعد سے وہ جب تک جنوبی افریقہ میں رہے اِن نئے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں پورے طور پر منہمک رہے۔ ایک طرف ضبطِ نفس اور اندرونی پاکیزگی کے ذریعہ اور دوسری طرف اپنے اہل ملک کی خاطر جد وجہد اور مقاومت مجہول (ستیاگرہ) کی اخلاقی جنگ کے ذریعہ

مہاتما گاندھی سے میری پہلی ملاقات اُن سے اُس زمانہ میں ہوئی جبکہ نیٹال میں مقاومت مجہول کی جنگ قریب الختم تھی۔ بعد میں ہمارے تعلقات گہرے ہو گئے اور میں اُن کے ساتھ رہنے لگ گیا۔ اُن تمام مقاصد میں شریک رہا اور طالبِ حق کی حیثیت سے میں ان کے ذاتی خیالات و خواہشات کے بارے میں بھی استفسارات کرتا رہا۔ یہ دوستی میری عجیب وغریب بشاش زندگی میں عظیم ترین برکات کا موجب رہی ہے۔ اُس نے مجھے اُن کے اصولوں اور طریقوں کا ایسے گہرے طریقہ سے مطالعہ کرنے کے قابل بنا دیا کہ میرے لئے اب یہ معلوم کر لینا ایک حد تک آسان ہو گیا ہے کہ اُن کی کون کون سی تحریرات ایسی ہیں جو نہایت واضح طور پر

ان کے خیالات کا مرقع پیش کر سکتی ہیں
۱۹۱۵ء کی ابتدا میں اُن کے ہندوستان واپس آ جانے کے بعد بھی خوش قسمتی سے مجھے اُن کی معیت میں کافی مدت تک رہنے کا اتفاق ہوا خصوصیت کے ساتھ میری صحبت اُس وقت حاصل ہو جاتی تھی جب کبھی وہ خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ ایسے دو موقعوں پر ۱۹۱۸ء میں اور ۱۹۲۴ء میں ــ میں اُن کے ساتھ دن رات رہتا تھا اور اُن کی حالت یہ تھی کہ وہ قریب قریب موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے۔ اِن دونوں مواقع پر اُن کے صحت یاب ہونے کے دوران میں بالعموم روزمرہ کے کام کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور اس لئے ذاتیات کے متعلق گفتگو اور موقعوں کے مقابلہ میں خلافِ توقع زیادہ رہا کرتی تھی کیونکہ اُسوقت وہ پبلک کاموں سے گھرے رہتے تھے۔ مہاگاندھی کی سیاسی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب ۱۹۲۰ء میں رونما ہوا جبکہ انھوں نے اُن مظالم کے لئے جو اُنکے ملک کے خلاف امرتسر میں ڈھائے گئے تھے اور دوران جنگ میں ہندوستانی مسلمانوں سے کئے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزیوں کے لئے ندامت و پشیمانی کا کھلا ثبوت حاصل کرنے میں بار بار کی ناکامی کے بعد اِس امر کا اعلان کر دیا کہ وہ آیندہ برطانوی حکومت کے ساتھ موالات نہیں کرینگے۔ اُس تحریک کی جزوی ناکامی جو بمبئی اور چورا چوری میں تشدد کے مظاہرات کے سبب اپنے ساتھ ردِ عمل بھی لائی اور وہ ذاتی طور پر اس امر کے لئے تیار ہو گئے کہ سیاسی جدوجہد

سے علیحدگی کرلیں لیکن اُنہیں تشدد کے مظاہرہ کے فوراً بعد ہی گرفتار کرلیا گیا اور قید کردیا گیا۔ اور ۱۹۲۴ء میں انہیں رہا کردیا گیا۔ اس وجہ سے کہ اُن کی صحت شدت کے ساتھ خراب ہوچکی تھی۔ قید کی حالت ہی میں وہ مرض زائدۃ الآورؔ کے لئے خطرناک آپریشن برداشت کرنے پر مجبور ہوئے جس سے وہ بہت طویل عرصہ کے بعد روبصحت ہوئے

اس کے بعد کا سب سے نمایاں واقعہ ۲۱ دن کا برت ہے جو انھوں نے ۱۹۲۴ء کے آخر میں دہلی میں رکھا۔ اس غرض سے کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی فساد کا تدارک ہوجائے۔ ان فسادات میں خوب خونریزی ہوئی تھی اور مہاتما گاندھی نے عامۃ الناس کے گناہوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اس برت کے مقابلہ میں اور کوئی اثر ڈالنے والا واقعہ زمانۂ حال کی تاریخ ہند میں وقوع پذیر نہیں ہوا۔ وہ بہت ہی مقدس واقعہ تھا نہ صرف اُنکے وفادار پیروؤں کی چھوٹی سی جماعت کے لئے جو دوران برت میں ہر وقت ان کے گرد و پیش رہا کرتے تھے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے۔ اس برت کا کم سے کم یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ہندوستان میں دونوں مذاہب کے لیڈروں نے اپنی مشکلات کا روحانی بنیاد پر مشترکہ حل معلوم کرنے کے سلسلہ میں سخت کوششیں کیں

زیادہ حال کے واقعات کا اس دیباچہ میں اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں صحت کی کمزوری جس نے ان تمام سالوں میں مہاتما گاندھی کا

APPENDICITIS ؎

زور شور سے تعاقب جاری رکھا ہے۔ کئی دفعہ نازک صورت اختیار کر چکی ہے اور اب وہ ساٹھویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں اور یہ عمر وہ ہے جو آب و ہوا کی بنا پر مغرب کے مقابلہ میں مشرق میں زیادہ سمجھی جاتی ہے تاہم ان کا مصمم ارادہ ہے کہ وہ تھکا دینے والے سیاسی میدان میں اپنے فرضِ منصبی کو جاری رکھیں۔

اِس مقام پر اس امر کے وضاحت کر دینے کی سخت ضرورت ہے تاکہ مغرب میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ اس بیان میں ذرہ برابر صداقت نہیں کہ مہاتما گاندھی کا اثر اور رسوخ زمانۂ حال میں گھٹ گیا ہے۔ سیاسیات حاضرہ میں عملی شرکت سے علیحدگی نے ہندوستان کے عام باشندوں پر اُن کے روحانی اقتدار میں پہلے سے زیادہ استواری پیدا کر دی ہے۔ میں ہندوستان کے مختلف حصص میں زمانۂ حال کے دوروں میں اُن کے ساتھ رہ چکا ہوں اور میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہوں

باب اول
ہندو مذہب کا پس منظر

غالباً بہت کم باتیں اِتنی مشکل ہونگی جتنی یہ کہ ایک شخص کسی ایسے مذہب کا ہمدردانہ مطالعہ کرنے کی کوشش کرے جس میں وہ پیدا نہیں ہوا۔ جو کوشش اُسے کرنی پڑیگی وہ اُس سے کہیں زیادہ مسلسل ہوگی جتنی کہ اُسے کسی غیر زبان کی نظم کو سمجھنے میں کرنی پڑتی ہے، کیونکہ عبادت کے ہر پہلو نیز کتب مقدسہ کے الفاظ میں اور ایسے الہامی اصولوں میں جنھیں مذہب کا لازمی جزو خیال کیا جاتا ہے اُسے ایک قسم کی غرابت محسوس ہوگی اِس امر کے اندازہ لگانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک ایسے ہندو کی مثال پیش نظر رکھی جائے جو عہدِ عتیق کے بعض حصوں کا مطالعہ پہلی بار کر رہا ہو، یا جس کے روبرو ٹولی کو میونین سروس" کا تذکرہ کیا جائے، مع روٹی اور شراب کے مقدس اجزا کے جو حضرت عیسیٰؑ کے جسم اور خون کے مظہر ہیں، یا جس سے مقدس پولوس کے فلسفہ اختیار و جبر کی تشریح کی جائے، یا عقائد کے بعض ایسے حصص کی تفسیر بیان کی جائے جو دوزخ میں گر لئے جانے، آسمان پر اُٹھائے جانے اور جسم کے دوبارہ زندہ کئے جانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگ عیسائی

مراسم اور کتب مقدسہ کے مخصوص الفاظ کے بچپن ہی سے عادی ہیں لیکن دوسرے لوگ عادی نہیں ہیں مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ شاعر رابندرانا تھ ٹیگور نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "زبور میں قتل انسانی کے جو واقعات درج ہیں، اُن میں سے بعض کو میں بالکل نہیں پڑھ سکا"۔ اُن کے بڑے بھائی نے جو اپنے زمانہ کے نہایت مقدس بوڑھے اشخاص میں سے تھے اور جن کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل رہا ہے، مجھ سے فرمایا تھا کہ "خدا کی مقتول بھیڑ" سے جو تصویر اُن کے دماغ میں کھنچتی ہے وہ حد درجہ گھناؤنی ہے اور گیت کی یہ عبارت کہ "بھیڑ کے خون میں نہایا"، اُنکے خیال میں سخت کراہیت پیدا کرنے والی ہے

میں نے یہ مثالیں اس لئے پیش کی ہیں کہ یہ واضح ہو جائے کہ بعینہ اسی طرح سے ہندو مذہب کے بعض پہلو جو مہاتما گاندھی کی "ہندومت کی تعریف" میں درج ہیں، لازمی طور پر اہل مغرب کو ابتدا میں عجیب و غریب معلوم ہوں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ میں بعض باتوں کی تشریح کر دوں اِس سے قبل کہ میں اُن کے ہندو عقیدہ اور عمل کے بارے میں کچھ لکھوں

ہندو مذہب میں دو عنصر ایسے ہیں جن کا سمجھنا اُسوقت تک مشکل ہے جب تک کہ ایک شخص عرصۂ دراز تک ہندوستان میں نہ رہ چکا ہو اور اُس ملک میں اُن کی اہمیت کا اندازہ نہ کر چکا ہو

ا۔ "ذات" جو ایک قسم کا معاشرتی اور مذہبی نظام ہے

ہندوستان کے معاشرتی نظام میں بظاہر اعلیٰ سوسائٹی کے تین

بڑے مدارج تھے اور یہی وہ تمام بڑی بڑی اقوام میں مذہبی طور پر نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ قدیم ایران میں اور قدیم یونان میں تمیز طریقہ سے نمایاں تھے جہاں آرین زبانیں جو سنسکرت سے ملتی جلتی تھیں روزمرہ استعمال میں آتی تھیں۔ سب سے پہلے پرومتوں یا برہمنوں کا طبقہ تھا جن کا کام یہ تھا کہ وہ مذہبی امور اور مراسم سے واقفیت رکھیں اور کتبِ مقدسہ کی حفاظت کریں۔ دوسرے نمبر پر جنگ کرنے والوں اور نظم و نسق عامہ کرنے والی جماعت تھی جنھیں چھتری کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور وہی مختلف قبیلوں اور فرقوں کی سرداری بھی کرتے تھے۔ تیسرے درجہ پر زراعت کرنے والے لوگ تھے جو ویش کہلاتے تھے۔ ان کا کام کھیتی باڑی کرنا اور دولت پیدا کرنا تھا

سب سے آخر میں ان تینوں طبقوں سے پست تر (اور ممکن ہے ابتداً یہ لوگ مختلف اور مفتوح قوم سے تعلق رکھتے ہوں) شودر لوگ تھے جو مزدوروں کا کام کرتے تھے۔ قدیم یونان میں اس جماعت کو "ہیلٹ"[۱] (غلام) کے نام سے پکارا جاتا اور اسے مطلقاً آریا نسل شمار نہیں کیا جاتا تھا

ہندوستان میں مفتوح غیر آریائی باشندوں کی ایک وسیع تعداد شودر طبقہ میں داخل ہو گئی۔ لیکن انھیں زنار پہننے کی اجازت نہ تھی صرف سوسائٹی کے پہلے تین طبقوں کو جو خالصتاً آریائی نسل کے تھے زنار پہننے کا حق خصوصی حاصل تھا۔ اور وہ بسبب اپنی پیدائش کے اولین

۱؎ HELOT

جماعت کے سرداروں کی حیثیت رکھتے تھے

بعد میں ناما شودروں کا طبقہ معرض وجود میں آیا جو اگرچہ شودروں سے
متعلق تھا لیکن معاشرتی لحاظ سے اُن سے پست تر ہونے کی وجہ سے اُن
سے بھی جدا تھا۔ اُن کا نام بھی پنچما یا پاریار رکھا گیا۔ ان الفاظ سے ایسے
مرتبہ کا اظہار مقصود ہے جو شودروں سے بھی کمتر ہے اور انہیں ادنیٰ ترین
جماعت یعنی اچھوتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ ان ادنیٰ ترین
مفتوح اقوام کے افراد کو جو سیاہ فام ہوتے تھے، کلیتاً حقیر سمجھا گیا اور اُن کے
سپرد غلاظت اُٹھانے جھاڑو دینے، جانوروں کی کھالیں وغیرہ جیسی ادنیٰ
خدمات سپرد کی گئیں جنھیں "ناپاک" پیشے خیال کیا جاتا تھا اس کے بدلہ میں
انھیں جھوٹا کھانا دیا جاتا تھا جو دوسری صورتوں میں کتوں وغیرہ کے
آگے ڈال دینا چاہیئے انہیں بتدریج ایسی ذلت زدہ حالت کو پہونچا دیا گیا کہ
وہ اپنے آپکو زندہ رکھنے کے لئے مردار کھانے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح ان
کے پیشوں نے انہیں ناپاک اور گندہ بنا دیا، اُن کی خوراک بھی ناپاک
چیزوں پر مشتمل تھی اور عامۃ الناس کی جانب سے جو غفلت اُن کے ساتھ
روا رکھی جاتی تھی، اُس نے ان کی حالت کو اور بھی زبوں تر بنا دیا۔ آخر کار
اُن کے متعلق یہ سمجھا جانے لگا کہ اُن سے چھو جانا اور جنوبی ہندوستان کے
بعض حصص میں اُن کے سایہ میں آ جانا بھی انسان کو ناپاک کر دیتا ہے
اور بحیثیت جماعت کے اُن سب کو اچھوت قرار دیدیا گیا

مسٹر گاندھی نے ہندو مذہب کی جو تعریف کی ہے، اس میں اگرچہ انہوں

نے ظاہر کیا ہے کہ وہ ذات پات کے قدیم نظام کے قائل ہیں، تاہم وہ چھوت چھات سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے قطعی انکاری ہیں۔ وہ کسی ذات کو حتیٰ برہمنوں کی ذات کو بھی درجہ میں اعلیٰ سمجھنے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ تمام مردوں اور عورتوں کو مساوی طریقے سے اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے ہر قول و فعل سے انہیں مساوی خیال کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں ہر روز کئی دنوں تک اچھوتوں کے ساتھ نہایت قریبی اور دوستانہ اور برادرانہ تعلقات رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ بھی انہیں باپ کی جگہ پر خیال کرتے ہیں اور ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بہ حیثیت دوست کے اُن کا نام بہت احترام سے لیتے ہیں

اِسی ذات پات کے نظام کے ساتھ ساتھ اور اس سے قریب کا تعلق رکھنے کی وجہ سے ہندوستان کے قدیم آریاؤں میں شادی کے متعلق یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ مذہبی حیثیت رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ ذاتوں نے اسے مقدس رشتہ تسلیم کیا۔ شرفا کی مخصوص جماعت کی حیثیت سے انہوں نے توارث کو بہت زیادہ اہمیت دی اور اپنی نسل کو خالص رکھنے کی غرض سے انہوں نے بعض قواعد کی پابندی اپنے اوپر فرض کر لی۔ شادی کے متعلق یہ طے کر دیا گیا کہ اسے ذات پات کے اندر رچانا چاہیئے اور ہمیشہ ہندوؤں کے مقدس قانون اور رسم کی پابندی ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ذات پات کے اندر رہ کر شادی کی رسم

ذات پات کی جملہ پابندیوں میں سخت ترین بن گئی۔ اس طریقہ پر ہر ذات شادی کے اعتبار سے ایک برادری تسلیم کرلی گئی۔ شادی کے مسئلہ کو ذات کے ساتھ اور ذات کو شادی کے ساتھ اسقدر گہرے طور پر وابستہ کردیا گیا کہ جن لوگوں نے اس تمام مسئلہ کا نہایت غور و خوض کے ساتھ اور سائنٹفک طریقہ سے مطالعہ کیا ہے وہ قاعدۂ کلیہ کے طور پر اس کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں کہ "ہندو مذہب میں ذات شادی کے مترادف ہے اور شادی ذات کے"

ٹھیک جس طرح سے کہ ایک ہی ذات کے اندر شادی لازمی قرار دیدی گئی (اور اس شرط کی خلاف ورزی کبھی عمل میں نہیں آئی) اسیطرح بہت سے ایسے مقدس مواقع ہوا کرتے تھے خصوصاً شادیوں کے اوقات میں جبکہ تمام ذات برادری کے لوگوں کا ایک ہی جگہ ایک ساتھ کھانا کھانا معاشرتی اہمیت کے لحاظ سے اعلیٰ ترین چیز خیال کیا جاتا تھا۔ اس مشترکہ ذات برادری کی تقریب دعوت کے موقع پر کسی کو جگہ دینے سے انکار کرنے یا منع کرنے کے یہ معنی ہوتے تھے کہ اسے برادری سے خارج کردیا گیا ہے۔ یہ نہایت سخت اور خوفناک قسم کی معاشرتی سزا تھی اور ذات برادری سے خارج ہو جانے کے امکان سے زیادہ اور کوئی چیز خوف اور دہشت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی اس لئے کہ اس کے معنی یہ تھے کہ ذات کا کوئی فرد ایسے خارج شدہ شخص کی شادی اپنے بچہ سے نہیں رچا سکے گا

ابتداءً اخلاقی اہمیت کے بہت سے مسائل کا فیصلہ ہر فرقہ کے
لوگ اسی طریقہ پر کر لیا کرتے تھے۔ لیکن سب سے بڑھ کر ہندو مذہب
نے اس طریقۂ شادی کو تقدس کا رنگ دے دیا۔ مختلف ذات کے لوگ
اپنے شادی بیاہ کے جملہ معاملات میں ایک ساتھ پہلو بہ پہلو زندگی بسر
کرتے تھے اور ان میں سے ہر ذات اپنے شادی بیاہ کے معاملات
میں ایک جداگانہ انفرادیت رکھتی تھی۔ مختلف ذاتوں میں آپس کی شادی
عملاً معدوم سی چیز تھی۔

ایک اور نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ابتدائی "چار ذاتیں" مدتیں
ہوئیں کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ذاتوں میں تقسیم ہو گئیں۔ ان میں سے بعض ذاتیں
مقابلتاً بہت مختصر اور محدود ہیں اور اسکی وجہ سے بہت سی مشکلات
پیش آ رہی ہیں۔ اس لئے کہ شادی عرصہ دراز سے ہندوستان کے بہت
سے حصص میں تحتی ذاتوں میں عملاً محدود ہو گئی ہے۔ تحتی ذات میں ایک
لڑکی کے لئے مناسب بر تلاش کرنیکی دقت اکثر اوقات بہت زبردست
ثابت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے باپ کو نسبتاً بہت چھوٹی عمر میں
شادی کے مراسم انجام دیدینے پڑتے ہیں تاکہ اسی تحتی ذات کے
اندر ہی دولھا کا ملنا یقینی ہو جائے۔ اس قسم کی شادیاں مغرب
میں نسبت کے مترادف ہوا کرتی ہیں، لیکن بسا اوقات بہت چھوٹی
عمر میں وہ زناشوئی کے تعلقات کے قیام کا باعث ہو جاتی ہیں۔ باوجود
اس کے زمانۂ حال کے رجحانات یہ ہیں کہ شادی کی عمر اور زناشوئی کے

تعلقات کے قیام کی عمر دونوں میں اضافہ کر دیا جاہئے اور آج کل بڑی عمر میں شادی کرنا زیادہ عام ہوتا جارہا ہے جتنا کہ بالعموم خیال کیا جاتا ہے

۲۔ گائے کی حفاظت ایک مذہبی فریضہ ہے

غالباً اہل مغرب کے لئے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کو سمجھنا اُس احترام کو سمجھنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے جو گائے کے لئے روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ ہم مغرب کے باشندے گائے کے ساتھ حماقت کو ہمیشہ وابستہ رکھتے ہیں جیسا کہ لفظ "بووائن"[1] سے صاف طور پر عیاں ہے لیکن یہاں پر بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم ایک نہایت ہی قدیم اور نہایت ہی مذہبی قوم سے واسطہ رکھ رہے ہیں جس کی روایات میں کبھی تزلزل واقع نہیں ہوا۔ ہم کو منظم انسانی تاریخ کے اُن ابتدائی ایام کا خیال رکھنا چاہئے جبکہ شکاری کی خانہ بدوش زندگی کی جگہ زراعتی زندگی نے لیلی تھی. ہندوستان کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جبکہ گائے جو روزانہ استعمال کے لئے گھی دودھ مہیا کرتی تھی اور زمین کی کاشت میں ہر روز امداد بہم پہنچاتی تھی، گھر کا ایک قیمتی رفیق اور اثاثہ شمار ہونے لگ گئی تھی جسکی تمام خزانوں سے زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے ہندوستان میں اسی گائے کا مذہبی احترام شروع

[1] BOVINE اسم صفت۔ ہر وہ چیز جو گائے یا بیل سے متعلق ہو۔ مجازاً بیوقوفانہ، احمقانہ وغیرہ (مترجم)

ہوا۔ یہ بہت ہی قدیم عقیدہ ہے اور زمین کی ترقی و کاشت کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہے

مجھے عہد عتیق سے ایک مثال پیش کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ ہم جیسے مغرب والوں کو اپیل کر سکے۔ قدیم عبرانی لوگوں میں ہم یہ بات صاف طور سے دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ان معمولی افعال میں سے ہر ایک کے مفہوم میں تقدیس کا خیال وابستہ کر دیا گیا جو روزافزوں یہودی آبادی کو معاشرتی نقصانات سے بچانے والے تھے۔ آج ہم حضرت موسیٰؑ کے قوانین کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن میں صحت کے اصولوں کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن شاید ہم اس امر کا پورا احساس نہیں کرتے کہ اُن کی مذہبی تقدیس ہی وہ چیز تھی جس نے انہیں صحت کے اصولوں کی ایسی احتیاط کے ساتھ پابندی کرنی سکھائی۔

اسی طرح ہندوستان میں گائے کی حفاظت کے تخیل کو ابتدا ہی سے مذہبی تقدیس کا جامہ پہنا دیا گیا۔ گھر کے اِس واحد جانور کو۔ جو ایک کلیتًا زراعتی سوسائٹی کے لئے اسقدر بڑا مذہبی شے ہے ــ مذہبی تقدیس عطا کر دینے سے قدیم ہندوستان نے درحقیقت اپنی صحت بخش زندگی کے ایک بڑے سرچشمے کی حفاظت کر لی۔ آج بھی ہندوستان کے ہندوؤں میں جو محض سبزی خور ہیں دودھ ہی وہ واحد غذا ہے جو اناج کے ساتھ ملکر اُن کی ضروری غذائیت بہم پہنچاتی ہے۔ غالبًا کھانے پینے کی چیزوں میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انہی زیادہ

مقدار میں استعمال میں آتی ہو
لیکن ہندو مذہب نے گائے کے ساتھ جو احترام روا رکھا ہے وہ در اصل اُس احترام کی ابتدا ہے جو تمام ادنیٰ درجہ کے جانوروں کے ساتھ (جیسا کہ ہم انہیں سمجھتے ہیں) روا رکھا جاتا ہے۔ ہندو باشندے انہیں دل سے عزیز رکھتے ہیں اور وہ انہیں انسان سے کم نہیں سمجھتے بلکہ عملاً انسان ہی سمجھتے ہیں۔ یہاں پر ہندوؤں کو سمجھنا پھر ہمارے لئے مشکل ہو جاتا ہے بعینہ جس طرح کہ اُن کے لئے ہمیں سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں تفریح کے لئے یا کھانے کیلئے اسقدر بے خیالی کے ساتھ جانوروں کا جو قتل روا رکھا جاتا ہے جس کے ساتھ اسقدر خونریزی اور تکلیف بھی وابستہ ہوتی ہے، اُسے ہندو نہایت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصہ میں اِس نیم انسانی زندگی کو مقابلتاً انسان کے ہاتھوں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا۔ چھوٹے پرندے اور گلہریاں اور بہت سے چھوٹے جانور جنھیں مغرب میں ہم "وحشی و جنگلی" پکارتے ہیں، ہندوستان میں اسقدر ہلے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ انسان کی موجودگی سے کسی قسم کا خوف نہیں کھاتے۔ اسی کے ساتھ بدقسمتی سے ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن میں تکلیف کی حالت میں بھی جانوروں کے ساتھ غفلت برتی جاتی ہے جو زیادہ تر انتہائی نکبت و افلاس کی شقاوت کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن یہ جانوروں تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے ساتھ بھی روا رکھی جاتی

ہے جس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے

ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ گائے کے لئے جو احترام روا رکھا جاتا ہے جسے دوسرے مذہبی احکام کے ساتھ اسقدر جرأت کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، اُس نے ملک کے باشندوں کو زمین کے ساتھ عجیب و طریقہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ اُس نے ہندوؤں کو نمایاں طور پر زراعتی بنا دیا ہے۔ غالباً دنیا کی کسی قوم میں زمین کے ساتھ ایسی قریبی اور گہری محبت دیکھنے میں نہیں آسکتی۔ آج بھی ہندوستان میں یہ تکلیف دہ اور خلاف قاعدہ نظارہ دیکھنے میں آجاتا ہے جبکہ ہندو حد درجہ شہر میں سختی کے ساتھ اس امر پر اصرار کرتے ہیں (حالانکہ یہ بات میونسپل ضوابط کے جملہ تخیل کے خلاف ہے) کہ انہیں بازاروں اور گلیوں میں اپنے سے قریب گائیں رکھنے کی اجازت دیجائے تاکہ اُن کی موجودگی انہیں ہر وقت اُن کے ملک کی یاد دلاتی رہے جو اُن کا پیدائشی حق ہے

جہاں دنیا کے اور ممالک میں شہری شائستگی کی طرف آنے کے لئے بہت زیادہ دباؤ اور زور ڈالا جاتا ہے وہاں ہندوستان میں گائے کے احترام کی وجہ سے جو راسخ العقیدہ ہندو کے دل میں صدیوں سے جاگزیں ہے، اس کے برعکس زبردست کشش پائی جاتی ہے۔ اگر انسان کے مذہبی دل کے لئے دیہاتی زندگی کی کسی علامت کی اس غرض سے ضرورت پڑے کہ وہ عبادت کے وقت اپنی نظروں کو اس طرف جمائے رکھے تو گائے کی ہندوانہ علامت یقیناً اسقدر خلاف عقل نہ معلوم

ہو گی جتنی کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ اُن بہت سی نشانیوں میں جنہیں عیسائی انجیل کی کہانی میں پیدائشِ مسیح سے منسوب کرتے ہیں مسیح کی ایک نشانی جس میں اُن کا ایک ناند میں پیدا ہونا دکھایا گیا ہے اور اُن کے آس پاس صابر اور ذلیل مویشی کھڑے ہوئے دکھائے گئے ہیں جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صلح و آشتی کے اس عجیب و غریب شاہزادہ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ایسی ہے جو غالباً سب سے زیادہ ہندوستان کے دل سے قریب ہو سکتی ہے

یہ امر عملاً ممکن نہیں ہے کہ پہلے ہی سے مہاتما گاندھی کے ہندومت کی تعریف کے اُن مختلف حصوں کی تشریح کر دی جائے جو مغربی زبانوں کے لئے مبائن ہیں لیکن ایک بات بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ خود اور ہر تعلیم یافتہ راسخ الاعتقاد ہندو خدائے واحد کی ہستی پر ایمان رکھتا ہے۔ ہر ہندوستانی لفظ "خدا" (جس کے لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے) زبان میں اچھی طرح سے سمجھا جاتا ہے اور ہمیشہ ہر ہندو کی زبان پر رہتا ہے۔ خدا کا نام ہر ہندو کی زبان پر کندہ ہے اور جب وہ اُس کا تصور کرتا ہے وہ اُسے خدائے واحد سمجھتا ہے اور اعلیٰ ترین ہستی خیال کرتا ہے۔ میں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ متعدد بار نہایت دوستانہ انداز میں مذہب پر گفتگو کی ہے اور میں نے بہت سے اختلافِ آرا کی موجودگی میں کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اِس آخری عقیدہ کے بارہ میں ہم میں کبھی کوئی اختلاف موجود رہا ہے۔ اِس مسئلہ میں میں اور وہ دونوں متحد الخیال رہے ہیں

ہیں۔ اِس لحاظ سے مسٹر گاندھی موحد ہیں اور میں بھی ہوں۔ ہم دونوں کے نزدیک خدا پر عقیدہ اتنا ہی یقینی اور قریبی ہے جتنا کہ ہم اپنی ذات کے متعلق رکھتے ہیں

اب سنسکرت کے چند ایک الفاظ کی تشریح کرنی باقی رہ گئی ہے۔ لفظ "سناتن" جس سے وہ اپنے بیان کی ابتدا کرتے ہیں "دوامی" یا "غیر متغیر" معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ کٹر ہندو کی پوزیشن کی توضیح کرتا ہے۔ مسٹر گاندھی کسی جدید اصلاح یافتہ فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ مذہب میں قدامت پسند واقع ہوئے ہیں

ہندوؤں کی مذہبی کتب میں وید قدیم ترین مانے گئے ہیں اور ہندو عام طور سے انہیں غلطی سے ویسا ہی مبرّا خیال کرتے ہیں جیسا کہ بہت سے عیسائی یہودیوں کی کتب مقدسہ کو ہر قسم کی غلطی سے پاک سمجھتے ہیں۔ اپنشد قدیم ترین فلسفیانہ کتابیں ہیں اور پُران قدیم ہندو مذہب کی حکایات پر مشتمل ہیں۔

الفاظ "ورن آشرم دھرم" سے مراد ہندو ذات پات کا مذہب ہے سنسکرت میں ورن سے "رنگ" یا "ذات" مراد ہے اور دھرم سے "مذہب"

ان ابتدائی تشریحات کے بعد مہاتما گاندھی کا تازہ بیان درج کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے ہندو مذہب کی تفصیلی تعریف فرمائی ہے۔

مَیں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں اس لئے کہ ــ

ا میں ویدوں، اپنشدوں، پُرانوں، اور اُن تمام کتابوں پر جو ہندوؤں کی کتب مقدسہ کا جزو ہیں ایمان رکھتا ہوں

اور اسی سبب سے اوتاروں اور مسئلۂ کرم پر بھی

۲- میں ورن آشرم دھرم کا قائل ہوں لیکن اُسی مفہوم میں جو ویدوں میں اُسے دیا گیا ہے لیکن اُس کے موجودہ بھونڈے معنی میں نہیں

۳- میں گئو رکھشا پر قلبی ایمان رکھتا ہوں لیکن اُس سے کہیں زیادہ جتنا کہ عامۃ الناس رکھتے ہیں

۴- میں مورتی پوجا کا مخالف نہیں ہوں

۵- میں بلا چون و چرا اس ہندو عقیدہ پر ایمان رکھتا ہوں کہ کوئی شخص اُس وقت تک کتب مقدسہ سے صحیح طور پر واقف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اہنسا (عدم تشدد) ستیا (سچائی) اور برہمچریہ (ضبط نفس) پر عامل نہ ہو اور جب تک اس نے حصول دولت یا قبضۂ دولت کی خواہش کو ترک نہ کر دیا ہو

۶ میں ہر ہندو کی طرح خدا پر اور اُس کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہوں، نیز فلسفۂ کرم پر اور نجات پر

جو بات ہندو مذہب کو دوسرے مذہب سے ممیز کرتی ہے وہ ورن آشرم سے کہیں زیادہ گئو رکھشا کا جذبہ ہے۔ ورن آشرم تو میری رائے میں انسانی فطرت میں مرکوز ہے اور ہندو مذہب نے صرف اتنا کیا ہے کہ اُسے سائنس بنا دیا ہے۔ اُس کا تعلق پیدائش سے ہے۔ کوئی شخص

اپنی مرضی سے ورن نہیں بدل سکتا۔ ورن کی پابندی نہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ انسان توارث کے قانون کو نظرانداز کر دے[1]

میں ویدوں کے الہامی ہونے کا قائل تو ہوں لیکن اسطرح سے نہیں کہ دوسری کتبِ مقدسہ کو الہامی ہونے سے خارج کر دوں۔ میرا ایمان ہے کہ بائیبل قرآن اور ژنداوستا بھی اتنی ہی الہامی ہیں جتنے کہ وید۔ ہندو کتبِ مقدسہ پر میرا ایمان لانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ میں ہر آیت اور ہر لفظ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھوں کہ وہ الہامی ہے۔ مجھے اُن عجیب وغریب کتابوں کے بارے میں ذاتی واقفیت اور علم نہیں ہے لیکن میں اتنا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں کتبِ مقدسہ سے واقف ہوں اور اُن کی حقیقی تعلیمات کی سچائیوں کو محسوس کرتا ہوں۔ مگر میں کسی ایسی تفسیر کا خواہ وہ کتنی ہی فاضلانہ کیوں نہ ہو، پابند بننے سے انکاری ہوں جو عقل یا اخلاق کے خلاف ہو

میرا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ مختلف اقوام کے ساتھ کھانا کھانے سے یا ان میں شادی رچانے سے انسان کی ذات جاتی رہتی ہے جو از روئے پیدائش اُسے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ چار مدارج، برہمن چھتری، ویش اور شودر صرف انسانی پیشوں کی توضیح کرتے ہیں، وہ معاشرتی تعلقات کو نہ تو محدود کرتے ہیں اور نہ باقاعدہ بناتے ہیں۔ یہ مدارج تو صرف فرائض کی وضاحت کرتے ہیں اور کوئی خاص حقوق عطا نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ امر ہندو مذہب کی روح کے منافی ہے کہ وہ

[1] دیکھو ضمیمہ دوم

اپنے ذمہ یہ کام لے کہ کسی آدمی کو اعلیٰ مرتبہ دیا جائے اور کسی دوسرے کو ادنیٰ مرتبہ۔ سب لوگ خدا کی مخلوق کی خدمت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ برہمن اپنے علم سے، چھتری حفاظت کرنے کی طاقت سے، ویش اپنی تجارتی قابلیت سے اور شودر اپنی جسمانی محنت سے

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک برہمن جسمانی خدمت کرنے سے بری رکھا گیا ہے یا آپ اپنی حفاظت یا دوسروں کی حفاظت کرنے کا فرض اُس پر عائد نہیں ہوتا۔ برہمن کی پیدائش اُسے دوسروں کے مقابلہ میں از روئے توارث حصول علم کے لئے اور علمی آدمی بننے کے لئے اور دوسروں تک اُس علم کو پہنچانے کے لئے بہترین طریقہ سے موزوں بنا دیتی ہے۔ اسی طرح شودر کے لئے بھی علم حاصل کرنے کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ وہ بہترین طریقہ سے جسمانی طور پر ہی خدمت کرسکتا ہے اور دوسروں کو خدمت کرنے کے لئے جو خاص طور پر قابلیتیں عطا کی گئی ہیں اُسے اس پر حسد نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن جو برہمن علم کی بنا پر فوقیت کا دعویدار ہے وہ اپنے مرتبہ سے گر جائے گا اور ایک بے علم شخص کی پوزیشن اختیار کرلیگا۔ اور یہی حال دوسروں کا ہے جو اپنی خاص قابلیتوں پر ناز کرتے ہیں۔ ورن آشرم کے معنی ہیں ضبطِ نفس اور طاقت کی حفاظت اور اس کا کفایت کے ساتھ استعمال

اگرچہ ورن آشرم پر دوسری قوموں کے ساتھ کھانے پینے یا ان

کے ساتھ بیاہ کرنے کا کچھ اثر نہیں پڑتا، تاہم ہندو مذہب ان باتوں کو سختی سے روکنے کی کوشش کرتا ہے

ہندو مذہب ضبطِ نفس کی انتہائی اور آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ یہ درحقیقت ترکِ نفس سکھانے والا مذہب ہے تاکہ روح آزاد رہے۔ ایک ہندو پر یہ پابندی عائد کر دینا کہ وہ ایک خاص جماعت میں اپنے لڑکے کے لئے بیوی تلاش کرے، درحقیقت ایک حیرت انگیز طریقہ کا ضبطِ نفس ہے

ہندو مذہب شادی شدہ حالت کو نجاتِ اخروی کے لئے لازمی نہیں سمجھتا۔ شادی ایک قسم کا ہبوط (تنزل) بعینہ جس طرح سے کہ پیدائش کو بھی ہبوط کہا جا سکتا ہے۔ نجات کے معنی یہ ہیں کہ انسان پیدائش کے چکر سے آزادی حاصل کر لے، اور اِس طرح موت سے بھی

بین الاقوامی شادی اور بین الاقوامی تناولِ طعام سے پرہیز روح کی تیز گام ترقی کے لئے لازمی شے ہے۔ لیکن یہ ایثار ورن (ذات) کے لئے کوئی معیار نہیں ہے۔ برہمن برہمن رہ سکتا ہے خواہ وہ اپنے شودر بھائی کے ساتھ کیوں نہ کھانا کھا لے بشرطیکہ علم کے ذریعہ خدمت کرنے کا جو فرض اُس پر عائد ہوتا ہے، اُسے اُس نے ترک نہ کر دیا ہو۔ جو کچھ میں اوپر کہہ چکا ہوں، اُس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ شادی بیاہ اور کھانے کے معاملہ میں جو بندش عائد کی گئی ہے وہ برتری اور فوقیت کے جذبات پر مبنی نہیں ہے۔ جو ہندو کہ تفاخر کے

جذبہ سے دوسرے شخص کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کرتا ہے وہ گویا
ہندو دھرم کی غلط نمائندگی کرتا ہے
بدقسمتی سے آج ہندو مذہب "کھانے" اور "نہ کھانے" میں رہ گیا ہے۔ خطرہ
ہے کہ کہیں ہندو دھرم اپنی حقیقی روح نہ کھو بیٹھے اگر اس نے اپنے آپ کو
اس امر تک محدود کر لیا کہ کیا چیزیں کھانی چاہئیں اور کیا نہ کھانی چاہئیں۔
ترک حیوانات بلاشبہ روح کی ترقی میں بہت بڑی امداد کا باعث ہوتا ہے
لیکن بلاشبہ وہ کوئی مستقل مطمح نظر نہیں ہے۔ بہت سے اشخاص جو گوشت
کھاتے ہیں اور ہر کس و ناکس کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں لیکن ساتھ ہی خشیۃ
اللہ بھی رکھتے ہیں، وہ نجات سے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت ایسے
شخص کے جو گوشت اور بہت سی دوسری چیزوں سے مذہباً تو اجتناب
کرتا ہے لیکن اپنے بہت سے اعمال سے خدا کی توہین بھی کرتا رہتا ہے
مگر ہندو مذہب کا مرکزی تخیل گئو رکھشا ہے۔ میرے نزدیک تمام
انسانی ارتقا میں گئو رکھشا نہایت عجیب و غریب واقعات میں سے ایک ہے
اسلئے کہ وہ انسان کو اسکی اپنی جنس سے ہٹا کر دور لیجاتا ہے گائے سے میری مراد وہ تمام دنیا ہے
جو انسان سے نیچے ہے اور اس سے پست تر ہے۔ گائے کے ذریعہ انسان
کو یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ وہ ہر زندہ اور جاندار شے کے ساتھ یگانگت کا احساس
رکھے۔ ہندوستان میں گائے کو بہترین رفیق سمجھا جاتا تھا۔ وہ اچھی اچھی
چیزیں دینے والی شمار کی جاتی تھی۔ گائے رحم کی ایک سراپا نظم ہے اس
شریف جانور کو دیکھ خود بخود رحم پیدا ہوتا ہے۔ وہ لاکھوں انسانوں کی

ماں ہے۔ گائے کی حفاظت میں خدا کی تمام گونگی مخلوق شامل ہوجاتی ہے۔ قدیم ترین رشی نے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ابتداً گائے ہی سے کی تھی۔ مخلوق کے ادنیٰ طبقہ کی اپیل زیادہ زوردار اس لئے بنجاتی ہے کہ وہ خاموش ہے۔ گئو رکھشا کا تخیل وہ تحفہ ہے جو ہندو مذہب نے دنیا کو دیا ہے اور ہندو دھرم اُسوقت تک زندہ رہے گا جب تک کہ گائے کی حفاظت کرنے کے لئے ہندو موجود ہیں

ہندوؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تزکیۂ نفس اور ایثار و قربانی کے ذریعہ گائے کی رکھشا کریں۔ آج کل گئو رکھشا کا خیال اسقدر پستی میں جا پڑا ہے کہ اُس نے مسلمانوں کے ساتھ دائمی تنازعہ کی صورت اختیار کرلی ہے، حالانکہ سچی گئو رکھشا کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی محبت سے مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کریں

ایک مسلمان دوست نے چند دن پیشتر میرے پاس ایک کتاب بھیجی تھی جس میں اُن تمام مظالم کا مذکور تھا جو ہماری جانب سے گائے پر اور اس کی نسل پر روا رکھے جاتے ہیں۔ ہم کس طرح سے اُس کے دودھ کا آخری قطرہ تک اُس سے لے لیتے ہیں، ہم اس کے بچھڑوں سے کیا کیا بدسلوکیاں کرتے ہیں، ہم کس طرح سے انہیں اُن کے دودھ کے حصہ تک سے محروم رکھتے ہیں ہم بیلوں کے ساتھ کیا ظالمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ ہم اُنہیں کس طرح سے آختہ کر ڈالتے ہیں، ہم اُنہیں کس بے رحمی سے پیٹتے ہیں، ہم اُن پر کس کس طرح ضرورت سے زیادہ بوجھ لاد دیتے ہیں۔ اگر اُن میں قوتِ

گویائی ہوتی تو وہ ہمارے اُن تمام جرائم کی شہادت دیتے جو ہم سے اُن کے خلاف سرزد ہو چکے ہیں اور پھر ساری دنیا حیران و ششدر رہ جاتی۔ مویشیوں کے ساتھ بیرحمی کے ہر فعل سے ہم خدا اور ہندو مذہب کی تکذیب کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں مویشیوں کی حالت اتنی ہی زبوں ہے جتنی بدقسمت ہندوستان میں اُن کی ہے۔ ہم اِس کے لئے انگریزوں کو ملزم نہیں قرار دے سکتے، ہم اپنی مدافعت میں افلاس و نکبت کا بھی عذر پیش نہیں کر سکتے۔ ہمارے مویشیوں کی افسوسناک حالت کا واحد سبب ہماری مجرمانہ غفلت ہے۔ ہمارے یہاں گائے کے جو محافظ ہیں وہ اگرچہ ہمارے فطری جذبۂ رحم کی ظاہری علامت ہیں تاہم وہ جس طریقہ سے اُسے عملی جامہ پہناتے ہیں وہ بہت ہی بھونڈا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے ڈیری فارم اور عظیم الشان مفید قومی ادارے قائم کرنیکی بجائے وہ محض بیکار مویشیوں کو قبول کرنے کے ڈپو ہیں

ہندوؤں کا اندازہ اس امر سے نہیں کیا جائیگا کہ وہ کتبِ مقدسہ کو صحیح طور سے پڑھ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہوں نے جاترائیں کی ہیں، یا یہ کہ وہ ذات کے قواعد کی پابندی بہت احتیاط سے کرتے ہیں، بلکہ اس امر سے کیا جائیگا کہ اُن میں گئو رکھشا کی قابلیت کہاں تک موجود ہے گئو رکھشا کے مذہب کا قائل ہوتے ہوئے ہم نے گائے کو اور اُسکی تمام نسل کو غلام بنا رکھا ہے اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اب غلام بن گئے ہیں

میں جس طرح سے اپنی بیوی کے متعلق اپنے جذبہ کو بیان کرنے سے

قاصر ہوں بعینہ اسی طرح سے میں ہندو مذہب کے متعلق اپنے جذبہ کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ میرے قلب کو اس طرح سے متحرک کر دیتی ہیں کہ دنیا کی کوئی قوت ایسا نہیں کر سکتی۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ میں جرأت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُن میں اُن سے کہیں زیادہ کوتاہیاں موجود ہیں جو میرے مشاہدہ میں آچکی ہیں لیکن نہ ٹوٹنے والے تعلق کا احساس بھی وہاں موجود ہے ٹھیک اسیطرح سے میں ہندو مذہب کے لیئے اور اُس کے بارے میں میں محسوس کرتا ہوں باوجود اِس کے کہ اِسمیں خامیاں اور حد بندیاں پائی جاتی ہیں۔ مجھے گیتا یا تلسی داس کی رامائن کی موسیقی سے زیادہ کوئی چیز فرحت بخش نہیں معلوم ہوتی اور ہندو مذہب کی یہی دو کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں کہ سکتا ہوں کہ میں حقیقتاً اُن سے واقف ہوں جب ایک موقع پر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اپنا آخری سانس لے رہا ہوں اُسوقت گیتا ہی میرے لئے تسکین قلب کا باعث بنی ہوئی تھی

میں اُس اخلاقی برائی سے واقف ہوں جو آج ہندوؤں کے تمام بڑے بڑے مندروں میں پائی جاتی ہے، لیکن اُن کی ناگفتنی خرابیوں کے باوجود مجھے اُن سے محبت ہے۔ جو دلچسپی مجھے اُن سے ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ میں شروع سے آخر تک اصلاح پسند ہوں۔ لیکن میرا جوش مجھے کبھی ترغیب نہیں دیتا کہ میں ہندو مذہب کے کسی اہم اصول کو مسترد کر دوں

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میں مورتی پوجا کا مخالف نہیں ہوں مورتی میرے دل میں کسی احترام کا جذبہ پیدا نہیں کرتی لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ مورتی پوجا کا جذبہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ہم ظاہری علامات کے پیچھے دیوانے رہتے ہیں۔ ایک شخص کو گرجا میں بمقابلہ کسی دوسری جگہ کے کیوں زیادہ سکون قلب ملتا ہے؟ مورتیاں عبادت میں صرف ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیں۔ کوئی ہندو کسی مورتی کو خدا قرار نہیں دیتا۔ میں بہرحال مورتی پوجا کو گناہ نہیں سمجھتا

قبل الذکر عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہندو مذہب ایسا نہیں جو دوسرے مذاہب سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کرتا ہو اس میں دنیا کے تمام پیغمبروں کے لئے احترام کی گنجائش موجود ہے۔ یہ عام اصطلاح میں تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس نے اپنے میں بہت سی قوموں کو جذب کرلیا ہے لیکن یہ انجذاب ارتقائی نوعیت رکھتا ہے اور نامعلوم طریقہ سے عمل میں آیا ہے۔ ہندو مذہب ہر ایک کو اپنے اپنے طریقہ پر خدا کی عبادت کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس طرح سے وہ تمام مذاہب کے ساتھ مصالحت رکھنے کا دعویدار ہے

ہندو مذہب کے متعلق میرے اس تخیل کی موجودگی میں میرے لئے ہمیشہ یہ امر ناممکن رہا ہے کہ میں چھوت چھات کی حمایت کروں میری ہمیشہ سے یہی رائے رہی ہے کہ یہ چیز باہر سے داخل ہوگئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچی ہے۔ لیکن اِس طرح سے اور بھی کئی ایک

خرابیاں ہیں جو ہم تک آئی ہیں۔ مجھے اس خیال سے شرم آنی چاہیئے کہ لڑکیوں کو زناکاری کی زندگی بسر کرنے کی غرض سے نذرِ مندر کرنے کی رسم کسی زمانہ میں ہندو مذہب کا جزو تھی، لیکن آج یہ رسم ہندوستان کے بہت سے حصوں کے ہندوؤں میں جاری وساری ہے[1]

ساتھ ہی میں اس امر کو لامذہبیت سمجھتا ہوں کہ کالی دیوی کے نام پر بکریوں کی قربانی کی جائے اور میں اسے ہندو مذہب کا جزو نہیں سمجھتا۔ ...... اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ایک زمانہ میں مذہب کے نام سے جانوروں کی قربانی روا رکھی جاتی تھی، لیکن یہ صحیح مذہب نہیں ہے، کم سے کم اسے ہندو مذہب سے کچھ بھی علاقہ نہیں

اسی طرح مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں گئو رکھشا ہمارے بزرگوں کے مذہب میں داخل ہوئی تو جو لوگ گائے کا گوشت کھانے پر مصر ہوں گے، وہ ذات باہر کردئے گئے ہوں گے۔ اُسوقت یہ خانگی جنگ یقیناً بہت شدید رہی ہوگی۔ معاشرتی بائیکاٹ کا حربہ صرف مخالفین کے خلاف نہیں استعمال کیا گیا ہوگا بلکہ اُن کے گناہوں کا اثر اُن کی اولاد پر بھی پڑا ہوگا۔ بائیکاٹ کی رسم جس کی ابتدا غالباً اچھے ارادوں کے ساتھ ہوئی ہوگی، امرورِ دہور سے سخت تر بنتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہماری کتب مقدسہ میں ایسی عبارتیں داخل ہوگئی ہیں جنھوں نے

---

[1] اس بیان کی اشاعت کے بعد سے مدراس کی لیجسلیٹو کونسل میں اس رسم کو بند کرنیکی غرض سے مسودۂ قانون پیش ہوچکا ہے

رسم بائیکاٹ کو دوام عطا کردیا ہے جو کلیتًا ایک غیر ضروری چیز ہے اور کم سے کم اُسے حق بجانب نہیں ٹھہرایا جا سکتا

چھوت چھات کے متعلق یہی میرا نظریہ ہے۔ خواہ یہ صحیح ہو یا نہیں چھوت چھات نہ صرف خلافِ عقل ہے، بلکہ رحم یا محبت کے جذبہ کے صریح تمناقض ہے۔ جو مذہب گائے کی پرستش کو قائم کرے، وہ یقینًا بنی نوعِ انسان کے ظالمانہ اور انسانیت سوز بائیکاٹ کو امکانی طور پر نہ تو برداشت کرسکتا ہے اور نہ اسکی اجازت دیسکتا ہے اور میری حالت یہ ہے کہ میں اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرادینا پسند کروں گا مگر اچھوتوں کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دوں گا۔ ہندو درحقیقت نہ تو آزادی کے کبھی حقدار ہوں گے اور نہ وہ کبھی اسے حاصل کرسکیں گے اگر وہ اپنے شریف مذہب کو چھوت چھات قائم رکھ کر داغدار بنانے کی اجازت دیتے رہیں گے اور چونکہ مجھے زندگی سے زیادہ ہندو دھرم سے محبت ہے، میرے لئے یہ داغ ناقابل برداشت بنگیا ہے۔ ہمیں اپنی نسل کے پانچویں حصہ کو مساوی طور پر ملنے جلنے کا حق دینے سے انکار کرکے خدا تعالیٰ کے وجود سے انکار نہیں کرنا چاہیئے"

رابندرانا تھ ٹیگور جیسے مفکر اور فلاسفر تاریخی اعتبار سے اِس بیان کے بعض حصوں کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن اُس کا اہم ترین ٹکڑا جسے تبصرہ کیئے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا وہ ہے جہاں مہاتما شادی کو "ہبوط" کے لقب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ٹیگور ایک مشہور و معروف مراسلہ کے

دوران میں گاندھی جی کی راہبانہ افتادِ طبیعت کے اِس حصہ کو ابتدائی ہندو مذہب کی اپنشد کی تعلیم سے مماثلت رکھنے کی بجائے بدھ مذہب کے مماثل خیال کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ ہندو زندگی کے ابتدائی تخیل کا حوالہ دیتے ہیں جو چار مختلف منازل پر مشتمل ہوا کرتی تھی جو انسانی تجربہ کی تکمیل کے لیئے لازمی خیال کی جاتی تھیں۔ ان میں دوسری منزل یعنی گھرستی زندگی والی منزل نہایت اہمیت رکھتی ہے[1]

اگرچہ عام ہندو مذہب کی بعض صورتیں شادی کو لازمی برائی خیال کرتی ہیں اور اُن میں رہبانیت کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم شادی کو ہندو مذہب مین جو تقدیس عطا کی گئی ہے اور اُسے ناقابلِ شکست قرار دیا گیا ہے وہ اس خیال کو ناممکن الیقین بنا دیتا ہے کہ ہندوستان میں تجرد کا مطمح نظر کبھی بنیادی چیز رہا ہے سوائے اُس دور کے جبکہ بدھ مذہب بر سر عروج تھا۔ ہندوستانی باشندوں نے اپنے مذہب کی حیثیت سے بالآخر بدھ مذہب کو مسترد کر دیا اور آج یہ حالت ہے کہ خاص ہندوستان میں بدھ مذہب والے بالکل نہیں پائے جاتے

مہاتما گاندھی کے اُن خیالات کے متعلق جو روحانی زندگی کے

[1] دیکھو باب یا نزدہم جہاں یہ مراسلہ عدم تعاون کے سلسلہ میں درج کیا گیا ہے ٹیگور مہاتما گاندھی کے نظریۂ شادی کو اسی قسم کا سلبی پہلو رکھنے والا بتاتے ہیں اس سلسلہ میں عام ہندی مصطلحات کی مختصر سی فہرست قابلِ ملاحظہ ہے جو کتاب کے شروع دیدی گئی ہے اور جہاں چاروں منازل درج کر دی گئی ہیں

عمیق پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیں اُن کی تحریرات میں بعض ایسی عبارتیں ملتی ہیں جو ہندو مذہب کی نسبت اُن کی مذکورہ بالا رائے کے ظاہری پہلو کی حمایت کر سکتی ہیں۔ دو اقتباسات جو درجِ ذیل کئے جاتے ہیں، خدائی راز سے اور اُس فطری جذبۂ ایمانی سے متعلق ہیں جس کے ذریعہ خدا کو پہچانا جا سکتا ہے۔ پہلا اقتباس ملاحظہ ہو:—

"دنیا میں ایک ایسی غیبی طاقت موجود ہے جس کی اگرچہ تعریف نہیں کیجا سکتی تاہم وہ ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے۔ میں اُسے محسوس کرتا ہوں اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتا۔ یہی وہ نادیدہ طاقت ہے جو اپنے آپکو محسوس کراتی ہے اور ساتھ ہی ہر قسم کے ثبوت سے بے نیاز ہے اس لئے کہ وہ ہر اُس چیز سے مختلف ہے جسے میں اپنے ظاہری حواس سے محسوس کر سکتا ہوں۔ وہ احساس سے بالاتر ہے۔ لیکن خدا کی ہستی کے بارے ایک محدود حد تک بحث کیجا سکتی ہے

معمولی معاملات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ نہیں جانتے کہ کون حکومت کر رہا ہے اور کس طرح سے حکومت کر رہا ہے اور باوجود اِس کے وہ جانتے ہیں کہ ایک طاقت ایسی ہے جو حکومت کر رہی ہے۔ گذشتہ سال میسور کے دورہ میں میں چند غریب دیہاتیوں سے ملا، اور تحقیقات کے بعد میں نے معلوم کیا کہ انہیں اس کی اصلا خبر نہیں کہ میسور پر کون حکمراں ہے۔ اگر ان غریب دہقانیوں کا علم اپنے حاکم کے متعلق اس درجہ محدود ہے تو مجھے جو خدا سے اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنی انہیں اپنے

عالم ہستی ہے۔ سبب نہ ہو تا یا ہے۔ اگر میں شاہِ شاہاں یعنی خدا تعالیٰ کی ہستی کو نہ پہچان سکوں

مادہ پرست اس کے بجائے محسوس کرتا ہوں بعینہ جس طرح سے کہ مذہب دیوتاؤں نے سورج کے بارے میں محسوس کیا تھا کہ نظامِ کائنات میں ایک ترتیب یا ضابطہ ہے اور ایک اٹل قانون بھی جو ہر چیز پر اور ہر ذی روح پر موجود ہے یا خود سے حاوی ہے۔ وہ کوئی اندھا قانون [illegible] ہے جس سے [illegible] قانون، خدا [illegible] کے طور پر حاوی [illegible] حیرت انگیز انکشافات [illegible] یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ مادہ بھی [illegible] ہے

[illegible] زندگی پر حاوی ہے خدا تعالیٰ ہے۔ قانون اور [illegible] کرتے [illegible] بہت [illegible] طاقت [illegible] نہیں [illegible] کی حکومت [illegible] حکومت [illegible]

سے زندگی اُس کے ماتحت آسان ترچیز بن جاتی ہے

مجھے اس امر کا دھندلا سا احساس ہے کہ جہاں میرے گرد و پیش ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے اور مرتی رہتی ہے وہاں اس تمام تغیر کی تہ میں ایک زندہ طاقت کارفرما ہے جو غیر تغیر پذیر ہے، جو سب کو مجتمع رکھتی ہے، جو پیدا کرتی ہے، عناصر کو منتشر کرتی ہے اور پھر دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔ وہی باخبر ذات خدا ہے۔ اور چونکہ ہر اُس شے کے لئے جسے میں حواس انسانی کے ذریعہ دیکھتا ہوں، نہ بقا ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی، لہذا وہی ایک ذات ہے جسے دائم بقا ہو سکتی ہے

اور کیا یہ طاقت کائنات کے لئے فائدہ بخش ہے یا تباہ کن؟ مجھے تو وہ خالصتاً فائدہ بخش طاقت نظر آتی ہے اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ موت میں بھی زندگی کو قیام ہے، جھوٹ میں بھی سچائی قائم رہتی ہے، تاریکی میں بھی روشنی جلوہ گر رہتی ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ خدا زندگی ہے، سچائی ہے، روشنی (نور) ہے۔ وہ سراپا محبت ہے۔ اسی کی ذات سب سے برتر ہے

لیکن وہ ذات خدا نہیں ہو سکتی جو محض عقل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ وہ کبھی ایسا کرے۔ خدا کو خدا ہونے کے لئے قلب پر حکومت کرنی چاہئے اور اس کی ماہیت کو کلیتاً تبدیل کر دینا چاہئے۔ اُسے اپنے پرستار کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل میں اپنا جلوہ دکھانا چاہئے۔ یہ صرف اُسوقت ممکن ہے جبکہ خدا کی ہستی کا مکمل ادراک کر لیا جائے جو اُس سے

زیادہ حقیقی ہونا چاہئے جتنا حواسِ خمسہ کے ذریعہ ممکن ہوسکتا ہے۔ حواس کے محسوسات جھوٹے اور دھوکہ دینے والے ہو سکتے ہیں اور بسا اوقات ہوتے بھی ہیں خواہ وہ کتنے ہی حقیقی نظر آئیں۔ جب کبھی حواسِ ظاہری سے بالاتر ہو کر خدا کا ادراک ہو جاتا ہے، وہ غلطی سے مبرّا ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے کسی ظاہری شہادت کی ضرورت نہیں بلکہ اُن لوگوں کے تبدیل شدہ طریقِ عمل اور سیرت سے معلوم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنے دلوں میں خدا کی حقیقی ہستی کا احساس کر لیا ہے

اس قسم کی شہادت اُن پیغمبروں اور رشیوں کے مربوط سلسلہ کے تجربوں سے عیاں ہے جو مختلف ملکوں اور دَوروں میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اس شہادت سے انکار کرنا گویا اپنے آپ سے انکار کرنا ہے

لیکن اس ادراک سے قبل ایک اٹل عقیدہ کی ضرورت ہے۔ جو شخص اپنی ذات میں خدا کی موجودگی کی حقیقت پہچاننا چاہتا ہے وہ صرف زندہ اعتقاد کے ذریعہ ہی سے ایسا کر سکتا ہے، اور چونکہ عقیدہ کو کسی بیرونی شہادت کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکتا لہذا محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی اخلاقی حکومت پر اور اس طرح سے اخلاقی قانون کی جو درحقیقت سچائی اور محبت کا قانون ہے، برتری پر یقین کر لیا جائے۔ عقیدہ پر عمل درآمد اُسوقت محفوظ ترین شے بنجائیگا جبکہ یہ واضح عزم پیدا ہو جائیگا کہ ہر اُس چیز کو جو سچائی اور محبت کے خلاف نظر آئے یک قلم مسترد کر دیا جائے

مجھے اقرار ہے کہ عقل کے ذریعہ یقین دلانے کی غرض سے میرے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ عقیدہ استدلال سے بالاتر ہے۔ میں جس امر کا مشورہ دے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ناممکن فعل کی کوشش نہیں کرنی چاہیے میں کسی عقلی دلائل کے ذریعہ بدی کے وجود کی تشریح نہیں کرسکتا۔ ایسا کرنے کی کوشش کرنا دراصل خدا کی برابری کرنا ہے۔ لہٰذا میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ بدی کو اس کی موجودگی حالت میں تسلیم کئے لیتا ہوں، اور ٹھیک سوچے کہ اس نے دنیا میں بدی کی اجازت دے رکھی ہے میں خدا کو بُردبار اور صابر خیال کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ خود اُس میں کوئی برائی نہیں ہے اور تاہم اگر بدی ہے تو وہ اس کا خالق ضرور ہے مگر خود اُس سے غیر متعلق رہتا ہے

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں کبھی بھی خدا کو نہ جان سکوں گا اگر میں بدی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہوں گا خواہ اس کشمکش میں مجھے جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ میں اپنے عاجزانہ اور محدود تجربہ کی بنا پر اس عقیدہ پر سختی سے قائم ہوں۔ جتنا زیادہ پاکیزہ میں بننے کی کوشش کروں گا اتنا ہی قریب تر میں اپنے آپ کو خدا سے پاؤں گا۔ میں اپنے تئیں خدا سے کتنا زیادہ قریب کرلونگا جب میرا عقیدہ محض رسمی نہ رہے گا جیسا کہ وہ آج ہے بلکہ جب وہ ہمالیہ کی طرح اٹل اور اسکی برفانی چوٹیوں کی طرح منور بنجائیگا؟ جب تک یہ حالت نہ ہو میں نیومین[1] کی ہمنوائی کروں گا جس نے اپنے تجربہ کی بنا پر ذیل کے اشعار

[1] NEWMAN QL

موزوں کئے تھے:۔

اے مہربان روشنی! عالمگیر تاریکی میں میری رہنمائی کر!
رہنمائی کرکے مجھے آگے بڑھاتی رہ
رات اندھیری ہے اور میں گھر سے دور ہوں
رہنمائی کرکے مجھے آگے بڑھاتی رہ
میرے پیروں کو پکڑے رکھ اس لئے کہ میں دیکھنا پسند نہیں کرتا
وہ دور کا نظارہ، میرے لئے تو بس ایک قدم کافی ہے"

دوسری تحریر مہاتما گاندھی کے ذاتی عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے جسے انہوں نے ذیل کے الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے:۔

میرے نزدیک خدا سچائی اور محبت ہے، خدا اخلاق ہے، خدا بےخوفی ہے، خدا روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہے اور اس کے بعد بھی وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ خدا ضمیر ہے۔ دہریہ کی دہریت بھی خدا ہے، کیونکہ اپنی لامتناہی محبت کی وجہ سے وہ دہریہ کو بھی زندہ رکھتا ہے۔ وہ دلوں کا ٹٹولنے والا ہے۔ وہ تقریر اور استدلال کی حدود سے کہیں برتر ہے۔ وہ ہم سے اور ہمارے دلوں کی گہرائیوں سے ہم سے بہت زیادہ واقف ہے۔ وہ ہمارے الفاظ پر نہیں جاتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بسا اوقات ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں، بعض یہ بات دیدہ و دانستہ کرتے ہیں اور بعض نادانستہ طور پر جن لوگوں کو خدا کی ذاتی موجودگی کی ضرورت ہے وہ اس کا ذاتی

تجربہ رکھتے ہیں جن لوگوں کو اس کے چھونے کی ضرورت ہے اُن کے لئے
وہ مجسمہ بنجاتا ہے۔ وہ جملہ بنی نوع انسان کے لئے جملہ چیزیں ہے۔
ہمارے اندر ہے ساتھ ہی ہم سے بالاتر اور ہمارے باہر بھی ہے۔ وہ
کھاتے وقت خدا کا نام خارج کر سکتا ہے لیکن وہ اس ذات کو خارج
کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں رکھتا
خدا کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجود نہیں ہے اس لئے کہ
خوفناک بداعمالیاں یا غیر شریفانہ مظالم اُس کے نام سے کیے جاتے
ہیں۔ وہ تو بہت بُردبار ہے۔ وہ صابر ہے لیکن ساتھ ہی وہ قہار
بھی ہے وہ اس دنیا میں اور آنے والی دنیا میں سخت ترین محاسب
ہے وہ ہم سے وہی سلوک روا رکھتا ہے جو ہم اپنے پڑوسیوں سے
روا رکھتے ہیں خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان۔ اُس کے نزدیک لاعلمی
کوئی عذر نہیں ہے اور باوجود اس کے وہ غفور الرحیم بھی
ہے، اس لئے کہ وہ ہمیں توبہ کرنے اور سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔
وہ دنیا میں سب سے زیادہ جمہوریت نواز ہے اس لئے کہ وہ ہم کو
نیکی اور بدی میں انتخاب کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ ساتھ
ہی اُس سے بڑھکر کوئی ظالم بھی نہیں اس لئے کہ بسا اوقات
وہ ہمارے لبوں سے پیالہ ہٹا لیتا ہے اور اختیار کا بہانہ کرکے
ہمارے لئے اتنی ذرا سی گنجائش رکھتا ہے جو سراسر ناکافی ہوتی
ہے اس طرح وہ اپنے لئے ہمارے ذریعہ سے دل لگی کا سامان فراہم

کر لیتا ہے
یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب اِن تمام باتوں کو اس کا مذاق یعنی
لیلا قرار دیتا ہے اور دوسرے الفاظ میں اسے دھوکہ، فریب، ما یا
سمجھتا ہے۔ ہم کو بقا نہیں صرف وہی ہے جسے ہمیشہ ہمیشہ بقا ہے"
ان آخری فقرات میں یہ امر ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے کہ مہاتما گاندھی
بعید الفہم شاعرانہ زبان میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں اور اسی انداز میں
اُس ذات کی جو وہم و خیال میں بھی نہیں سما سکتی، تشبیہ و استعارہ
کی زبان میں دھندلی سی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ خدا کی فطرت کے
اس پہلو کو جو گہرا راز ہونے کی وجہ سے انسانی تخیل سے بالاتر ہے ہندو
مذہب میں بسا اوقات خدا کے کھیل (لیلا) یا مایا سے تشبیہ دی گئی ہے۔
لیکن یہ بات مہاتما گاندھی کے نزدیک اُسکی خدائی صفات ستیا
(سچائی) اور عدم ضرر رسانی (اہمسا) کے تناقض نہیں ہے
ایک تیسری تحریر میں جسے میں نے اُن کی بہت سی تحریرات میں
سے منتخب کیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح سے مہاتما گاندھی اپنی ذات
کے لیے خیالی زندگی پر عملی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کس طرح سے
وہ بنی نوع انسان کی خدمت کر کے خدا کی عبادت میں زیادہ مسرت
محسوس کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:—
"خدا کی پرستش کرنا خدا کی تعریف کے بھجن گانا ہے۔ پوجا انسان
کی اپنی نا قابلیت اور کمزوری کا اعتراف ہے۔ خدا کے ہزارہا نام ہیں یا

یوں کہو کہ وہ بے نام ہے۔ ہم جس نام سے چاہیں اُسکی پرستش یا حمد کر سکتے ہیں۔ بعض اُسے رام کہتے ہیں، بعض کرشنا، باقی لوگ اُسے خدا کہتے ہیں، سب درحقیقت ایک ہی ذات کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح سے کھانے پینے کی تمام چیزیں سب کے موافق نہیں آتیں اسی طرح سے سب نام سب کو نہیں بھاتے۔ ہر شخص اپنے اپنے ماحول کے مطابق نام پسند کر لیتا ہے اور وہ یعنی ہمارے دلوں میں رہنے والا تمام طاقتوں کا مالک، تمام باتوں کا جاننے والا ہمارے دل کی گہرائیوں تک کے جذبات سے واقف رہتا ہے اور ہمارے خیالات کے مطابق ہماری آواز پر لبیک کہتا ہے

عبادت اور دعا ایسی چیزیں نہیں ہیں جو صرف لبوں سے ادا کی جائیں بلکہ انہیں دل سے ادا کرنا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ گونگا اور ہکلانے والا، جاہل اور بیوقوف بھی ساوی طریقہ سے انہیں انجام دے سکتا ہے، اور اُن لوگوں کی دعائیں جن کی زبانیں تو آبِ حیات ہیں مگر جن کے دل میں زہر بھرے ہیں، کبھی مقبول بارگاہ نہیں ہوتیں۔ لہذا جو شخص خدا کی عبادت کرنا چاہتا ہے اُسے پہلے اپنے دل کو پاک وصاف کر لینا چاہیئے۔ رام کا خدائی نام نہ صرف ہنومان[1] کے لبوں پر تھا بلکہ وہ اس کے دل پر نقش تھا۔ رام نام نے ہنومان کے دل میں

[1] ہنومان سے قصوں میں بندروں کا بادشاہ مراد ہے جس نے خدا کے اوتار رام کی خدمت کی تھی اور جسکی وہ نہایت خلوص دل سے پرستش کرتا تھا

لا تمنا ہی طاقت پیدا کر دی تھی۔ رام کی طاقت سے ہنومان نے پہاڑ کو اُٹھا لیا تھا اور سمندر کو عبور کر لیا تھا۔ اعتقاد ہی وہ چیز ہے جو متلاطم سمندروں میں سے ہمیں پار نکال لاتا ہے، اعتقاد ہی پہاڑوں کو متحرک کر دیتا ہے اور اعتقاد ہی ہے جو ایک چھلانگ میں سمندر کے پار پہنچا دیتا ہے۔ وہ عقیدہ ہمارے دل کے اندر کی زندگی بخش اور بیدار شعوری طاقت ہے جس کو ایسا عقیدہ مل جائے پھر اُسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی

'لیکن دل کو اس حد تک کس طرح سے پاک و صاف کیا جا سکتا ہے؟

صرف سچا پرستار ہی اِس راز سے واقف ہے اور وہی دوسروں کو اس کی تلقین کر سکتا ہے۔ گیتا نے سچے پرستار کی تعریف تین مقام پر کی ہے اور یوں تو ہر جگہ اس کا ذکر کیا ہے لیکن پرستار کی تعریف سے محض واقفیت مشکل سے ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ سچے پرستار دنیا میں شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے۔ اس لئے میں نے مذہب خدمت الناس کو ذریعہ قرار دیا ہے۔ خدا خود ایسے شخص کے دل کو اپنا مسکن بنانے کے لئے متلاشی رہتا ہے جو اُس کے بندوں کی خدمت کرتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر نے جنے اُسے دیکھا تھا اور جو اُس سے واقف تھا یہ شعر کہا ہے کہ وہی وشنو کا سچا پجاری ہے جو جانتا ہے کہ دوسروں کی تکلیف پر کس طرح سے پگھلنا چاہیئے۔ ابو بن ادھم بھی اسی نوع کا انسان تھا۔ اُس نے بنی نوع انسان کی خدمت کی تھی اور اسی لئے

اس کا نام اُن تمام لوگوں کی فہرست میں سب سے اوّل تھا جو خدا کے خدمت گذار تھے

لیکن دکھی اور مصیبت زدہ لوگ کون ہیں؟ وہ جو دبے ہوئے اور نکبت زدہ ہیں۔ لہذا جو شخص ان کی تن من دھن سے خدمت کریگا وہ یقیناً پرستارِ خدا ہے۔ جو شخص غربا کی طرح اپنے جسم کو بھی سوت کاتنے کے لئے بھی کام میں نہیں لانا چاہتا اور عذر لنگ پیش کرتا ہے وہ حقیقت میں خدمت کے مفہوم سے واقف نہیں۔ جو شخص غریبوں کے سامنے کاتتا ہے اور انہیں بھی تقلید کرنیکی دعوت دیتا ہے وہ ایسے طریقہ سے خدا کی خدمت کرتا ہے جو دوسرے طریقہ سے ممکن نہیں۔ گیتا میں سری کرشن جی فرماتے ہیں:۔ جو کوئی شخص مجھے پھل پھول حتیٰ کہ پتی جیسی معمولی چیز بھی خلوص کے ساتھ پیش کریگا وہ میرا خادم ہے اور اسکی نشست کا مقام وہ جگہ ہے جہاں غریب ترین اور ذلیل ترین اور گمراہ لوگ رہتے ہیں[1]۔ لہذا کاتنے کا فعل سب سے بڑی دعا ہے، سب سے بڑی عبادت ہے، سب سے بڑی قربانی ہے۔ دعا سے لبریز دل ایک ذریعہ ہے اور خدمت دل کو دعا سے لبریز بنا دیتی ہے۔ جو لوگ اس دور میں پورے دل سے اچھوتوں کی خدمت کرینگے وہ درحقیقت عبادت کر رہے ہوں گے۔ جو لوگ غربا اور محتاجوں کے لیئے دعا کرتے ہوئے کاتیں گے وہ حقیقی معنوں میں عبادت کر رہے ہوں گے"۔

[1] ٹیگور کی گیتا نجلی سے بھجن ۱۰

باب دوم

ہندو مسلمانوں کا مسئلہ

ہندو مذہب کے اس تخیل کی موجودگی میں جسے مہاتما گاندھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی زاویہ نگاہ سے وہ اسلام کو سمجھنے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کرینگے؟

ہندو مذہب اور پیغمبر عربی کے مذہب کے باہمی اختلافات زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب خدا کی پرستش کو پورے دل سے مانتا تو ہے لیکن اُس نے اُسے مورتیوں اور مندر کی پیچ در پیچ پوجا میں مرکوز کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام نے بت پرستی کے جملہ اقسام کو کلیتًا مسترد کر دیا ہے۔ ہندو مذہب مذہبی موسیقی اور مراسم کے ذریعہ عامۃ الناس کے دلوں میں رسائی حاصل کرتا ہے: برخلاف اس کے اسلام نے نماز کے اوقات میں موسیقی کو والہانہ شدت کے ساتھ مسترد کر دینے پر نہایت اصرار کیا ہے۔ ہندو مذہب اپنے فلسفہ مابعد الطبیعات کے باعث اور عوام الناس کے بے کینڈے خیالات کی ہمنوائی کے سبب نادیدہ اور ابدی ہستی کے بارے میں لاتعداد دیوتاؤں اور رشیوں کے لئے رکھتا ہے۔ اسلام صحرائے عرب کی سنسان تنہائی سے نکلنے کی

وجہ سے فلسفۂ مابعد الطبیعات کی اُلجھنوں سے ہمیشہ دور رہا ہے اور اس نے ایسے خدا کی وحدانیت پر ہمیشہ زور دیا ہے جو حواس انسانی سے بالاتر ہے اور جو ہر عظمت و جبروت کا مالک ہے

اِس طرح سے نہ صرف ظاہری امور میں جن کا اثر عامۃ الناس پر پڑتا ہے بلکہ اپنے معنوی فلسفہ میں بھی اِن دو مذاہب سے زیادہ مختلف مذاہب جنہوں نے شمالی ہندوستان کو دو طبقوں میں منقسم کر رکھا ہے، مشکل سے ملیں گے۔ صدیوں کی کشمکش کے بعد باہمی اتحاد معرض ظہور میں آ گیا ہے (جیسا کہ میں آگے چلکر بتاؤں گا) دونوں قوموں کے مشرقی صوفیا نے اختلافات کی خلیج کو عارضی طور پر پاٹ دیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندو مذہب اپنی جذب کرنے والی روایات اور حالات ماقبل کی موجودگی میں ہمیشہ سے اسلام کے ساتھ مصالحت کرلے پر آمادہ و تیار رہا ہے بشرطیکہ شرائط پیش کیجائیں۔ لیکن اسلام کی وحدانیت بالکل اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی

ہندوستان میں اسلام ابتدا ہی سے فاتح مذہب کی حیثیت سے ظاہر ہوا تھا۔ یہ مذہب نسلی اور ازدواجی اختلافات سے منفردانہ طریقہ سے مبرا رہا ہے۔ اُسکی قوت میں اُن لوگوں کی آمیزش سے بہت اضافہ ہوا ہے جو اُس میں داخل نہ تھے۔ یہ شروع ہی سے تبلیغی مذہب رہا ہے اور اس نے غیر مذاہب والوں کو اپنی آغوش میں اس حد تک لیا ہے کہ اب اسکی تعداد ۲۲ کروڑ باشندوں کی

آبادی میں، کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مقابلتاً ایک قلیل مدت تک ابتدائی مغل شہنشاہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نمایاں رواداری کا برتاؤ رکھا تھا لیکن شہنشاہ اورنگ زیب کی مذہبی حرارت نے انہیں بت پرستوں کے ساتھ جنگ کرنے میں زیادہ دقیانوسی طریقوں کا خوگر بنا دیا۔ انھوں نے ہندوؤں کے مقدس شہر بنارس کے عین وسط میں فخر و مباہات کے طریقہ پر بلند میناروں والی اپنی مسجد بالآخر تعمیر کرا ہی دی۔ اُن کی وفات کے بعد اُسوقت بھی جبکہ شہنشاہوں کی کمزور حالت نے انہیں اورنگ زیب کی غیر مصالحانہ حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا، دونوں قوموں کی تلخ منافرت دل ہی دل میں سلگتی رہی اور ملتہب آتش انگیزی کے لیے موقع کی منتظر رہی۔ جدید ہندوستان کا آخری مسئلہ انہی دو مخالف مذاہب کا اتحاد ہے

بلاشبہ کوئی شخص بھی ہندوستان کے خلاف مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کے مظالم پر جو سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ماتحت کیے گئے تھے چشم پوشی کرنے کا خیال تک نہ کرے گا۔ خود ہندوستان کے مسلمان مؤرخوں نے ان کی مذمت کی ہے۔ لیکن جب ہم آج بہ حیثیتِ مجموعی ہندوستان کا تصور کرتے ہیں نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس طرح سے جن معاملات میں جو قومی زندگی کے لئے نہایت ضروری و اہم ہیں، شمالی

ہندوستان اسلام کی موجودگی کی وجہ سے اُس مردہ اور بوسیدہ مواد کے اجتماع سے حقیقی معنوں میں پاک وصاف کردیا گیا ہے جو نہ صرف ناخوشگوار تھا بلکہ زہریلا بھی تھا۔ اگر چھوت چھات کے زہریلے بخارات اور مورتی پوجا کی زیادہ ناقص اشکال کو شمالی ہند کی فضا سے بمقابلہ جنوبی ہند کے دور کردیا گیا ہے تو یہ اُس مذہب کی مسلسل موجودگی کا کچھ کم اثر نہیں ہے جس نے نہ صرف یہ کہ مذہبی مراسم کی باافراط خس وخاشاک کی بالیدگی کو جس نے خدائے واحد کی خالص پرستش کی راہ میں مزاحمتیں پیدا کردی تھیں دور کردیا بلکہ ساتھ ہی اس امر کا بھی اعلان کردیا کہ خدا کی نظر میں تمام ایمان والے مساوی رتبہ رکھتے ہیں

اسی طرح سے ہندوستان میں اسلام جہاں کہیں اس کی حکومت رہی ہے، صفائی و پاکیزگی پیدا کرنے والا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ مشرق ومغرب دونوں کے لئے مساوی طور پر اسکی عظیم الشان برکات میں سے ایک بڑی برکت اس کا وہ اصرار ہے جو اس نے انسانی تاریخ کے ایک نہایت نازک موقع پر خدائے برتر کی وحدانیت پر قائم رکھا۔ اس لئے کہ قرونِ مظلمہ کے دور میں مشرق ومغرب دونوں میں سنہ ۶۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۰۰۰ء تک اس امر کا سخت خطرہ تھا کہ کہیں یہ اصول خود ہندو مذہب کے اور خود عیسائیت کے ان بیشمار رشیوں، دیوتاؤں، پیروں اور مقدس ہستیوں کی

ضمنی پرستش کی لاانتہا زیادتیوں کے بوجھ سے دبکر گم ہوکر نہ رہجائے۔
اسلام یورپ اور ہندوستان دونوں کے لئے خدا کی وحدانیت کی
اعلیٰ ترین صداقت سے انحراف و گمراہی کے تاریک ترین زمانہ میں
ایک نہایت قیمتی مصلح اور محتسب ثابت ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہی
صداقت پر آخری زور دئیے بغیر جو اسلام نے اپنی مرکزی پوزیشن
سے پہنچایا۔ اس لئے کہ اُس کا ایک رخ تو ہندوستان کی طرف تھا
اور دوسرا رخ یورپ کی طرف — یہ امر مشکوک رہتا ہے کہ آیا ہی
اصول کو کہ خدا ایک ہے، انسانی تخیل میں وہ رتبہ ملتا جو آج علمی
دنیا میں اُسے حاصل ہے اور جو عام آدمیوں میں اسقدر وسیع طریقہ
سے پھیلا ہوا ہے۔ اُس نے اُس شہادت کو جسے ہمیشہ سے مذہب
یہود نے پیش کیا ہے، زندگی بخش طریقہ سے مستحکم کر دیا
مزید برآں یہ خدائی حقانیت جسے اسلام اور یہودیت دونوں نے
قائم و برقرار رکھا ہے، سائنٹفک تخیل کا کوئی مجرد مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ
یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمام تجربوں میں سب سے زیادہ زندگی بخش
اور خالص مذہب کی حقیقی روح ہے۔ غالباً اسلام کی کسی دوسری
چیز کے مقابلہ میں خدائی وحدانیت کے اسی پہلو نے شمالی ہندوستان
پر اپنا سب سے گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہے۔ جو نغمہ اُس کے ساز سے
بلند کیا گیا ہے وہ پاکیزگی کا نغمہ ہے، لیکن اسلام نے جو سب سے
بڑا فائدہ بنی انسان کو پہنچایا ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے مذہب کو

ہر خس و خاشاک سے پاک و صاف کر دیا ہے

جو کچھ میں اوپر تحریر کر چکا ہوں اُس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہندوستان میں قومی اتحاد و اتفاق حاصل کرنے کی غرض سے جن نہایت عظیم الشان مشکلات پر قابو پانا ضروری ہے اُن میں سے ہندو مذہب اور اسلام کی یہ براہ راست مخالفت بھی ایک ہے۔ جہاں موخر الذکر مذہب نے مصلح کی حیثیت سے عمل کیا ہے وہاں سخت عناد بھی پیدا کر دیا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جو ہندوؤں کے دلوں کی عمیق ترین گہرائیوں جا گزیں ہو گیا ہے۔ آج مشرق میں جو شدید مذہبی آویزش ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اُس سے زیادہ زبردست اور کوئی چیز نہیں ممکن ہے کہ طویل مدتیں گذر جانے پر یہ تلخی جہاں تک عامۃ الناس کا تعلق ہے بے حس ہو جائے، اور ممکن ہے کہ باشندگان ہندوستان کی فطری مروت اور نیک طینتی از سر نو غلبہ حاصل کر لے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دیر یا سویر جیسا کہ زمانہ گذشتہ کی تاریخ سے ظاہر ہے مذہبی منافرت کی ایک لہر تمام ملک میں پھیلیگی اور اُسوقت عمیق گہرائیوں سے چھپے ہوئے جذبات خوفناک شکلوں میں سطح پر نمودار ہو جائیں گے

یہ بہتر ہو گا اگر اُن بڑے بڑے نزاعی مسائل میں سے جنھوں نے آج ہندو مذہب کو اسلام سے جدا کر رکھا ہے ترتیب وار بیان کر دیا جائے

۱۔ اسلام تمام بت پرستوں کو گنہگار خیال کرتا ہے۔ وہ کسی قسم کی تصویر پرستی کی بھی اجازت نہیں دیتا اور بت پرستوں کو خدائے تعالیٰ کا مغضوب قرار دیکر اُن کی مذمت کرتا ہے

۲۔ اسلام ایک مذہبی تہوار کے موقع پر مذہبی فریضہ کی حیثیت سے جانور کی قربانی کی اجازت دیتا ہے۔ بسا اوقات یہ جانور گائے ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گائے کی بجائے دوسرے جانور کی قربانی کی جا سکتی ہے، لیکن ابھی تک گایوں کو اسلام کے نام سے ذبح کیا جاتا ہے، اور اس فعل نے جاہل اور اَن پڑھ ہندوؤں کو یہاں تک مشتعل کر دیا ہے کہ معاملہ غالباً صبر و سکون کی حد سے گذر گیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُن کے غم و غصہ کا مشاہدہ کیا ہے اور وہ کچھ ایسی ہی چیز ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا

۳۔ راسخ العقیدہ ہندو اِس کو پاپ سمجھتے ہیں کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے کھانے پینے کی چیزیں لیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو وہ ذات باہر ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے ان دونوں قوموں میں شادی بیاہ نہیں ہو سکتا۔ گندگی کے اس تخیل سے جو ہندو کے دماغ پر تقریباً ہر وقت مسلط رہتا ہے، مسلمان ہمیشہ رنجیدہ ہوتے ہیں

۴۔ عام ہندو باشندے اس پر مصر رہتے ہیں کہ بازاروں میں حتیٰ کہ مساجد کے سامنے بھی باجہ بجایا جائے بالخصوص جبکہ مذہبی مراسم ادا کئے جا رہے ہوں۔ خدا ترس مسلمان ہمیشہ نہایت گہرے

طریقے سے مشتعل ہو جاتے ہیں جبکہ وہ ان تہواروں کے موقعوں پر ہندو دیوتاؤں کو اپنی مساجد کے دروازے کے پاس سے ٹھہر ٹھہر کر گذرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بات زیادہ تر شمالی ہندوستان میں نماز کے مقدس اوقات میں دیکھنے میں آتی ہے کیونکہ اُسوقت باجے کے ساتھ ڈھول اور تاشے بھی زور زور سے بجائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی موسیقی خاموش نمازیوں کی نماز میں خلل انداز ہوتی ہے اور اکثر اوقات جذبات کو مہلک نقطہ تک بھڑکانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ میں نے ایک معمر نیک سیرت مسلمان سے اِس مسئلہ پر گفتگو کی ہے جنکی نمازیں ہمیشہ اس طرح سے خلل ڈالا جاتا تھا۔ وہ موت کے منہ کے قریب پہنچ چکے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان کے دل سے منافرت کے تمام جذبات مفقود ہو چکے ہوں گے، لیکن اُن کی خوبصورت روح میں جو زخم پیدا ہو گیا تھا، وہ صاف نظر آرہا تھا

اِس طرح ان دونوں مذاہب کے نام لیواؤں کے لئے یہ دشمنیاں اور منافرت سخت تکلیف دہ مسائل بنی ہوئی ہیں۔ جاہل اور اَن پڑھ طبقہ کے لئے جو صرف ظاہری اشکال سے متاثر ہونے کا عادی ہے، ایسی تکلیف دہ چیزیں بالخصوص جبکہ اُن کی نمایش بازاروں میں کیجائے، تقریباً ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ جب اسلام کے پیرو کسی گائے کو قربانی کی غرض سے گلے میں ہار ڈالکر ذبح کی طرف لیجاتے ہیں اور علامتوں سے ظاہر کرتے ہیں کہ اُسے ذبح کیا جائے گا یا جبکہ ہندو مذہب کے پیرو مورتی پوجا

کے ساتھ زور زور سے اپنے ڈھولوں کو پیٹتے ہوئے مساجد کے دروازوں
کے پاس سے گذرتے ہیں اُسوقت فسادات رونما ہو جاتے ہیں اور
خونریزی ظہور میں آجاتی ہے۔ اسی قسم کی خونریزی کو روکنے اور قتل و غارت
کے ایسے ہی واقعات کی تلافی کرنے کی غرض سے مہاتما گاندھی نے مشہور
ومعروف برت رکھا تھا جس کا مفصل حال کسی دوسری جگہ درج ہے
اِن تمام صدیوں میں جو پہلے اسلامی حملے کے بعد سے گذری ہیں، طرفین
کے نیک دل آدمیوں کی جانب سے ان گہرے اختلافات کو مغلوب کرنے
کے لئے زبردست کوششیں ہو چکی ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ہندو مذہب
کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں نے سارے شمالی ہندوستان میں مشرق
میں بنگال سے لیکر مغرب میں سندھ تک اسلام کو سمجھنے کی نہایت سنجیدہ
اور مسلسل کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے خدا کی وحدانیت کے بنیادی
اصول کو خود اپنے اپنشدوں کی تعلیم کے مطابق کرنے کی کوشش کی اور
اس میں انہوں نے یہاں تک غلو کیا کہ مورتی پوجا اور ذات پات کو بھی
نہایت حقارت سے دیکھنا شروع کردیا۔ مزید برآں انہوں نے ایسے
خلوص اور نیکی کے ساتھ اسلام کا احترام کرنا شروع کیا، بالخصوص انہوں
نے جو صوفیا کہلاتے تھے، کہ مسلمان پیروں نے اپنی طرف سے ہندوؤں کے
مذہبی فلسفہ کو لبیک کہا اور ان کے مقاصد کو اپنے میں جذب کر لیا۔ اسطرح
سے ابتدائی مختلف زمانوں میں یہ بات ممکن الوقوع خیال کی جاتی
تھی کہ ہندو مذہب اور اسلام کے درمیان اتحاد عمل میں آجائے گا لیکن

23613I

طرفین کی درشت راسخ العقیدگی اور کٹر پن نے ہمیشہ اس اتحاد کی راہ میں مزاحمت کی اور معاملات کو بار بار پریشانی اور خرابی میں ڈال دیا

ہندوستان میں مہاتما گاندھی اپنی زندگی کے ایک دور میں جسے تحریک عدم تعاون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسلام کے اس قدر قریب پہنچ گئے تھے کہ زمانۂ حال میں ہندو مذہب کبھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ انہوں نے دیکھا کہ اسلام کے پکے پیروؤں کو جو اپنے مذہب کے پیشوا کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں رہنے والے خلیفۃ المسلمین کا احترام کرتے ہیں، شکست کی ذلت آفرین شرائط سے تکلیف پہنچی ہے جو بعد از جنگ خلیفۃ المسلمین پر عائد کی گئی تھیں۔ کیونکہ فاتح اتحادی خود خلافت کے درپے تھے اور وہ خلیفہ کی دنیوی طاقت کے بیشتر حصہ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور اس طرح سے اسلام کا مرکز خطرہ میں آگیا تھا

گذشتہ کئی صدیوں سے خلیفہ کے مقدس عہدہ پر سلاطین ترکی فائز ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جنکی تعداد سات کروڑ سے متجاوز ہے، اتحادیوں کو مطلع کر دیا تھا کہ اگر وہ ترکی کے خلاف صف آرا ہوں گے تو صرف اس صورت میں کہ خلیفہ کی دنیوی اور روحانی طاقت کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے۔ انہوں نے اس امر کا بھی مطالبہ کیا تھا کہ اسلام کے مقدس دو شہروں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ[1]

[1] حرمین سے ہمیشہ مکہ اور مدینہ مسلم مراد لئے جاتے ہیں۔ مترجم

کی محافظت بدستور سابق خلیفۃ المسلمین کی سپردگی میں رہنی چاہیے اور ان میں کسی قسم کی مداخلت عمل میں نہ آنی چاہیئے اس لئے کہ ہر سال ہزارہا حاجی اُن کی زیارت سے شرف اندوز ہونے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے جو سرکاری بیان دیا تھا، اُسے جملہ مسلمانانِ ہند نے قابل اطمینان وعدہ کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی اہمیت رکھنے والے دونوں امور کو منظور کر لیا گیا ہے

لیکن جب جنگ ختم ہو گئی، اتحادیوں کا طرزِ عمل سلطان ٹرکی کے ساتھ ایسا رہا کہ مسٹر لائڈ جارج پر فی الفور یہ الزام مسلمانوں کی طرف سے عائد کیا گیا کہ انہوں نے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے وعدہ کو توڑ دیا ہے۔ شمالی ہندوستان کی مسلم آبادی میں بیحد ہیجان پیدا ہوا اور خلیفۃ المسلمین کی حمایت میں ایک تحریک شروع کی گئی جس کا نام تحریک خلافت تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ٹرکی کے لئے بہتر شرائط صلح حاصل کرے اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا کی حیثیت سے خلیفۃ المسلمین کے اقتدار کو بحال کرائے

عین اُس موقع پر مہاتما گاندھی نے جنکی ہمیشہ دلی تمنا یہی رہی ہے کہ وہ ہندو مسلمانوں کو متحد کر کے ایک ہندوستانی قوم بنا دیں مسلمانوں کی امداد کرنے کی غرض سے ایک ایسے کام میں جسے وہ مذہبی سمجھتے تھے، نفسیاتی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے

لئے اپنی کامل عقیدت کا اظہار کیا اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنی ساری خدمات پیش کر دیں۔ اِس طرح سے مسئلۂ خلافت جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے باعثِ ہیجان بنا ہوا تھا ایک مدت کے لئے تپاک آمیز اتحاد کا باعث بنگیا

جنگ کے اختتام پر شمالی ہندوستان میں اس صورت حالات کو صاف صاف الفاظ میں بیان کرنا یوں ناگزیر ہو گیا ہے تاکہ "ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر مہاتما گاندھی کی تحریر کا جو اقتباس پیش کیا جا رہا ہے اُس کی تشریح ہو سکے۔ اُس کے پڑھنے سے اندازہ ہو جائیگا کہ وہ کہاں تک جانے کے لئے تیار تھے، اور کس نقطہ پر پہنچ کر وہ مجبور ہوئے کہ خطِ تمیز کھینچ دیں۔ وہ رقمطراز ہیں :-

مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ اگر میں ہندو مسلم اتحاد میں صادق ہوں تو کیا مسلمانوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دوں گا اور کیا میں اپنی لڑکی کی شادی کسی مسلمان کے ساتھ کرنے پر تیار ہو جاؤں گا۔ یہی سوال بعض دوستوں نے دوسرے طریقہ سے پوچھا ہے جو درج ذیل کیا جاتا ہے: "کیا ہندو مسلم اتحاد کے لئے بین الاقوامی خورد نوش اور بین الاقوامی بیاہ ضروری ہے؟"

سائل کہتے ہیں کہ اگر یہ باتیں ضروری ہیں تو اُس صورت میں حقیقی اتحاد کبھی نصیب نہیں ہو سکتا، کیونکہ کروڑہا راسخ العقیدہ ہندو شادی بیاہ تو کجا آپس میں کھانے پینے پر بھی راضی نہ ہوں گے

میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو ذات کو نقصان رساں ادارہ نہیں سمجھتے۔ ابتدا میں ذات ایک صحت بخش رسم تھی اور اس سے قومی بہبودی اور فلاح میں ترقی ہوتی تھی۔ میری رائے میں یہ خیال کہ بین الاقوامی کھانا پینا اور بین الاقوامی شادی بیاہ قومی نشوونما کے لئے لازمی باتیں ہیں، ایک وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جسے مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ کھانا زندگی کی دوسری صحت بخش ضروریات کی طرح ایک حیات پرور عمل ہے، اگر بنی نوع انسان نے کھانے پینے کو ایک ناحق کی نمائش اور عیاشی کی چیز نہ بنا لیا ہوتا (اور ایسا کرنے سے بجز نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا) تو ہم کھانے کے عمل کو نجی طور پر اُسی طرح سے ادا کرتے جس طرح سے کہ زندگی کے دوسرے ضروری کاموں کو تنہائی میں ادا کیا کرتے ہیں۔ بلا شبہ ہندو مذہب کی اعلیٰ تہذیب اب تک کھانے پینے کو اسی روشنی میں دیکھتی ہے اور اب بھی ہزارہا ہندو ایسے ہیں جو کسی دوسرے شخص کی موجودگی میں کھانا پسند نہیں کرتے۔ میں چند نہایت مہذب اور متمدن مردوں اور عورتوں کے نام گنوا سکتا ہوں جو نہایت خفیہ طریقہ سے کھانا کھایا کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ کسی سے بغض و عناد نہیں رکھتے اور سب کے ساتھ نہایت دوستانہ روابط رکھتے ہیں

بین الاقوامی شادی کا سوال اس سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر بہن بھائی ایک دوسرے سے شادی کا خیال کئے بغیر دوستانہ انداز

میں رہ سکتے ہیں تو مجھے اپنی بیٹی کے متعلق ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھنے میں کوئی دقت معلوم نہیں ہوتی اور اسی طرح ہر مسلمان کے اُسے اپنی بہن خیال کرنے میں۔ میں مذہب اور شادی کے بارے میں بہت پختہ خیالات رکھتا ہوں۔ جتنا زیادہ قابو ہم اپنی خواہشات پر رکھیں گے خواہ وہ کھانے سے متعلق ہوں یا شادی سے اتنا ہی زیادہ ہم مذہبی نقطہ نظر سے بہتر ہوتے جائیں گے۔ میں دنیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو ترقی دینے سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاؤں گا اگر مجھے کسی نوجوان کے اس حق یا موزونیت کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ میری بیٹی سے شادی کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو پیش کرے، یا میرے لئے یہ ضروری خیال کیا جائے کہ میں ہر کس و ناکس کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں تمام دنیا کے ساتھ دوستانہ روابط رکھتے ہوئے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں نے کسی مسلمان یا عیسائی سے کبھی کوئی تنازعہ نہیں کیا۔ برسوں سے میں نے اُن کے گھروں میں سوائے میوہ جات کے اور کوئی چیز نہیں کھائی۔[1] لیکن ان معاملات میں جو پابندی میں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے یا جو علیحدگی مجھ سے ظہور میں آتی ہے وہ اُن کے ساتھ میرے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوئی

[1] کٹر ہندو بھی بسا اوقات غیر پکی ہوئی غذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے ہاتھ سے کھا لیتے ہیں لیکن اس سے آگے بڑھنے اور پکی ہوئی غذا کھانے کے معنی ذات باہر ہو جانے کے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ آپس میں کھانا پینا اور شادی بیاہ کرنا دوستی یا اتحاد کے ضروری اجزا نہیں ہیں اگرچہ بسا اوقات وہ اس کی ظاہری علامات ضرور ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک پر یا دوسرے پر اصرار کرنا آسانی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس امر کا یقین کر لیں گے کہ ہندو اور مسلم کبھی ایک نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ آپس میں کھانا پینا اختیار نہ کرینگے یا شادی بیاہ نہ رچائیں گے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپس میں ایک بناوٹی دیوار قائم کر رہے ہیں جسے بمشکل تمام گرایا جا سکتا ہے

میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یہ امر قطعاً ناممکن ہے کہ وہ آپس میں شادی کریں اور ایک دوسرے کے مذہب پر قائم رہ سکیں، اور ہندو مسلم اتحاد کی حقیقی خوبصورتی اسی بات میں مضمر ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر قائم رہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کا دوست اور بہی خواہ بھی رہے، کیونکہ ہمارے سامنے جو تخیل ہے وہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان حتیٰ کہ راسخ العقیدہ قسم کے اشخاص بھی، ایک دوسرے کو اپنا قدرتی دشمن نہ سمجھیں جیسا کہ وہ اب تک سمجھتے آئے ہیں

اچھا تو پھر ہندو مسلم اتحاد کس بات پر منحصر ہے اور اسے کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے؟ جواب آسان ہے۔ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہمارا مقصد مشترک ہو، ہمارا نصب العین ایک ہو اور ہمارے مصائب

مشترک ہوں۔ مشترکہ مقصد تک پہنچنے میں باہمی اتحاد عمل سے، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے سے اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے سے ہم اُسے بہترین طریقہ سے ترقی دے سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو بہرحال ایک ہی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارا عظیم الشان ملک زیادہ شاندار بنے اور اُسے حکومت خود اختیاری ملے۔ ہمارے معاملے اتنے کافی ہیں کہ ہم اُن میں شریک ہو سکتے ہیں، اور آج یہ دیکھ کر کہ مسلمان مسئلۂ خلافت پر سخت بے چین ہیں اور ان کا مقصد بالکل حق بجانب ہے، ہندوؤں کے لئے مسلمانوں کی دوستی حاصل کرنے کی غرض سے اس سے زیادہ طاقتور اور کوئی چیز نہیں کہ وہ اُن کے دعوے کی دل و جان سے تائید کریں۔

باہمی رواداری کی ضرورت ہمیشہ رہے گی اور یہ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت تمام اقوام کو ہے۔ ہم امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے اگر ہندو مسلمانوں کے طریقۂ نماز، ان کے عادات وخصائل اور رسم و رواج کے ساتھ رواداری کا اظہار نہ کرینگے، یا اگر مسلمان ہندوؤں کی بت پرستی (مورتی پوجا) یا گئو رکھشا سے دل برداشتہ ہو جائیں گے۔ بردباری اور رواداری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ میں اسکو پسند بھی کر لوں جس کے متعلق میں احساس رواداری برت رہا ہوں۔ میں شراب خواری گوشت خوری اور تمباکو نوشی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں ان سب باتوں کو

برداشت کرتا ہوں بعینہٖ جس طرح سے کہ میں اُن سے متوقع ہوں کہ وہ ان تمام چیزوں سے میرے پرہیز کو برداشت کریں، خواہ وہ اُسے بری ہی نظر سے کیوں نہ دیکھتے ہوں۔ ہمارے جتنے جھگڑے ہیں وہ سب اسی وجہ سے شروع ہوئے ہیں کہ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کو بجبر اپنا ہم خیال بنالے"

جتنا زیادہ ہم مہاتما گاندھی کی زندگی اور تعلیمات کا مطالعہ کرینگے اتنا ہی زیادہ یہ امر یقینی ہو جائے گا کہ سب سے زیادہ جس چیز نے ان کے خیالات اور افعال کو ڈھالنے میں اثر ڈالا ہے وہ ہندو مذہب ہی ہے۔ وہ ہندو کتب مقدسہ کے لفظی مفہوم کے قائل نہیں ہیں اور نہ وہ اُن کے بنیادی اصولوں کو جوں کا توں مانتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ساتھ اُن کی حیرت انگیز رواداری اور ہمدردی انسانی زندگی کے بارے میں ان کے سارے نقطہ نظر پر اثر انداز ہوئی ہے اور اکثر اوقات وہ انہیں ایک غیر متیقن پوزیشن کا حامل بنانے کے قریب لے آتی ہے جتنا کہ وہ درحقیقت ہیں۔ لیکن پابند مذہب اور نیک طینت ہندو صوفی کی طرح اُن کی ماں کا اثر اُن کے دماغ اور ضمیر پر عود کر آتا ہے اور قدیم ہندو اشلوکوں کی خوشبو انہیں اس قدر معطر بنا دیتی ہے کہ پھر اُن کے خیال میں دنیا کی کوئی چیز خوبصورتی، سچائی اور لطافت میں اُن کی برابری نہیں کرسکتی۔ میں نے متعدد بار اس کا مشاہدہ کیا ہے بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ

نہایت دوستانہ طریقہ پر اُن کے ساتھ بود و باش رکھتا تھا اور مذہب کے متعلق اُن کے عمیق ترین خیالات سے مستفید ہوا کرتا تھا
اُن کی قدامت پسندانہ راسخ العقیدگی ہی جس کے ساتھ ساتھ سچی اور روحانی آزادی بھی اُن میں پائی جاتی ہے، عامۃ الناس کی نظر میں اُن کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے۔ وہ لوگ انہیں ہندوؤں کی کتب مقدسہ کی اس ظاہری علامت ہی کے ذریعے سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اُن کی ہندی زبان کی سیدھی سادی تقریر ہندو کتب مقدسہ کی تفصیلات اور تشبیہات اور استعارات اور کنایوں سے بھرپور ہوا کرتی ہے۔ سیدھے سادے دیہاتی کروڑوں کی تعداد میں اُن کے روزوں اور قربانیوں، اُن کے عہدوں اور ترک اشیا کے اظہار کا نہایت فکرمندی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں اور فوراً بغیر دقت کے اُن کے بنیادی جذبات کو سمجھ جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حیرت انگیز طریقہ پر مذہب کے پابند اور نہایت نیک سیرت ہوتے ہیں اور جہاں کہیں وہ جاتے ہیں، ہر جگہ انہیں گھیرے رکھتے ہیں۔ ایسے ایک موقع پر جبکہ چاند میں گرہن لگ رہا تھا میں نے تقریباً ایک لاکھ دیہاتیوں کا مجمع دیکھا جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ یہ لوگ اُن کے شبدوں کو سننے کے لئے دُور دُور سے آئے تھے۔ وہ اس رات اس سبب سے بھی جمع ہوئے تھے کہ اُس مذہبی رسم کو ادا کریں جو گرہن کے وقت ادا کی جاتی ہے، لیکن مقرر

پر اُن کی توجہ اس وفورِ شوق کے ساتھ مرکوز تھی کہ اُن میں سے ایک نے بھی حرکت نہیں کی۔ مہاتما گاندھی کا دیدار ہی ان میں سے ہر ایک کی نظر میں تزکیۂ باطن کے لئے کافی تھا اور وہ ان کا دیکھ لینا ہی عبادت سمجھتے تھے۔ ٹھیک جس طرح کہ مسٹر گاندھی انہیں سمجھنے میں غلطی نہیں کرتے بعینہٖ اسی طرح سے وہ بھی اپنی باری سے انہیں صحیح طریقہ سے سمجھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ان کی رہنمائی کو قبول کر لیتے ہیں

اِس طریقہ سے مہاتما گاندھی ہندوستان کی سرزمین سے گہرے طور پر پیوست اور وابستہ نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے شخص کی طرح سے نہیں ہیں جو اپنے ملک سے سرد کا رنہ رکھے۔ وہ اُن لوگوں کی مانند نہیں ہیں جو ہندوستان سے عرصۂ دراز تک الگ رہنے کی وجہ سے کلیتًا مغرب کے آداب ورسوم اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن کا دماغ ہر وقت زیادہ وسیع حلقوں میں وسعت پذیر ہوتا رہتا ہے جیسا کہ ہم بعد کی تحریرات میں دیکھیں گے۔ لیکن اُن کی زندگی کا دل ہمیشہ ہندوستان ہی میں رہتا ہے اور اُسی سے اُن کی پہلی اور آخری محبت ہے

میں جب کبھی اُن کو دیکھتا ہوں اُسوقت میرے خیالات خود بخود ورڈزورتھ[1] کی نظم "سکائی لارک" کی طرف منعطف ہو جاتے ہیں جو شیلی کی اسی نوع کی نظم سے

[1] تا سکھ ورڈزورتھ (WORDSWORTH) کی نظم "سکائی لارک" (SKYLARK.)

ایک پر کیف نظم ہے جس میں شاعر جنڈ دل کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے کہ اے آسمان کے جاتری تو کیوں آسمان پر آوارا ابر لئے اور پھر خود ہی کہتا ہے کہ کیا اسکی وجہ یہ تو نہیں (بقیہ صفحہ ۷۷ پر)

کس قدر حیرت انگیز طریقہ سے مختلف ہے۔ بعض امور میں شیلی کا تخیل رابندرا ناتھ ٹیگور کی نظم کی بلند پروازیوں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک مہاتما گاندھی کا تعلق ہے اُن کی ساری کشش سرزمین ہندوستان ہی کی جانب رہتی ہے حتی کہ تخیلی مضامین کی بہادرانہ خیال آرائیوں میں بھی وہ اُسے فراموش نہیں کرتے۔ وہ "زمین کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتے جہاں سوائے فکروں اور پریشانیوں اور کچھ نہیں" خواہ وہ دل میں "آسمان کا جاتری" ہی رہنا کیوں نہ پسند کریں۔" اُن کا نغمہ جو زائیدۂ محبت ہے "جیسے گاتے ہوئے وہ "نظر کی بلندی کے آخری نقطہ" پر چڑھ جاتے ہیں، "ارضی میدانوں کے جگر تک کو متاثر کر دیتا ہے" نظم کے آخری مصرع کے الفاظ میں "وہ ہمیشہ ہمیشہ اور تمام مواقع پر آسمان اور زمین کے ہم جنس مقامات ہی میں رہتے ہیں"

اگر اختتام پر یہ سوال کیا جائے کہ مہاتما گاندھی بحیثیت مذہب کے شعوری طور پر اسلام سے کس حد تک مستفید ہوئے ہیں بعینہٖ جس طرح

(بقیہ صفحہ ۷۶) کہ تو زمین کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے جہاں سوائے فکروں اور پریشانیوں کے کچھ نہیں پایا جاتا۔ شاعر چنڈول کے نغمہ کو زائیدہ محبت کے نام سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگرچہ تو اس بلندی پر اڑتا ہوا آتا ہے جہاں نظر کو بھی رسائی نہیں تاہم تیرا نغمہ ارضی میدانوں کے جگر تک کو متاثر کر دیتا ہے۔ آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ تو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا پھرتا ہے تاہم درحقیقت تو آسمان اور اپنے گھر یعنی زمین کے ہم جنس مقامات میں رہتا ہے چنڈول پر شیلی (SHELLEY) نے بھی نظم لکھی ہے لیکن معاصرین اول الذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ مترجم

سے انہوں نے بدھ مت اور عیسائیت کی تعلیمات سے فائدہ اُٹھایا ہے
تو اس کا فوری جواب دینا بالکل آسان کام نہیں ہے اگرچہ وہ لوگ جو
اُن سے گہرے اور ذاتی روابط رکھتے ہیں، واقف ہیں کہ اسلام سے
تعلق رکھنے کی وجہ سے خود اُن کی زندگی میں عظیم الشان فرق پیدا ہوگیا ہے
جو کچھ یقینی طور پر معلوم ہے وہ یہ ہے: وہ صاحبِ ایمان اور
صاحبِ عمل ہونے کی حیثیت سے حضرت محمد (ص) کی سیرت کا زیادہ
احترام کرتے ہیں اور اسی طرح آپ کے داماد حضرت علی (رض) کا بھی
نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ محبت کے پتلے تھے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ
بہادری کے ساتھ مصائب برداشت کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں
باتوں نے نہایت گہرے طریقہ سے اُن پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ بلاشبہ
انھوں نے بہت تفحص کے ساتھ اسلام کی ترقی کے تاریخی کارناموں
کا مطالعہ کیا ہے اور وہ خلفائے راشدین کی شرافتِ نفسی اور نبی
کریم (ص) کے اولین متبعین کے والہانہ جوشِ ایمانی سے بیحد متاثر ہوئے
ہیں۔ اُن کی سیدھی سادی زندگی، اُن کی غربا پروری اور خدا کی عظمت
وجبروت پر اُن کا زبردست ایمان، ان تمام باتوں نے اُن پر بہت
زیادہ اثر ڈالا ہے، کیونکہ مہاتما گاندھی کی زندگی میں خود درویشانہ
سادگی کی ایک شان پائی جاتی ہے جو ان جیسے امور سے نہایت زبردست
طریقہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی

مزید برآں پیغمبر اسلام (ص) کی تقلید میں مہاتما گاندھی نے ایک لمحہ

کے لئے بھی سیاسیات کو روحانیات سے جدا نہیں کیا اور نہ اُن معاشرتی خرابیوں کا جو اُن کی نگاہ میں آگئیں، تدارک کرنے میں کچھ کمی کی۔ اس طرح سے بحیثیت رلیفارمر کے آنحضرت (صلعم) کا اعلیٰ، عملی اور فطری جذبہ جس کے ساتھ کائنات کے واحد خالق اور منتظم کے طور پر خدا کی ذات پر آپ کے زبردست جوش ایمانی کو بھی شامل کرلینا چاہیئے۔ مہاتما گاندھی کے لئے اُن کی اپنی کشمکش میں مسلسل تقویت اور ڈھارس کا ذریعہ رہا ہے۔ مجھے ذاتی تجربہ کی بنا پر ان سب باتوں کا کافی علم ہے۔ خود اُن کے مکان واقع سابرمتی میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے پاس وہ نماز کے اوقات میں خاموش مشورہ، ہمدردی اور اعانت کے لئے اُس سے زیادہ یقین کے ساتھ جاتے ہوں جتنا وہ امام صاحب کے لئے ظاہر کرتے ہیں۔ امام صاحب موصوف جنوبی افریقہ میں اُن کے شریکِ کار رہ چکے ہیں اور اب آشرم میں اُن کے ساتھ ہی قیام پذیر ہوگئے ہیں۔ اُن کی باہمی محبت میں گذشتہ تیس سال سے کوئی فرق نہیں آیا[1]۔

علاوہ ازیں جب کبھی مہاتما گاندھی اپنی جد و جہد کے اِس سیاسی پہلو سے ہٹے ہیں تاکہ انتقام لئے بغیر تکلیف برداشت کرنے کے عظیم الشان تخیل کے لئے تقویت حاصل کریں، اس وقت انہوں نے

[1] آپ کا پورا نام امام عبدالقادر باوزیر تھا تقریباً دو سال ہوئے آپ کا انتقال ہو چکا ہے مترجم

حضرت رسول کریم (صلعم) کے داماد اور حضرت حسن (رضہ) اور حضرت حسین (رضہ) ہی کی سیرت کو مثال کے طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ آنحضرت (صلعم) کے نواسہ کی مصائب کی داستان ہر سال محرم کے موقع پر دہرائی جاتی ہے اور بلا شبہ وہ انتہائی حزن وملال پیدا کرنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ وہ داستان اس امر کی مثال پیش کرتی ہے کہ انسانی دل کس طرح سے اُن بہادرانہ درگزر اور بردباری کی کہانیوں سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے جنھیں عاجزی کے ساتھ اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیا جاتا ہے۔ ولیم بلیک نے ایک نظم لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ اُسے اِس سلسلہ میں زیادہ شہرت حاصل ہو۔ اس نظم کا ذیل کا بند قابل ملاحظہ ہے:۔

آنسو ایک ذہنی اور تخیلی شے ہے
اور آہ کسی فرشتہ صفت بادشاہ کی تلوار کی مانند ہے
اور ایک شہید کے دکھ کی دردبھری چیخ
خدا تعالیٰ کی کمان کا تیر ہے

اور بقول ملٹن[1] "عاجزی کی یہی وہ ناقابل تسخیر طاقت ہے" جس نے مہاتما گاندھی سے ہمیشہ اپیل کی ہے اور یہ معلوم کرنا باعث دلچسپی ہے کہ وہ مذہب اسلام میں عملی شکل میں کہاں جلوہ گر دیکھتے ہیں اگر اس بارے میں پھر سوال کیا جائے کہ آیا یہی صفت خود

[1] MILTON

آنحضرت (صلعم) کی زندگی میں ملتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے اپنی تحریرات میں نبی کریم (صلعم) کے مشن کے ابتدائی ایام کا اکثر ذکر کیا ہے جبکہ خود اُن کے ہم ملکی آپ کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور آپ کا مضحکہ اڑاتے تھے، اور آپ نہایت خاموشی کے ساتھ ہر قسم کی ذلت برداشت کرتے تھے۔ انہوں نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کی داستان بھی بیان کی ہے جبکہ خود نبی کریم (صلعم) اور آپ کے متبعین نہایت ایثار و قربانی کی زندگی بسر کرنے پر قانع تھے اور ادنیٰ ترین انسانوں سے بھی آزادی کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین نے جو آنحضرت (صلعم) کے بعد آپ کے قائم مقام ہوئے بظاہر ہر اعتبار سے نہایت فقیرانہ زندگی بسر کی حالانکہ اُن کی افواج بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ سچی انکساری اور فروتنی کے اِن پہلوؤں میں مہاتما گاندھی نے مسلسل طریقہ سے سارے ہندوستان کے سامنے تکلیف برداشت کرنیکی طاقت کی مثال پیش کی ہے تاکہ اُس کے ذریعہ سنگین سے سنگین دل کو رام کر لیا جائے۔ اِسطرح اپنے طور پر انہوں نے پیغمبر اسلام (صلعم) کی تعلیمات کو اصولِ اہمسا یا عدم تشدد کے جس پر وہ اس قدر زور دیتے ہیں، عین مطابق پایا ہے۔

باب سوم
عیسائیت سے تعلق

جیسا کہ ماقبل ابواب سے ظاہر ہو گیا ہو گا، مہاتما گاندھی ایک کٹر قدامت پسند ہندو ہیں جو روحانی آزادی کا بہت گہرا احساس رکھتے ہیں اور ساتھ ہی خود ہندو مذہب میں اندرونی اصلاح کا زبردست جذبہ رکھتے ہیں۔ سودیشی کے بارے میں اُن کا اپنا مذہبی اصول جس کی تعریف وہ نہایت مناسب الفاظ میں تفحص کے ساتھ فرما چکے ہیں ہمیشہ انہیں اپنے آبائی مذہب[1] کو ترک کر دینے کی کارروائی اختیار کرنے سے روکتا رہا ہے۔ اس امکان سے وہ اُسوقت قریب ترین منزل پر پہنچ گئے تھے (اگرچہ یہ امکان خیالات کی دنیا سے آگے نہیں بڑھا) جب انہوں نے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ اگر انہیں یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور کیا گیا کہ چھوت چھات ہندو مذہب کا جزو لاینفک ہے تو وہ فوراً ایسے مذہب سے دست بردار ہو جائیں گے۔ لیکن عملاً انہوں نے دکھا دیا ہے کہ ہندو مذہب اپنی ابتدائی شکل میں اور عملی لحاظ سے اس قسم کے انسانیت سوز فعل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا

[1] دیکھو باب ششم

عیسائیوں اور عیسائی مذہب کے ساتھ مہاتما گاندھی کو جو تعلق رہا ہے اُس کے بارے میں مجھے خوش قسمتی سے خود اُنہی کی تقریروں اور تحریروں سے کافی مواد مل گیا ہے۔ ابتدائی ایام میں جوہنزبرگ میں اُنکے ساتھ میری گفتگو ہوئی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندو مذہب کے ظاہری رسوم سے اُن کا دل بہت کچھ ہٹ گیا تھا اور انہوں نے مختلف گرجاؤں اور کنونشنوں میں جا کر عیسائی عبادت میں خاموش حصہ لینا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ امر آسان ترین ہو گا کہ میں اُس زمانہ کے اُن کے خیالات کا صحیح مرقع ریورنیڈ جے۔ جے ڈوک[1] کے الفاظ میں پیش کر دوں جو جوہنزبرگ میں ان کے نہایت قریبی دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے اور جن کے بیان کی صداقت کی خود مہاتما گاندھی نے تصدیق کی ہے۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے:۔

ایک رات کو جبکہ مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا، ہم نے اس مسئلہ میں صبح تک گفتگو جاری رکھی اور اُس کے نتائج درج ذیل کئے جاتے ہیں:

اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ قدیم ہندو مذہب پاک و صاف مذہب تھا، بت پرستی سے مبرّا، یہ کہ ہندوستان کا روحانی مذہب مادیت کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے، اور یہی سبب ہے کہ ترقی کرنے والی اقوام کی اوّل صف میں جو جگہ اُسے حاصل تھی وہ اب اس کے ہاتھ سے جاتی رہی ہے، یہ کہ مختلف ازمنہ میں خدا نے جو ہر جگہ موجود

[1] REV J J DOKE

ہے بنی نوع انسان کی نجات کی خاطر اوتار بنکر اپنے آپ کو مختلف صورتوں اور مشکلوں میں ظاہر کیا ہے تاکہ لوگوں کو پھر صحیح راہ پر لایا جائے۔ گیتا میں کرشن کے منہ سے یہ الفاظ ادا کرائے گئے ہیں:

"جب مذہب میں تنزل آجاتا ہے اور بیدینی غالب ہو جاتی ہے اس وقت میں اپنے تئیں ظاہر کرتا ہوں۔ نیکوں کی حفاظت کے لئے برائی کا قلع قمع کرنے کے لئے مذہب کو استوار بنیاد پر قائم کرنے کے لئے میں بار بار جنم لیتا ہوں"

"لیکن کیا آپ کے مذہب میں عیسائیت کو کوئی اہم درجہ حاصل ہے" میں نے پوچھا

"وہ اس کا جزو ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک روشن الہام ہیں" انہوں نے جواب دیا

"لیکن میرے لئے وہ بے مثل الہام نہیں ہیں" میں نے جوش کے ساتھ کہا

"اس معنی میں نہیں جس معنی میں آپ لے رہے ہیں" انہوں نے صاف دلی سے کہا۔ "میں انہیں کسی اکیلے تخت پر متمکن نہیں کر سکتا اس لئے کہ میرا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ نے بار بار اوتار لیا ہے"

ان کے خیال میں مذہب ایک انتہائی عملی چیز ہے۔ تمام اعمال اسی خیال پر مبنی ہیں۔ سیاسیات، اخلاق، تجارت۔ ہر چیز جسکا تعلق ضمیر سے ہو سکتا ہے، مذہب ہے۔ وہ صرف اسی طریقہ پر غور و فکر

کر سکتے ہیں
قدرتی طور پر اُن کے خیالات میں پہاڑی کے وعظ سے گہرا ہیجان
پیدا ہو گیا ہے ترک خودی کا جو تخیل وہاں نیز بھگوت گیتا اور لائٹ
آف ایشیا[1] میں پیش کیا گیا ہے، اُس سے وہ پورے طور پر متفق ہیں
ضبطِ نفس، ترکِ خودی، ایثار و قربانی اُن کے تخیل میں روح اللہ کی زیر
ہدایت آخری مطمحِ نظر کی راہ میں مختلف منازل ہیں اور وہ آخری مطمحِ
نظر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پوری طرح آزاد کر کے ذاتِ باری
باری تعالیٰ میں جذب ہو جائے

مجھے شبہ ہے کہ آیا کوئی مذہب ایسا وسیع ہے جو اُن کے خیالات
کے اظہار کے لئے کافی ہو یا کوئی نظامِ کلیسا ایسا ہے جو انہیں اپنے
میں جذب کرنے اور اپنے حلقہ میں لینے کے لئے کافی وسیع ہو
جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس کی تشریح میں ایک واقعہ سے
کر دوں گا۔ مسٹر گاندھی نے تجویز کی کہ ہمیں تھمبی نائیڈو کی بیمار بیوی
کی مزاج پرسی کے لئے جانا چاہئے جو مقاومت مجہول قیدی کی حیثیت
سے جیلخانہ میں تھی۔ راستہ میں ایک مولوی صاحب اور ایک یہودی
دوست جو تحریک میں مددگار تھا امام مسجد کی معیت میں ہمیں مل گئے
ہم سب جس میں دو مسلمان، ایک یہودی اور ایک عیسائی بھی تھا،

[1] LIGHT OF ASIA۔ ایڈون آرنلڈ کی ایک مشہور کتاب ہے جس میں مہاتما بدھ
کی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور اُن کے مذہب کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ مترجم

اس ہندو خاتون کی مزاج پرسی کے لئے جا رہے تھے۔ زچہ بننے کی تکلیف برداشت کیئے اُسے صرف چند دن ہوئے تھے۔ جب ہم سب نے خاموشی کے ساتھ دو زانو ہو کر دعا مانگ لی تو اُس کے بعد مولوی نے اُس سے تسلی و تشفی کے چند الفاظ کہے۔ یہ واقعہ اُس خدائی محبت کے جو مذہب کے حدود اور رنگ و نسل کے قیود سے بالاتر ہے، بہت سے مظاہرات میں سے ایک مظاہرہ تھا جس کا ہم نے حال ہی میں مشاہدہ کیا۔ یہ مسٹر گاندھی کے اپنے مطمح نظر کا ایک جلوہ تھا

چونکہ زندگی کے تقدس کا انہیں بیحد خیال رہتا ہے اس لئے سبزی خوری مہاتما گاندھی کی نظر میں ایک نہایت گہرا اصول بن گیا ہے۔ یہ جذبات بچپن ہی میں اُن کی ماں کے اثر کے ماتحت لڑی جا چکی ہے۔ لیکن اُس کے بعد سے ترکِ غذائے حیوانی نے مذہبی عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور وہ لوگوں میں بھی نہایت جوش و سرگرمی کے ساتھ اس کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ جب ٹرنسوال کے جیلخانوں میں ارباب حکام نے کُٹی ہوئی باجری کو قیدیوں کے لئے حیوانی چربی میں پکانے پر اصرار کیا تو اُس وقت ان کے پیروؤں نے اُسے ہاتھ لگانے کی بجائے فاقہ کرنے کو ترجیح دی تھی

سادہ زندگی بسر کرنا بھی اُن کے مذہب کا جزو ہے۔ اُن کا ایمان ہے کہ ہر قسم کا تعیش برائی میں داخل ہے۔ اُن کی تعلیم ہے کہ ہمارے زمانہ کی بہت سی بیماریاں اور گناہ اسی وجہ سے معرضِ

ظہور میں آرہے ہیں سختی کے ساتھ نفسانی خواہشات کو دبانا اور نہیں حیطۂ ضبط میں رکھنا، نفس کو تکلیف میں ڈالنا، اپنی زندگی کی ضروریات کو تھورو[1] اور ٹالسٹائی[1] کی طرح انتہائی درجہ پر کم کر دینا اُن کے نزدیک ایجابی مسرت ہیں۔ اور اس مسرت میں اضافہ صرف اُس وقت ہوتا ہے جب وہ دوسری زندگیوں کو اُسی راہ پر لانے کی ہدایت کرتے ہیں

میں یہ سطور اُس مکان میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں جس میں وہ جوہنزبرگ کے زمانۂ قیام میں فروکش ہوا کرتے ہیں۔ وہ رہا اُن کا چولھا اور وہ رہی اُن کی لپٹی ہوئی چٹائی جس پر وہ سویا کرتے ہیں اُن کی زندگی یہاں پر اِس قدر سادہ اور غرور و تمکنت سے اتنی معرّا ہے کہ اُس سے زیادہ سادہ اور متواضع زندگی کا تصور کرنا مشکل ہے۔ ہر وہ چیز جو جسم کے لئے تعیش کا حکم رکھتی ہے یکسر ترک کر دیجاتی ہے

مسٹر گاندھی کٹر معنوں میں عیسائی نہیں ہیں۔ اس صورتِ حالات کے لئے غالباً خود کٹر عیسائیت ہی موردِ الزام ہے۔ جنوبی افریقہ میں کسی ہندوستانی کے لئے حضرت عیسیٰ کی محبت آمیز تعلیم کو قبول کر لینے کی تحریص و ترغیب مفقود ہے اس لئے کہ عیسائیت نے جس لباس میں اسے ملبوس کیا ہے اُس سے آقا کی شخصیت چھپ

[1] THOREAU اور TOLSTOY

سی گئی ہے۔ جوہنز برگ کے عیسائی کلیسا نے ان ہزارہا اشخاص کے ساتھ جو ہندوستان اور چین سے آتے ہیں اور جو برسوں سے ہمارے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کونسی دلچسپی کا اظہار کیا ہے؟ تقریباً کچھ نہیں۔ کیا انہیں یہ عقیدہ رکھنے پر مائل کیا گیا ہے کہ وہ بھی ایسی روحیں ہیں جن کے لئے حضرت عیسیٰ نے جان دی تھی؟ اس کا جواب نفی میں ہے

کہیں کہیں انفرادی کوششیں کی گئی ہیں اور چند ہندوستانی عیسائی عبادت کے مقامات میں حاضر ہوتے بھی ہیں لیکن زیادہ تر اُن سے کسی قسم کا تعلق یا لگاؤ نہیں رکھا جاتا، اور جن چند آدمیوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے کلیسا میں ابھی تک محبت کا دل موجود ہے اور مظلوم قوم کی طرف سے کچھ کہنے کی بھی جرأت کی ہے اُنہیں سبّ و شتم کا نشانہ بنا دیا گیا ہے، اور اُنہیں بھی اُن کے ساتھ تکلیف سہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ ہے وہ اختلاف جو ایک خوبصورت مذہب اور ہندوستانی پڑوسی کے ساتھ ہمارے سلوک کے مابین پایا جاتا ہے جو غور و فکر کرنے والے شخص کے دل میں منافرت پیدا کر دیتا ہے

نیز ہم مقاومت مجہول کی تحریک کی حقیقی روح کے اندازہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا دعویٰ تکلیف سہنے کی شکل میں پیش کیا ہے تاکہ عیسائی بھی عیسائی کے انداز میں اس کا مداوا کر سکیں

اِس اثنا میں اگرچہ میری رائے میں طالبِ صداقت ابھی تک اپنے مقصد کو نہیں پہنچا ہے تاہم میں وہ الفاظ فراموش نہیں کرسکتا جو خود میرے آقا مسیح (ع) نے ادا فرمائے ہیں: "ہر شخص جو مجھے آقا کہکر پکارتا ہے خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہوسکے گا لیکن وہاں صرف وہ شخص داخل ہوگا جو میرے باپ کی مرضی پر چلتا ہے جو آسمانوں میں ہے"

۔ ہمارے پاس ایک اور تحریری بیان بھی ہے جو مسٹر گاندھی کے الفاظ میں ہے اور جس میں ایک کوئیکر[1] مسمی مسٹر کوٹس[2] کے ساتھ دوستی کا ذکر درج ہے جسے اُس زمانہ کی داستان کو پورا کرنے کے لیے یہاں پر درج کیا جاتا ہے۔ اس امر کا ذکر کردینا چاہیے کہ گاندھی جی اور ٹیگور رہبر دوُسوسائٹی آف فرینڈز" کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اناجیل میں جس قسم کی عیسائی زندگی کا حال وہ خود پڑھتے ہیں وہ اس کا قریب ترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ مسٹر گاندھی لکھتے ہیں:۔

مسٹر کوٹس کو مجھ سے بہت گہری محبت تھی۔ ہم دونوں ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے اور وہ مجھے دوسرے عیسائی دوستوں کے یہاں بھی لیجایا کرتے تھے۔ جو کتابیں وہ مجھے بھیجتے تھے میں بغیر کسی تعصب اور صفائی قلب کے ساتھ اُن کو پڑھا کرتا تھا اور جو کچھ پڑھ

[1] QUAKER ۔ سوسائٹی آف فرینڈز کا ممبر [2] COATES

لیتا تھا اس پر ہم دونوں میں بحث بھی ہوا کرتی تھی۔ مجھے اُن سب کے نام یاد نہیں ہیں لیکن اُن میں سینٹ پیٹل کے ڈاکٹر پارکر[۱] کی "کمنٹری" (تفسیر) پیرسن[۲] کی "مینی اِن فیلی بل پروفلس" (بہت سے اٹل ثبوت) اور بٹلر[۳] کی "اینے لاجی" (تمثیل) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعض حصے میری سمجھ میں نہیں آئے۔ ان کی بعض باتیں مجھے بہت پسند آئیں اور بعض ایسی تھیں جو بالکل مجھے پسند نہیں آئیں۔ "مینی ان فیلی بل پروفس" میں مذہب بائیبل کی تائید میں براہین پیش کیے گئے ہیں جیسا کہ مصنف نے اُسے سمجھا ہے۔ اس کتاب کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ پارکر کی "کمنٹری" اخلاقی اعتبار سے احساس کو اُبھارنے والی ہے لیکن ایک ایسے شخص کے لیے جو مروجہ عیسائی معتقدات پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ذرا بھی مفید نہیں ثابت ہو سکتی۔ بٹلر کی "اینی لاجی" البتہ مجھے بہت ادق اور مشکلات سے مملو کتاب معلوم ہوئی جسے اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے چار پانچ مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دہریوں کو خدا کا قائل بنانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ خدا کی ہستی کے متعلق جو دلائل اس میں پیش کیے گئے ہیں وہ میرے لیے غیر ضروری تھے اس لیے کہ میں اُس وقت الحاد کی منزل سے گذر چکا تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے

۱ DR PARKER — ۲ PEARSON

۳ BUTLER

خدا کا واحد اوتار ہونے اور ان کا خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ ہونے کی تائید میں جو براہین دئے گئے ہیں اُن کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا لیکن مسٹر کوٹس ایسے نہ تھے جو آسانی سے شکست قبول کر لیتے۔ انہیں مجھ سے بیحد محبت تھی۔ انہوں نے میرے گلے میں تلسی کے دانوں کی مالا دیکھی جو وشنو مذہب کی نشانی ہے۔ وہ اُسے اوہام پرستی خیال کرتے اور اُسے دیکھ کر انہیں رنج ہوتا تھا۔ 'یہ وہم پرستی آپ کے لئے زیبا نہیں ہے۔ آیئے، میں مالا کو توڑ ڈالوں،'

'نہیں نہیں، آپ اُسے نہ توڑیں۔ یہ میری والدہ کا عطا کردہ مقدس تحفہ ہے'

'لیکن کیا آپ اس پر اعتقاد رکھتے ہیں؟'

'میں اُس کی مخفی طاقت سے واقف نہیں ہوں۔ میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ اگر میں اُسے نہ پہنوں گا تو مجھے کوئی ضرر پہنچ جائے گا۔ لیکن بغیر کافی وجہ کے اُس مالا کو اُتار نہیں سکتا جسے میری ماں نے محبت اور اِس عقیدہ کے ساتھ میرے گلے میں ڈال دیا تھا کہ اُس سے میری بہبودی میں اضافہ ہوگا۔ جب مرورِ دہور سے وہ مالا گھس گھس کے خود بخود ٹوٹ جائے گی اُس وقت نئی مالا کے حاصل کرنے کی خواہش میرے دل میں پیدا نہ ہوگی۔ لیکن اس مالا کو تو ہرگز ہرگز توڑا نہیں جا سکتا،'

مسٹر کوٹس میری دلیل کو نہیں سمجھ سکے اس لئے کہ اُن کے دل

میں میرے مذہب کا کوئی احترام موجود نہ تھا۔ وہ تو مجھے قعرِ جہالت سے نکالنے کے متوقع تھے۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتے تھے کہ خواہ دوسرے مذاہب میں بھی سچائی موجود ہو لیکن میری اُس وقت تک نجات ممکن نہیں جب تک کہ میں عیسائیت پر ایمان نہ لے آؤں جو حقیقی صداقت کی مظہر ہے اور یہ کہ میرے گناہ حضرت عیسیٰ کی شفاعت کے بغیر نہیں دُھل سکتے اور یہ کہ میرے تمام نیک کام بیکار ہیں"

اس کے بعد مسٹر گاندھی اُسی زمانہ میں پلائی متھ کے برادر[1] کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے اُن کے روبرو یہ طرزِ استدلال پیش کیا تھا کہ اس دنیا میں بے گناہ زندگی بسر کرنا ناممکنات سے ہے، اور اسی لئے حضرت مسیح (ع) نے تکلیف اٹھائی اور بنی نوع انسان کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ صرف وہی شخص جو حضرت عیسیٰ (ع) کی اس عظیم الشان قربانی پر ایمان لائے گا ابدی سکون کا حق دار ہو گا خواہ وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو، ورنہ گناہ کی اس دنیا میں زندگی بے چینی کے ساتھ اور غیر یقینی حالت میں گذرے گی

مہاتما گاندھی اپنی داستان کو ذیل کے الفاظ میں جاری رکھتے ہیں:-

اُس دلیل سے مجھے ذرا بھی تشفی نہیں ہوئی۔ میں نے عاجزی سے جواب دیا:

---

[1] BROTHER عیسائیوں کی مذہبی جماعتوں کے افراد "برادر" (بھائی) کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ مترجم

اگر اسی کا نام عیسائیت ہے جس پر سارے عیسائی عقیدہ رکھتے ہیں تو میں اُسے قبول نہیں کر سکتا۔ میں اپنے گناہوں کے نتائج سے آزادی حاصل کرنے کا متمنی نہیں، میں خود گناہ سے یا یوں کہو کہ گناہ کے تصور سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ جب تک وہ مقصد مجھے حاصل نہ ہو گا اُس وقت تک بے چینی کی حالت میں رہنا قبول ہے"

اس کا جواب پلائی متھ کے برادر نے یوں دیا: "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپکی کوششیں بیکار رہیں گی۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اُس پر پھر غور کیجئے"

اور برادر اپنے قول کی طرح سچا ثابت ہوا۔ اس نے رضاکارانہ طور پر تعلیم مسیح (ع) کی بہت سی خلاف ورزیاں کیں اور مجھ سے کہا کہ اُن میں سے کسی ایک کا تصور بھی اُن کے سکونِ قلب میں خلل انداز نہیں ہوا لیکن میں اُن دوستوں سے ملنے سے پہلے ہی سے واقف تھا کہ سب عیسائی کفارہ کے نظریہ کے قائل نہیں۔ خود مسٹر کوٹس اپنی زندگی خوفِ الٰہی کے راستہ میں گذارتے تھے۔ اُن کا دل پاک وصاف تھا اور وہ تزکیۂ نفس کے امکان پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اور بھی لوگ ایسے تھے جو اس عقیدہ میں اُن کے ہمنوا تھے۔ بعض کتابیں جو میرے ہاتھ آئیں محبت الٰہی سے مملو تھیں۔ اِس طرح اگرچہ مسٹر کوٹس میرے "تازہ ترین تجربے" سے بیحد پریشان ہوئے تاہم میں انہیں یقین دلانے اور یہ کہنے میں کامیاب ہو گیا کہ پلائی متھ کے برادر کے غلط عقیدہ کی وجہ سے میرے دل میں عیسائیت

کی طرف سے بدظنی پیدا نہیں ہو سکتی
میری مشکلات اور وضع کی تھیں اور وہ بائیبل اور اُس کے مفہوم کے متعلق تھیں"

ہم اُن کی خود نوشت سوانح عمری کے اس اقتباس کو اُس معرکۃ الآرا خطبہ سے متعلق کر دینے کے قابل ہو گئے ہیں جسے مہاتما گاندھی نے مشنریوں کے روبرو ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (کلکتہ) میں ۲۸ جولائی ۱۹۲۵ء کو دیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"آپ میں سے بہت کم اشخاص اس امر سے واقف ہیں کہ عیسائیوں کے ساتھ ــ نام نہاد عیسائیوں کے ساتھ نہیں بلکہ سچے عیسائیوں کے ساتھ ــ میرے تعلقات کی ابتدا ۱۸۸۹ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ میں لڑکا تھا اور لندن میں مقیم تھا۔ یہ تعلقات زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہو گئے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں جہاں میں نے آپ کو غیر مہمان نوازانہ ماحول میں پایا میں ہزارہا عیسائی دوست پیدا کرنے کے قابل ہو گیا۔ جنوبی افریقہ کے جنرل مشن کے ڈائرکٹر مسٹر اسپنسر واٹن[1] مرحوم سے میری ملاقات ہو گئی اور بعد میں بڑے پادری ریورینڈ اینڈریو مرے[2] اور چند اور حضرات کے ساتھ بھی میرے مراسم قائم ہو گئے

میری زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کہ میرے ایک

[2] REV ANDREW MURRAY
[1] SPENCER WATTON

بہت بڑے مخلص اور گہرے دوست جو ایک بڑے اور نیک کویکر تھے، میرے اوپر ڈورے ڈال رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ میں اتنا اچھا ہوں کہ مجھے عیسائی بن جانا چاہیئے۔ مجھے انہیں مایوس کرنے سے بیحد تکلیف ہوئی۔ جنوبی افریقہ کے میرے ایک دوست عیسائی اب تک مجھ سے خط وکتابت رکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اب آپ کیسے ہیں میں ہمیشہ اُنہیں یہ لکھ دیتا ہوں کہ میری حالت اچھی ہے۔ اگر یہ دوست مجھ سے متوقع تھے کہ میں نماز پڑھا کروں تو میں اُن سے یہ کہ سکتا ہوں کہ میں ہر روز اپنے بند کمرے میں خدا سے دعا مانگا کرتا ہوں کہ وہ مجھے سیدھا راستہ دکھائے اور مجھے عقل اور دلیری عطا فرمائے تاکہ میں اُس کے سیدھے راستہ پر گامزن رہ سکوں

چونکہ میں ان عیسائی دوستوں میں سے ایک سے وعدہ کرچکا تھا اس لئے میں نے اُسے اپنا فرض منصبی خیال کیا کہ کالی چرن بینرجی (مرحوم) سے جو ایک بہت بڑے ہندوستانی عیسائی تھے، ملاقات کروں چنانچہ میں اُن کی خدمت میں پورے کھلے دل کے ساتھ حاضر ہوا اور اس انداز سے کہ میں ہر معقول بات کے لئے تیار رہونگا اور میں نے اُن سے ملاقات بھی ایسے حالات میں کی جو نہایت متاثر کرنے والے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر بینرجی اور مجھ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اُن کی سادگی، اُن کی منکسر المزاجی، اُن کی بیباکی، اُن کی صداقت ۔ ان تمام باتوں کی میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔

اُنہوں نے ایسے وقت میں مجھ سے ملاقات کی جبکہ اُن کی بیوی بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔ آپ اس سے زیادہ اثر ڈالنے والے نظارہ کا یا اس سے زیادہ شریفانہ حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے مسٹر بینرجی سے کہا کہ میں آپکی خدمت میں متلاشیِ حق کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں"۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۶ء کا ہے ۔" میں آپکی خدمت میں ایک مقدس وعدہ کی بجاآوری کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں جو میں اپنے عزیز ترین عیسائی دوستوں سے کر چکا ہوں کہ میں سچی روشنی حاصل کرنے کے لئے کسی کوشش سے دریغ نہ کروں گا میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ میں اپنے دوستوں کو یقین دلا چکا ہوں کہ کوئی دنیاوی لالچ مجھے اس روشنی سے باز نہ رکھ سکے گا جسے میں فی الحال دیکھنے سے معذور ہوں۔ بہرحال میں آپ کے روبرو اُس بحث کا تفصیلی حال بیان کرکے جو ہم دونوں میں ہوئی تھی، آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا۔ وہ بہت اچھی اور دوستانہ گفتگو تھی۔ میں افسوس یا بددلی یا مایوسی کے ساتھ واپس نہیں ہوا بلکہ مجھے رنج تھا کہ مسٹر بینرجی بھی میری تشفی نہ کر سکے۔ یہ میری آخری اور عاجزانہ کوشش تھی جو میں نے عیسائیت کو جیسا کہ اسے میرے سامنے پیش کیا گیا سمجھنے کے لئے کی

آج میری پوزیشن یہ ہے کہ اگرچہ میں عیسائیت کی بہت سی باتوں کی قدر کرتا ہوں میں کثیر عیسائیت کی ہمنوائی کرنے سے معذور ہوں آ میں آپ سے نہایت عاجزی سے کہوں گا کہ ہندو مذہب جیسا کہ

میں اسے سمجھ سکا ہوں، پورے طور پر میری روحانی تسکین کر دیتا ہے وہ میرے تمام وجود میں حاوی و ساری ہے۔ مجھے بھگوت گیتا اور اپنشدوں میں جو اطمینان ملتا ہے وہ پہاڑی کے وعظ میں بھی نہیں ملتا۔ یہ نہیں کہ جو مطمح نظر اُس میں پیش کیا گیا ہے میں اسکی قدر نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ پہاڑی کے وعظ کی بعض قیمتی تعلیمات نے میرے دل پر گہرا اثر نہیں ڈالا ہے، لیکن مجھے آپ کے سامنے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جب کوئی شک و شبہ مجھے گھیر لیتا ہے، جب مایوسیاں مجھے ستاتی ہیں اور جب افق پر مجھے روشنی کی ایک بھی کرن نظر نہیں آتی، اسوقت میں بھگوت گیتا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور وہاں کوئی نہ کوئی آیت ایسی مل جاتی ہے جس سے میرے قلب کو تسکین ہو جاتی ہے۔ اور میں معاً بیشمار غم و رنج کی حالت میں بھی مسکرانے لگتا ہوں۔ میری زندگی بیرونی مصائب سے بھرپور رہی ہے اور اگر ان کا نمایاں اور ہٹ اثر مجھ پر نہیں ہوا تو میں اسے بھگوت گیتا کی برکت سمجھتا ہوں

میں نے آپ سے یہ سب باتیں اس لئے بیان کی ہیں تاکہ آپ پر صاف طور پر واضح ہو جائے کہ میں کہاں کھڑا ہوں تاکہ اگر آپکی مرضی ہو ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب آجائیں۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے بائبل اور تفسیروں اور عیسائی مذہب کی دوسری کتابوں کا جو دوستوں نے مجھے پڑھنے کے لئے دیں، مطالعہ کرنا بند نہیں کیا، لیکن میں نے اپنے دل سے اتنا ضرور کہا کہ اگر عقل کی وساطت

سے مجھے تشفی حاصل کرنی ہے تو مجھے دوسرے مذاہب
کی کتب مقدسہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اپنا انتخاب کر لینا چاہیئے
اور میں نے قرآن مجید کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ میں
نے حتی الامکان یہودیت کو بھی ان باتوں میں جن میں وہ عیسائیت
سے الگ ہے سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے مذہبِ زرتشت کا بھی مطالعہ
کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اور اُن میں سے ہر
ایک نامکمل ہے۔ اس لئے کہ ہماری معمولی اور محدود عقلوں نے اُسکی
تفسیر کی ہے۔ بعض اوقات معمولی دل سے اور زیادہ تر غلط طریقہ پر۔
تمام مذاہب میں مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ بعض آیات کی مختلف اور
متناقض طور پر تفسیر کیجاتی ہے اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ باتیں
میرے لئے نہیں ہیں۔ اگر میں اپنی روح کو تسکین دینا چاہتا ہوں
تو مجھے اپنا راستہ آپ تلاش کرنا چاہیئے۔ مجھے خدا تعالیٰ سے خاموشی
کے ساتھ دعا مانگنی چاہیئے اور اسی سے صراطِ مستقیم کی توفیق چاہنی
چاہیئے۔ سنسکرت میں ایک خوبصورت آیت ہے جس کا ترجمہ ہے
کہ خدا صرف اسی وقت مدد کرتا ہے جب انسان نہایت معذوری
اور عاجزی محسوس کرتا ہے۔ جس زمانہ میں میں تامل زبان کا مطالعہ
کیا کرتا تھا اُسوقت میں نے ڈاکٹر پوپ[1] کی کسی کتاب میں تامل کی ضرب
المثل پڑھی جس کا مطلب ہے کہ خدا بیکسوں کی مدد کرتا ہے۔ میں نے

---

[1] Dr Pope

اپنی زندگی کے تجارب آپ کے سامنے پیش کر دئیے ہیں تاکہ آپ اُن پر غور و فکر کریں

آپ مشنری صاحبان ہندوستان میں یہ سمجھکر تشریف لاتے ہیں کہ آپ بید ینوں کی، بت پرستوں کی، ایسے لوگوں کی سرزمین میں داخل ہو رہے ہیں جو خدا کو نہیں جانتے۔ ایک بہت بڑے عیسائی فاضل بشپ ہیبر[1] نے دو سطریں لکھی ہیں جن کے ڈنک کا اثر اب تک میرے دل پر موجود ہے: "جہاں کی ہر بات دل خوش کن ہے اور جہاں صرف انسان کا وجود ہی ناپاک و ذلیل ہے"۔ کاش وہ یہ الفاظ نہ لکھتے! ہندوستان بھر کے دوروں میں جو تجربہ مجھے حاصل ہوا ہے وہ اِس کے برعکس ہے۔ میں نے سچائی کی سخت جستجو میں بغیر کسی تعصب کے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ کیا ہے اور میں یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں کہ اِس خوبصورت ملک میں جسے گنگا برہم پترا اور جمنا جیسے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں، انسان ناپاک و ذلیل ہے۔ وہ ناپاک نہیں ہے۔ وہ میری اور آپ کی طرح سچائی کا طالب ہے اور ممکن ہے مجھ سے اور آپ سے زیادہ طالب صداقت ہو[2]

اس مقام پر مجھے ایک فرانسیسی کتاب یاد آگئی ہے جس کا ایک فرانسیسی دوست نے میرے لئے ترجمہ کر دیا تھا۔ اس میں علم کی تلاش میں ایک خیالی مہم کا بیان درج ہے۔ ایک پارٹی ہندوستان میں اتری

[1] BISHOP HEBER

[2] دیکھو ضمیمہ سوم

اور اُس نے پاریہ کے ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں سچائی اور خدا کی
مجسم شکل دیکھ لی۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اچھوتوں کے بہت سے
ایسے جھونپڑے ہیں جہاں آپ کو یقیناً خدا ملے گا۔ وہ بحث و تمحیص نہیں
کرتے لیکن وہ سختی کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ خدا موجود ہے۔
وہ مدد کے لئے صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور بالآخر اُسے پالیتے
ہیں۔ ان شریف اچھوتوں کے بارے میں ہندوستان بھر میں بہت
سی کہانیاں مشہور ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض بظاہر ناپاک
طریقہ سے رہتے ہیں لیکن اُن میں انسانیت کے شریف ترین نمونے
بھی موجود ہیں

لیکن کیا میرا تجربہ محض اچھوتوں تک محدود ہے؟ نہیں، میں یہاں
پر آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہاں غیر برہمن ہیں، برہمن ہیں جو انسانیت
کے ایسے ہی اعلیٰ نمونے ہیں جیسے آپکو دنیا کے کسی اور ملک میں مل سکتے
ہیں آج ہندوستان میں ایسے برہمن بھی پائے جاتے ہیں جو قربانی، نیکی اور
عاجزی کا مجسم نمونہ ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کا تن من دھن اچھوتوں کی خدمت کے
لئے وقف ہے لیکن کٹر لوگوں کی لعنت ان کے ساتھ ہے۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں
ہے کیونکہ اچھوتوں کی خدمت کرنے سے وہ گویا خدا تعالیٰ کی خدمت کر رہے ہیں
میں اپنے تجربہ سے ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ میں یہ واقعات نہایت
عاجزی کے ساتھ آپ کے گوش گذار کر رہا ہوں محض اس وجہ سے کہ آپ
اس ملک سے زیادہ اچھے طریقہ سے واقف ہو جائیں، یعنی وہ ملک

جس کی خدمت کے لئے آپ تشریف لائے ہیں۔ آپ یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ ہندوستانی باشندوں کی مصیبت کو ڈھونڈھ نکالیں اور اسے دور کر دیں۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ آپ یہاں کچھ حاصل کرنے کی غرض سے بھی تشریف فرما ہیں۔ اور اگر کوئی ایسی چیز ہے جو ہندوستان آپکو دے سکتا ہے تو آپکو چاہئے کہ اپنے کانوں کو اور آنکھوں کو بند نہ کر لیں بلکہ جی کڑا کر کے اس ملک کی ہر اچھی بات کو قبول کر لیں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں بہت سی ایسی چیزیں آپ کو ملیں گی

آپ اس عقیدہ سے خوش نہ ہوں کہ یوحنا کی اس مشہور و معروف آیت کا پڑھنا ہی ایک شخص کو عیسائی بنا دیتا ہے۔ اگر میں نے بائیبل کو صحیح طریقہ سے سمجھا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے بہت سے آدمیوں سے واقف ہوں جو حضرت عیسیٰؑ کے نام تک سے ناواقف ہیں۔ یہ وہ آدمی ہیں جو عیسائیت کے مروجہ مفہوم کو مسترد کر چکے ہیں، لیکن باوجود اس کے اگر حضرت عیسیٰؑ آج بہ نفس نفیس انسانی جامہ میں تشریف لے آئیں تو وہ ہم میں سے بہت سوں کے مقابلہ میں اُن کو اپنا پیرو تسلیم کر لیں گے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے اُس پر آپ کھلے دل سے اور عاجزی کے ساتھ غور کریں

میرے دل میں بسا اوقات یہ بات آئی ہے کہ متلاشیِ حق کو خاموش

رہنا چاہئے۔ میں خاموشی کی حیرت انگیز طاقت سے واقف ہوں میں نے جنوبی افریقہ میں ٹریپسٹ لوگوں کی ایک خانقاہ کا معائنہ کیا ہے۔ وہ ایک خوبصورت جگہ تھی۔ اُس جگہ کے بہت سے باشندے خاموشی کا عہد لئے ہوئے تھے۔ میں نے فادر[1] سے جب اسکی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ اسکی وجہ بالکل بدیہی ہے۔ ہم کمزور انسان ہیں۔ ہم اکثر اوقات نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اگر ہم اُس کمزور ہلکی آواز کو سننا چاہتے ہیں جو ہمیشہ ہمارے اندر بولتی رہتی ہے تو ہم اُسے سُن نہ سکیں گے اگر ہم مسلسل بولتے رہیں گے۔ میں اُس قیمتی سبق کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ میں خاموشی کے راز سے واقف ہوں

میں نے اپنے مشنری دوستوں سے کہا: آپ کی شرافت میں کچھ شبہ نہیں لیکن آپ جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُن سے آپ نے اپنے تئیں الگ کر رکھا ہے۔ میں آپ کے روبرو اُس گفتگو کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو میں نے دارجیلنگ میں مشنری لنگوایج اسکول میں کی تھی۔ لارڈ سالسبری کی خدمت میں مشنریوں کا ایک وفد چین کے سلسلہ میں حاضر ہوا اور یہ وفد حفاظت کا خواستگار تھا۔ میں اصل الفاظ کا اعادہ نہیں کر سکتا لیکن جو جواب لارڈ سالسبری نے دیا تھا اُس کا خلاصہ سنائے دیتا ہوں۔ انھوں نے کہا تھا: حضرات! اگر آپ عیسائیت کا پیغام پہنچانے کے لئے چین جانا چاہتے ہیں

[1] FATHER۔ کیتھولک مذہب میں مذہبی جماعتوں کے افراد کا لقب۔ مترجم

تو آپ کسی دنیاوی طاقت کی اعانت طلب نہ کریں۔ اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھکر جائیے اور اگر چین کے لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا تصور رکھیئے کہ آپ خدا کی خدمت کرتے ہوئے قتل ہو رہے ہیں"۔ لارڈ سالسبری کی رائے صحیح تھی۔ عیسائی مشنری ہندوستان میں ایک ہندوستانی طاقت کے سایہ میں، یا اگر آپ پسند کریں، اسکی حفاظت میں آتے ہیں اور یہی چیز ناقابل گذر رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے

آپ مجھے اعداد بتائیں کہ اتنے یتیموں کو آپنے عیسائی مذہب کی آغوش میں داخل کر لیا ہے تو میں اُسے تسلیم کر لوں گا۔ لیکن مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوتا کہ آپ کا مشن اتنا ہی ہے۔ میری رائے میں آپ کا مشن اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ ہندوستان میں سچے مرد اور سچی عورتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو آپکو حقیر و ذلیل جھونپڑوں میں جانا پڑیگا ــــ اس لئے نہیں کہ آپ انہیں کچھ دینگے بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو ان سے کچھ حاصل کرنا پڑے۔ بہ حیثیت ایک دوست کے جیسا کہ میں ہندوستان کے مشنریوں اور یورپینوں کا ہوں، میں آپ سے وہی باتیں کہتا ہوں جو میرے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہیں۔ میں آپ میں قبولیت کا مادہ، عاجزی، آمادگی نہیں پاتا تاکہ آپ ہندوستان کے عام باشندوں کے ساتھ وابستگی پیدا کر سکیں۔ میں نے اپنے دل کی باتیں براہ راست آپ کے روبرو رکھدی ہیں۔ کیا مجھے آپ کے پاس سے کوئی جواب ملیگا؟

اِس باب کو ترتیب دیتے وقت میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کر سکتا کہ عیسائیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن میں اُس خوبصورت بیان کا بھی اضافہ کردوں جو انہوں نے ریورینڈ جے، ڈی، ڈوک کے متعلق لکھا ہے جو نہ صرف ان کے ذاتی دوست تھے بلکہ جنوبی افریقہ کی طول طویل ستیا گرہ میں ان کے مددگار بھی تھے۔ مہاتما گاندھی نے ہمیشہ ان کے متعلق یہی رائے رکھی کہ وہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ ایک سچے عیسائی کو ہونا چاہیئے۔ وہ داستان جسکا اختتام مسٹر ڈوک کے بیان پر ہوتا ہے چند الفاظ میں بیان کیجا سکتی ہے۔ مسٹر گاندھی پر اُن کے بعض ہم ملکیوں نے جو پٹھان کہلاتے ہیں، ایک شدید غلطی کی وجہ سے حملہ کر دیا تھا جن کا غلطی سے یہ خیال تھا کہ وہ ان کو راہ سے بے راہ کر رہے ہیں۔ مسٹر ڈوک نے انہیں جوہنزبرگ کے بازار میں زخمی پڑا دیکھا تھا اور ایک اچھے فیاض شخص کی حیثیت سے نہایت نازک موقع پر اُن کی دستگیری کر کے انہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ مسٹر گاندھی کا بیان اس موقع پر شروع ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے:۔

"مسٹر ڈوک اور اُن کی اچھی بیوی متفکر تھے کہ مجھے پورا آرام اور سکون ملنا چاہیئے اور اس لئے حملہ کے بعد میری دماغی محنت کو دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوا۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کا بُرا اثر میری صحت پر نہ پڑے اس لئے انہوں نے اِشارے کر کے اور اسی قسم کی ترکیبوں کے ذریعہ تمام اشخاص کو میرے پلنگ کے قریب سے ہٹوا دیا اور مجھے ہدایت کی

کہ میں نہ تو کچھ لکھوں اور نہ کوئی اور کام ہی کروں۔ میں نے بذریعہ تحریر درخواست کی کہ اس سے قبل کہ میں خاموشی کے ساتھ لیٹوں اُن کی صاحبزادی جس کا نام آلیو تھا اور جو اُسوقت چھوٹی سی لڑکی تھی، مجھے میرا محبوب انگریزی بھجن "لیڈ" کانڈلی لائٹ[۱] گا کر سنائے تاکہ میں سکون حاصل کر سکوں۔

مسٹر ڈوک نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور ایک شیریں مسکراہٹ کے ساتھ میری درخواست کو منظور کر لیا۔ انہوں نے آلیو کو اشارہ سے بلایا اور کہا کہ دروازہ پر کھڑی ہو جا اور دھیمے سروں میں وہ گیت گا کر سنا دے۔ یہ سطور لکھتے وقت تمام نظارہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور چھوٹی لڑکی آلیو کی ترنم ریز آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ میں اُس خدمت کا حال کس طرح سے بیان کر سکتا ہوں جو ڈوک کے خاندان نے میری کی

مسٹر جوزلیف[۲] ڈوک بپٹسٹ پادری تھے اور اسوقت اُن کی عمر چھیالیس برس کی تھی اور جنوبی افریقہ میں آنے سے پہلے وہ نیوزیلینڈ میں رہ چکے تھے۔ اس حملہ سے کوئی چند مہینے قبل وہ میرے دفتر میں آئے تھے اور اپنا کارڈ اندر بھیجا تھا۔ ان کے نام سے پہلے لفظ "ریورینڈ" دیکھ کر میں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ وہ دوسرے عیسائیوں کی طرح مجھے عیسائی بنانے کے لئے آرہے ہیں یا شاید تحریک کے ساتھ مربیانہ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر ڈوک داخل

OLIVE [۱] ۵۱ [۱] اے مہربان روشنی میری رہنمائی کر ۵۳ JOSEPH DOKE [۲]

ہوئے اور ہم چند منٹ تک گفتگو کرنے پائے تھے کہ میں نے محسوس کرلیا کہ میں نے اُنکی نسبت کس قدر شدید غلطی کی تھی اور اپنے ذہن میں ان سے معافی مانگ لی۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ تحریک کے ان تمام امور سے واقف ہیں جو ہم اخبارات میں شائع کر چکے ہیں۔ انہوں نے کہا: مہربانی کر کے مجھے اس تحریک میں اپنا دوست خیال کیجئے۔ میں اسے اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں کہ میں حتی المقدور آپ کی امداد کروں اگر میں نے حضرت عیسیٰ کی زندگی سے کوئی سبق سیکھا ہے تو وہ یہی ہے کہ ایک شخص کو چاہیئے کہ وہ اُن لوگوں کے بوجھ میں جو بوجھ سے دبے ہوئے ہوں، شرکت کرے اور اُسے ہلکا کردے۔" اسطرح سے ہم ایک دوسرے سے واقف ہوگئے اور روز ہماری باہمی محبت اور دوستی میں اضافہ ہی ہوتا گیا

زخمی ہونے کے بعد جب تک میں اُن کے گھر میں بستر پر پڑا رہا گھر کا کوئی نہ کوئی آدمی دن رات میری خدمت میں لگا رہتا۔ جب تک میں وہاں مقیم رہا وہ مکان کارواں سرائے بنا ہوا تھا۔ ہندوستانیوں کے تمام طبقوں کے لوگ میری مزاج پرسی کے لئے اور مجھ سے ملنے کے لئے وہاں آتے، معمولی پھیری والے سے جس کے ہاتھ میں ٹوکرا ہوتا تھا اور جس کے کپڑے میلے کچیلے اور گندے ہوتے تھے، لیکر ٹرانسوال کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے چیرمین تک۔ مسٹر ڈوک ایکساں اخلاق اور تواضع کے ساتھ سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے اور جب تک میں اُنکے

ساتھ قیام پذیر رہا، اُن کا سارا وقت یا تو میری تیمارداری میں صرف ہوتا یا ہزارہا آدمیوں کے استقبال کرنے میں جو میری ملاقات کے لئے آتے تھے، حتی کہ رات کو بھی مسٹر ڈوک میرے کمرہ میں دو تین مرتبہ جھانک لیا کرتے۔ اُن کی مہمان نوازی چھت کے نیچے رہنے کے دوران میں میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ میرا گھر نہیں ہے یا یہ کہ میرے عزیز ترین اور قریب ترین رشتہ دار یا دوست ڈوک کے خاندان کے افراد سے زیادہ میری خبر گیری کر سکتے تھے

اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ مسٹر ڈوک پر ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کی جد وجہد میں اظہارِ ہمدردی کرنے کی وجہ سے اور مجھے اپنے مکان میں رکھنے کی وجہ سے کوئی مصیبت پیش نہیں آئی۔ مسٹر ڈوک ایک بپٹسٹ چرچ کے انچارج تھے اور اپنی روزی کے لئے یورپینوں کے اجتماع پر انحصار رکھتے تھے جن میں سب کے سب لبرل خیالات کے آدمی نہ تھے اور جنہیں ہندوستانیوں کی نفرت غالبًا اتنی ہی عام ہوگی جتنی دوسرے یورپینوں میں پائی جاتی تھی لیکن مسٹر ڈوک پر اسکا مطلق اثر نہیں ہوا۔ میں نے اس نازک موضوع پر اپنی ملاقات کی ابتدا ہی میں بحث کرلی تھی اور ان کا جواب یہ تھا: "میرے پیارے دوست! آپ حضرت عیسیٰ کے مذہب کے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ میں اُنکا ایک عاجز پیرو ہوں جنھوں نے خوشی خوشی سولی پر چڑھ کر اُس ایمان کی خاطر جان دیدی جو اُن کے دل میں تھا اور جن کی محبت کائنات کی طرح

ساری دنیا پر محیط تھی۔ مجھے آپ کی تحریک میں حصہ لینا چاہیئے بشرطیکہ میں یورپینوں کے سامنے یورپینوں کی نمائندگی کرنے کا خواہشمند ہوں جو جیسا کہ آپ کو اندیشہ ہے، مجھے سزا دلوا دینگے۔ بلاشبہ میری روزی اُن سے وابستہ ہے لیکن آپ یہ یقیناً نہ خیال کریں کہ میں روزی کی خاطر اُن سے وابستہ ہوں یا یہ کہ وہ میرے رازق ہیں۔ میرا رازق میرا خدا ہے، وہ تو خدا تعالیٰ کی مرضی کا محض وسیلہ ہیں۔ اُن کے ساتھ میرے تعلق کی ایک غیر تحریری شرط ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی میری آزادی میں مخل نہ ہو گا۔ اس لئے براہ کرم میرا فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں اِس تحریک میں آپ کے دوش بدوش لڑنے سے ہندوستانیوں کو مرہونِ منت نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اسے اپنا غرض منصبی تصور کرتا ہوں۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنے ڈیکن[1] سے اس مسئلہ پر بحث کر لی ہے۔ میں نے نہایت نرمی سے انہیں اطلاع دیدی ہے کہ اگر وہ ہندوستانیوں کے ساتھ میرے تعلقات کو پسند نہیں کرتے، تو اُس صورت میں وہ مجھے اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کی اجازت دیں اور کسی اور پادری کو میری بجائے مقرر کر لیں۔ لیکن انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اس کے بارے میں کسی قسم کا فکر نہ کرو۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے میری ہمت افزائی کے لئے چند کلمات بھی ارشاد فرمائے۔ ساتھ ہی آپ کو تصور نہ کرنا چاہیئے کہ تمام یوروپین باشندے آپکے خلاف ایک طرح کی نفرت رکھتے ہیں۔ آپ کو بہت سے اشخاص

[1] DEACON ۔ گرجا کا بڑی مذہبی عہدیدار۔ مترجم

کی خاموش ہمدردی کا علم نہیں جو وہ آپ کے مصائب کے ساتھ رکھتے ہیں اور آپ میرے ساتھ اتفاق کرینگے کہ جو پوزیشن میری ہے اس کی وجہ سے میں یہ سب باتیں جاننے کے قابل ہوا ہوں

اس واضح تشریح کے بعد میں نے پھر کبھی اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا اور بعد میں جب مسٹر ڈوک روڈ ہیشیا میں اپنے مقدس پیشہ کے فرائض ادا کرتے ہوئے انتقال کر گئے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تحریک ستیاگرہ ابھی جاری تھی، اسوقت بیپٹسٹوں نے اپنے گرجا میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں انہوں نے مسٹر کاچلیا اور دوسرے ہندوستانیوں کو بھی جن میں میں بھی شامل تھا۔ دعوت دی اور مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا

تقریبًا دس دن بعد مجھ میں اچھی طرح سے چلنے پھرنے کی طاقت پیدا ہو گئی اور اسوقت میں نے اس خدا ترس خاندان سے رخصت چاہی یہ جدائی مجھے بہت شاق گذری اور یہی حال مسٹر ڈوک کے سب گھر والوں کا تھا"

اِن اقتباسات میں جو مہاتما گاندھی کی تحریرات پر مشتمل ہیں۔ یہ معلوم کر لینا مشکل نہ ہو گا کہ اُن کے دل پر عیسائیت کے پیغام کی اندرونی صداقت کا جہاں تک اس کا تعلق اخلاقی پہلو سے ہے اسقدر گہرا اثر پڑا ہے۔ انہوں نے نہایت قریب سے اس کا بھی مشاہدہ کر لیا کہ وہ لوگ خود اس پیغام پر یقین رکھتے تھے اور اسکی زندگی بخش قوت کو محسوس کرتے تھے، اس پر اپنی زندگیوں میں کس طرح عمل پیرا ہے۔

جب میں مہاتما گاندھی کے ساتھ جنوری ۱۹۱۴ء میں گاندھی سمٹس ایگریمنٹ پر دستخط ہوجانے کے بعد جوہنزبرگ گیا اسوقت میں نے بطور خود تجربہ کر لیا کہ وہ منظر اُن کی زندگی پر کس قدر گہرے طریقہ سے اثر انداز ہوا ہے۔ وہاں ہزاروں باتیں کرنی تھیں جو مہینوں سے التوا میں پڑی ہوئی تھیں، لیکن ہمارے پہنچنے کے بعد اولیں موقع پر جو بات اُنہوں نے مجھ سے کہی وہ یہ تھی: "چارلی، میں آپ کو جاترا کے لئے جارہا ہوں"۔

ان کی بات کو نہ سمجھتے ہوئے میں نے پوچھا کہ "اُس کا مطلب کیا ہے؟ آپ جاترا کے لئے کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"میں آپ کے ساتھ مسز ڈوک کے یہاں جانا چاہتا ہوں جنہوں نے یہاں پر میرے زخمی ہوجانے پر ماں کی طرح میری تیمارداری کرکے مجھے تندرست بنا دیا تھا"۔ اُنہوں نے جواب دیا

ہم دونوں مسز ڈوک کے مکان پر پیدل چلکر گئے اور راستہ کے ہر ہر قدم پر وہ مجھے وہی دردانگیز واقعہ سناتے رہے جو اوپر گذرچکا ہے۔ جب وہ مکان پر پہونچے اور اُنہوں نے مسز ڈوک کو اُن کے لباس بیوگی میں دیکھا ایسی حالت میں جبکہ ان کا چہرہ پژمردہ ہوچکا تھا اور مصیبت کی وجہ سے اسپر جھرّیاں پڑچکی تھیں، تو ان کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا۔ جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق تھا اُنھوں نے اپنی ماں کی شفقت کے ساتھ اُن سے برتاؤ کیا اور اُن کی صحت اور مسز گاندھی کی صحت کے بارے میں استفسارات کرنے میں

اُنہوں نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی مصیبت کو بھی بھلا دیا۔ وہ موخرالذکر کی نسبت سوالات پر سوالات کرتی گئیں جو اُس وقت بہت سخت بیمار تھیں پھر آخرکار تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے خاوند کی موت کا حال سنایا جو اندرون افریقہ میں بمقام روڈھیشیا ایک قسم کے موذی بخار کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ وہ وہاں اُس زمانہ میں گئے تھے جبکہ اُن کی عمر ادھیڑ سے زیادہ ہو چکی تھی تاکہ اُن لوگوں کے پاس جنہوں نے انجیل کا کبھی نام بھی نہیں سنا، حضرت عیسیٰ کی ناقابل تلاش دولت لیجائیں یہ بیان نہایت درد انگیز تھا کہ اس مرنے والے بزرگ کو ہاسپٹل میں کس طرح سے لے گئے جہاں انہیں بہترین طبی امداد دی گئی تھی اور یہ کہ ان کی جان کس طرح سے نکلی۔ مسز ڈوک فوراً روانہ ہو گئی تھیں تاکہ وہ ان کی معیت میں رہیں اور ان کی تیمارداری کریں۔ جس سادگی سے انہوں نے سارا واقعہ سنایا اُس سے رنج و غم میں اور اضافہ ہو گیا۔ مسٹر گاندھی جو خود بہت سے آدمیوں سے زیادہ تکلیف اُٹھا چکے تھے اس داستان غم سے بحد متاثر ہوئے اور اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے

اُس دن کے بعد سے ہی جوہنزبرگ میں اُن کے ساتھ نہایت قریب ترین رفاقت کی زندگی بسر کی اور جب کبھی انہوں نے مسٹر اور مسز ڈوک اور ان کے بچوں کا تذکرہ کیا ہے، اُس سچے عیسائی خاندان کے بارے میں اُن کا احترام کافی طور سے ہر لفظ سے جو انہوں نے منہ

سے نکالا ہے ظاہر ہوتا رہا ہے۔

ایک اور واقعہ بھی یہاں پر بیان کرنے کے قابل ہے۔ دہلی میں اکیس دن کا اُپاس ختم ہونے کے قریب جس کا مفصل بیان کسی دوسرے باب میں درج ہے، میں سینٹ جیمز چرچ سے ہولی کومیونین کی نماز سے واپس لوٹا تھا اور ابھی تک میرے دل میں ایک گیت کی یاد باقی تھی جسے گرجا میں تھوڑی دیر پہلے ہم سب نے مل کر گایا تھا۔ اس لئے میں نے اُسے اُنہیں گا کر سنایا:-

میں کسی قابل نہیں ہوں، میری روح کا گھر خشک اور عریاں ہے
اس لئے تو وہاں آنے پر کیسے مائل ہو سکتا ہے؟
اے میرے آقا! بول اور مجھے چنگا کر دے!

جب میں اُن کے سامنے اُس حصۂ انجیل کی تشریح کر رہا تھا جس سے یہ گیت لیا گیا ہے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: چارلی آپ کو مجھ سے ساری داستان بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں اس لئے کہ میں اس سے بخوبی واقف ہوں، اور اسے متعدد بار سن چکا ہوں۔ شاید آپکو یہ بات ابھی تک پوری طرح معلوم نہیں ہوئی کہ میں جوہنسبرگ میں اتوار کی نماز میں شامل ہوا کرتا تھا اور مجھے اُس زمانہ میں اُنمیں شرکت کرنے سے کس قدر خوشی محسوس ہوتی تھی۔ دنیا میں میرے بعض مخلص ترین دوست وہی عیسائی تھے جن سے میری وہاں دوستی ہو گئی تھی۔ یہ گیت اُن گیتوں میں سے ایک ہے جسے میں نے وہاں متعدد بار

اس کا سننا بھلا معلوم ہوتا ہے
سنا تھا اور اب اس موقع پر بھی مجھے اس کا سننا بھلا معلوم ہوتا ہے
اس کی وجہ سے مجھے ان گذرے ہوئے ایام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو جنوبی
افریقہ میں بسر ہوئے تھے"
جب کبھی میں سابرمتی آشرم میں موجود رہا ہوں ان کی ہمیشہ ہی عادت
رہی ہے کہ وہ پرارتھنا کے آخر میں مجھ سے کوئی نہ کوئی عیسائی گیت گانے
کی فرمائش کرتے ہیں۔ دو گیت جو ہمیشہ سے انہیں پسند خاطر رہے ہیں، یہ ہیں:۔
اے مہربان روشنی، اندھیرے گھپ میں (میری) رہنمائی کر
(یہ گیت وہ ہے جسے وہ سب سے پہلے سننا پسند کرتے ہیں۔
جب میں عجیب و غریب صلیب کو دیکھتا ہوں
(یہ گیت جنہیں میں نے گا کر سنایا ہے اور انہوں نے ہمیشہ پسند کیا ہے
حسب ذیل ہیں:۔
میرا خدا تجھ سے نزدیک تر ہے، تجھ سے نزدیک تر ہے
خواہ وہ صلیب ہی ہو جو میرا مرتبہ بلند کرتی ہے
اور شام کا گیت۔
ہمیشہ میرے ساتھ رہ۔ شام کا وقت جلدی جلدی آرہا ہے
تاریکی گہری ہوتی جارہی ہے، اے آقا، میرے ساتھ رہ!
اور ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جس گیت کی ابتدا الفاظ
زمانہائے دراز کی چٹان میرے لئے پھٹ گئی
سے ہوتی ہے، تاریکی اور مایوسی کے لمحات میں وہ بہت تسکین بخش

ثابت ہوا ہے[1]

---

[1] اس موضوع پر مہاتما گاندھی کی تحریرات کے مزید اقتباسات کیلئے دیکھو ضمیمہ جات چہارم و نہم

باب چہارم

حضرت عیسیٰ کا مرتبہ

جو عنوان میں نے اس باب کے لئے مقرر کیا ہے وہ دراصل ایک مضمون کی سرخی ہے جو اس میں شامل کر لیا گیا ہے اور جسے مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ”ینگ انڈیا“ کے لئے تحریر کیا تھا۔ یہ اس پوزیشن پر مزید روشنی ڈالے گا جو آج منظم عیسائیت کو ہندوستان میں حاصل ہے اور یہ بتائے گا کہ مسٹر گاندھی کا رویہ اس کے متعلق کیا ہے،

ہندوستان میں برطانوی نظام سلطنت کے طاقتور اور ہمہ گیر ماحول سے مسیحی تبلیغی سرگرمیوں کا اتحاد اس طرح سے کہ بہت سے مشنری مقامات میں برطانوی دیوانی حکومت اور مشن کے کام میں بظاہر بہت ہی معمولی قسم کا تبائن پایا جاتا ہے، ایک ایسا عمل ہے جس نے کثیر ہندوؤں اور مسلمانوں میں عیسائی مذہب کے حقیقی مفہوم کے بارے میں تکلیف دہ اور تقریباً عام ابتری پھیلا دی ہے۔ یہ ابتری گزشتہ پچاس سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے شدت کے ساتھ نمایاں رہی ہے[1] اور ہر سنجیدہ مشنری نے جو ہندوستان میں کام کرنے کی نیت سے آیا ہے، خلوص دل سے اسے ناپسند کیا ہے۔ حال ہی میں اس صورت حال میں کمی ہونی شروع ہو گئی ہے

اس دردافزا صورت حال کو جس میں سنجیدہ، سرگرم اور سچے مرد اور عورتیں ایک غلط پوزیشن میں پڑنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں، ایڈورڈ ٹامسن[۱] نے جو آکسفورڈ میں بنگالی زبان کے لکچرر ہیں، ڈرامہ کے ذریعہ دکھایا ہے۔ کھیل کا نام کفارہ ہے۔ ڈرامے میں نازک ترین موقع اس وقت آتا ہے جب گریگری[۲] (جو مشنری کالج کا پرنسپل ہے) اپنی رائفل سنبھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسٹیشن کے باقیماندہ انگریزوں کے ساتھ (جو سب کے سب سرکاری آدمی ہوتے ہیں) شامل ہو جاتا ہے اس غرض سے کہ گاؤں میں جو یکایک سیاسی فساد برپا ہو گیا ہے، اسے فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دیا جائے۔ حقیقی حالت جیسے یہاں ڈرامے میں دکھایا گیا ہے، ممکن ہے کہ غیر معمولی خیال کر لی جائے لیکن وہ ہندوستان میں مسیحی انجیل کے مشنری کے لئے ایسی صورت حالات کا نقشہ کھینچتا ہے جو مایوسی کی حد تک ناممکن بنادی گئی ہے

کوئی شخص جو یورپ و امریکہ میں رہ چکا ہو اور اس دنیوی خلجان کا اسے کلیتًا تجربہ نہ ہو، یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں اور ہندوستانی عیسائی جماعت جو ہندوستان اور سیلون میں وسیع رقبوں پر پھیلی ہوئی ہے، اس کے نتیجہ کے طور پر کس حد تک بدیشی بن گئی ہے دنیا بھر میں مہاتما گاندھی سے بڑھکر کوئی مہربان یا شریف نقّاد نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس موضوع پر جو بہت سی باتیں انہوں نے تحریر کی ہیں، اس کے محتاط رویہ سے ان لوگوں پر جو مغربی ممالک میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں اس

---

[۱] EDWARD THOMSON

[۲] GREGORY

امر کی مزید وضاحت ہو جائے گی کہ وہ ہندوستانی جو پکے اور نرے قوم
پرست ہیں، کس قدر رنج محسوس کرتے ہوں گے جب وہ ہندوستانی
عیسائی جماعت کا غیر ملکی طاقت کے ساتھ یہ اتحاد اور یکرنگی دیکھتے ہیں۔ ہر
ایک شخص مسٹر گاندھی کی سی وسیع فیاضی نہیں رکھتا
یہ بالکل درست ہے کہ کٹر ہندو ہی ایک بڑی حد تک مورد الزام ہیں کہ
انہوں نے کالی چرن بنیرجی، پیارے موہن رودرا، نیل کنٹھ گورے جیسے
شریف آدمیوں کو جو اپنے دور کے سب سے بڑے ہندوستانی محب وطن
تھے اور نہایت ایماندار صادق القول اور مخلص اشخاص تھے، برادری
سے خارج کر دیا، یہ لوگ صرف روحانی اعتقاد کی وجہ سے عیسائی ہوئے
تھے اور چاہیئے تھا کہ ان کے سچے معتقدات کا خلوص کے ساتھ احترام کیا جاتا
ان کا تقریباً مکمل سوشل بائیکاٹ جو ہر جگہ کیا گیا، یقیناً غلط اقدام تھا، اس
لئے ہندوؤں کے کٹر پن کو بھی اس واجب الرحم نتیجہ کے کچھ حصہ کی ذمہ داری
قبول کرنی چاہیئے

لیکن ہندوستان میں ہندوستانی عیسائی آج سیاسی زندگی میں
اپنی جائز جگہ حاصل کر سکتے تھے بشرطیکہ وہ صرف اس صحیح مشورہ کو قبول کر
لیتے جسے مہاتما گاندھی نے اتنی مرتبہ دیا ہے۔ ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہتا
ہوں کہ اب حالات میں بسرعتِ تمام انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ایس
کے، دت۔ کے، ٹی، پال اور دوسرے اصحاب نے آگے کا راستہ سمجھا دیا ہے
ذیل کے اقتباسات مجھے اس سلسلہ میں بہت ہی گہرے طور پر وابستگی

اور دلچسپی کا پہلو لئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور وہ متقاضی ہیں کہ ان کا غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ وہ کاٹھیاواڑ میں خود اپنے بچپن کے متعلق یہ باتیں لکھ رہے ہیں جبکہ تقریباً ناقابل یقین صورت حالات موجود تھی جو عرصہ ہوا اب بالکلیہ جاتی رہی ہے:۔

"صرف عیسائیت سے بہ حیثیت مذہب کے میرے والد سب سے کم رواداری برتتے تھے اگرچہ وہ سب مذہبوں سے رواداری کا برتاؤ برتتے تھے۔ خود مجھے بھی ایک گونہ اس سے نفرت تھی۔ اس کی معقول وجہ تھی۔ اس زمانہ میں عیسائی مشنری ہائی اسکول کے قریب نکڑ پر کھڑے ہوکر وعظ کہا کرتے تھے اور ہندوؤں اور ان کے دیوتاؤں کو دل کھول کر گالیاں دیا کرتے تھے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ ایک مرتبہ ان کی تقریر سنی ہوگی لیکن مجھے اس تجربہ کو دہرانے سے باز رکھنے کے لئے یہ ذراسی بات بھی کافی تھی۔ اسی زمانہ میں میں نے ایک مشہور ہندو کے عیسائی ہو جانے کی خبر سنی۔ سارے شہر میں اس بات کا چرچا تھا کہ بپتسمہ کے وقت اسے گائے کا گوشت کھانا پڑا اور شراب بھی پینی پڑی، اسے اپنا لباس بھی تبدیل کرنا پڑا اور اس کے بعد سے وہ یورپین لباس زیب تن کرتا ہے اور ہیٹ لگاتا ہے۔ ان باتوں کا میرے دل پر برا اثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ جو مذہب گائے کا گوشت کھانے، شراب پینے اور اپنا لباس تبدیل کرنے پر مجبور کرتا ہے وہ مذہب کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ ایک شخص نے جو نیا نیا عیسائی ہوا تھا اپنے باپ، دادا کے مذہب رسم و رواج اور ملک کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا

ہے۔ ان تمام باتوں نے میرے دل میں عیسائیت کی طرف سے نفرت پیدا کر دی"
مسٹر اسکاٹ[1] نے جو ان ابتدائی ایام میں راجکوٹ واقع کاٹھیاواڑ میں مشنری تھے، مہاتما گاندھی کو ایک بہت ہی محبت آمیز خط لکھا تھا اور بتایا تھا کہ عیسائی ہونے کے وقت گائے کا گوشت کھانے اور شراب پینے کی کہانیاں محض بازاری گپ کا درجہ رکھتی ہیں اور انہیں دیدہ و دانستہ اختراع کیا گیا ہے۔ اس کا جو جواب مسٹر گاندھی نے دیا وہ حسب ذیل ہے:-

"اگرچہ وعظ چالیس سال پیشتر ہوا تھا تاہم اس کی دل خراش یاد ابھی تک میرے دل میں باقی ہے۔ اس کے بعد سے جو کچھ میں نے سنا اور پڑھا ہے، اس نے میرے اولین تجربہ کی تصدیق کر دی ہے۔ میں نے کئی ایک پادریوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف تاریک پہلو دیکھنے کے عادی ہیں جسے وہ اور زیادہ تاریک بنا کر دکھا دیتے ہیں۔ بشپ ہیبر کی کتاب "فرام گرین لینڈز آئی سی ماؤنٹنز" (گرین لینڈ کے برفانی پہاڑوں سے[2]) کے مشہور گیت کا دوسرا شعر ہندوستانیوں کے خلاف ایک لائیبل (حملہ) ہے۔ مجھے یرودڈا کے قید خانہ میں بھی چند اخلاص شعار دوستوں نے کچھ لٹریچر بھیجا تھا جو معلوم ہوتا تھا کہ محض ہندو مذہب کی تحقیر کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ بپتسمہ کے وقت گائے کا گوشت کھانے اور شراب پینے کے بارے میں میں نے صرف وہ باتیں بیان کی ہیں جو میں نے سنی تھیں اور یہی بات میں نے خود نوشت سوانح حیات میں لکھی ہے۔ جہاں میں مسٹر اسکاٹ کی تردید کو صحیح سمجھ لیتا ہوں، وہاں

---

[1] Scott [2] From Greenlands Icy Mountains

میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگرچہ میں ہزار ہا ہندوستانی عیسائیوں سے آزادانہ ملا جلا ہوں تاہم بہت کم اشخاص ایسے ہیں جنھیں گائے کا گوشت یا کوئی دوسرا گوشت کھانے اور نشہ آور شراب پینے کے بارے میں کچھ شبہات ہوں جب کبھی میں نے ان سے باآہستگی تمام بحث کی ہے انہوں نے مجھے ہمیشہ مشہور و معروف آیت پڑھکر سنا دی ہے کہ "تو کسی چیز کو ناپاک مت کہہ"، گویا کہ آیت محض کھانے پینے سے متعلق ہے اور یہ کہ وہ ہر قسم کی آزادی عطا کر دیتی ہے۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ بہت سے ہندو گوشت کھاتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا مذہب نہیں بدلا ہے۔ مذہب بدلنے والے اشخاص وہ ہوتے ہیں جو نئے سرے سے پیدا ہوں، یا جنھیں نئے سرے سے پیدا ہونا چاہیئے۔ جو لوگ اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتے ہیں ان سے زیادہ اعلیٰ معیارِ زندگی اور اخلاق کی توقع کی جاتی ہے بشرطیکہ تبدیلی مذہب دل سے تعلق رکھتی ہو اور کسی غرض پر مبنی نہ ہو۔ لیکن مجھے ان گہرائیوں میں نہ جانا چاہیئے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ جہاں مجھے عیسائیوں یا عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں تکلیف دہ تجربے ہوئے ہیں، وہاں مجھے خوشگوار تجربے بھی ہوئے ہیں جن کی یاد مجھے بہت عزیز ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان میں رواداری کی اسپرٹ ترقی پا رہی ہے۔ ایسے بھی افراد ہیں جو ہندو مذہب اور دوسرے مذاہب کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی اچھی باتوں کی قدر کرتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس امر کا اقرار کرنے سے باک نہیں کھاتے کہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب جھوٹے نہیں ہیں۔ میں اس بڑھتی ہوئی

آزادانہ اسپرٹ کے لئے ان کا شکر گذار ہوں لیکن میرا اعتقاد یہ ہے کہ ابھی
اس سلسلہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے"

ان کی خود نوشت سوانح عمری میں ایک مقام پر ایک سبق آموز مکالمہ
درج کیا گیا ہے جو جنوبی افریقہ کی ہندوستانی جماعت کے ایک لیڈر کیساتھ
ہوا تھا جن کا نام عبداللہ سیٹھ تھا اور جو مستحکم خیال کے مسلمان محبِ وطن تھے
میں نے کہا کہ "یہاں بہت سے نوجوان ہندوستانی ہیں جن کی پیدائش
اور تعلیم یہیں کی ہے۔ کیا وہ آپ کی مدد نہیں کرتے ؟"

عبداللہ سیٹھ نے مایوسی کے لہجہ میں کہا کہ "وہ ہمارے پاس نہیں پھٹکتے
اور اگر آپ سچ بات پوچھیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم انہیں اپنا نہیں سمجھتے عیسائی
ہونے کی حیثیت سے وہ سفید فام پادریوں کی مٹھی میں ہیں اور وہ پادری اپنی
حکومت کے تابع ہوتے ہیں"

اس کے سنتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس طبقہ کو اپنا
بنانا چاہیئے۔ کیا عیسائیت کے معنی یہی ہیں کہ لوگ عیسائی ہو جانے کے بعد ہندوستانی
نہ رہیں ؟"

ان مختلف ذاتی یادداشتوں کے علاوہ ان کی دو بہت اہم تقریریں بھی موجود
ہیں جو مہاتما گاندھی نے اپنے حال کے طول طویل دوروں میں ہندوستان اور
سیلون میں کی ہیں۔ ان تقریروں میں انہوں نے باری باری سے عیسائیوں کی
جماعت ہی سے خطاب کیا ہے۔ کلکتہ میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ حسب ذیل ہے:-

"جب کبھی میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھرتا ہوں اس وقت مجھے بہت سے

ہندوستانی عیسائی ایسے ملتے ہیں جو اپنی پیدائش اور خصوصیت کے ساتھ اپنے آبائی مذہب اور اپنے آبائی لباس کی بنا پر تقریباً شرمندگی سی محسوس کرتے ہیں۔ اینگلو انڈین جس طریقہ سے یورپینوں کی نقالی کر رہے ہیں، وہ بہت عیب کی بات ہے، لیکن ہندوستانی عیسائیوں کا ان کی نقالی کرنا ایک تشدد ہے جو وہ اپنے ملک پر اور میں کہوں گا کہ اپنے نئے مذہب پر کر رہے ہیں

"عہد جدید" میں ایک آیت ہے جس میں عیسائیوں کو گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے بشرطیکہ ان کے پڑوسی اعتراض کریں۔ میرا خیال ہے کہ اس مقام پر گوشت میں شراب اور لباس دونوں چیزیں داخل ہیں. میں اس امر کی قدر کرتا ہوں کہ قدامت کی جو باتیں خراب ہوں ان سب کو غیر مصالحانہ انداز کے ساتھ ترک کر دیا جائے، لیکن جہاں کہیں نہ صرف یہ کہ برائی کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا ہو بلکہ جہاں قدیم ریت ہی مناسب معلوم ہوتی ہو، اس وقت اس کو چھوڑ دینا جرم ہوگا بالخصوص جبکہ شخص متعلقہ کو خوب اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس کے ترک کر دینے سے رشتہ داروں اور دوستوں کو سخت رنج پہنچے گا

تبدیلی مذہب سے تبدیلی قومیت مراد نہیں ہوتی۔ تبدیلی مذہب کا مفہوم یہ ہونا چاہیئے کہ قدامت کی ہر خرابی کو خصوصیت کے ساتھ چھوڑا جا رہا ہے، اور جدید چیز کی جملہ اچھائیوں کو اختیار کیا جا رہا ہے اور نیز یہ کہ جدید چیز میں جو خرابی موجود ہے اس سے احتیاط کے ساتھ پرہیز کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا تبدیلی مذہب سے یہ مراد ہونی چاہیئے کہ ایک شخص اپنے وطن کی اور زیادہ تندہی کے ساتھ خدمت انجام دے، خدائے تعالےٰ کی مرضی کے سامنے زیادہ خلوص کے

ساتھ سرِ تسلیم خم کرے اور زیادہ انہماک کے ساتھ تزکیۂ نفس کرے

کئی سال ہوئے میں کالی چرن بینرجی سے ملا تھا۔ اگر مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے قبل یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ عیسائی ہیں تو یقیناً مجھے ان کی خانگی زندگی کی ظاہری صورت سے ہرگز ہرگز پتہ نہ چلتا کہ وہ عیسائی ہیں۔ ان کا گھر معمولی جدید ہندو گھرانے سے کسی نوع مختلف نہ تھا اور فرنیچر کے اعتبار سے سادہ اور صرف ضروری اشیا پر مشتمل تھا۔ وہ بطلِ عظیم ایک ایسے معمولی ہندو بنگالی کے لباس میں ملبوس تھا جسے یورپ کی ہوا تک نہ لگی ہو۔

میں واقف ہوں کہ عیسائی ہندوستانیوں میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ وہ اپنی ابتدائی سادگی کی طرف لوٹ جائیں، قوم میں پھر سے شامل ہو کر اس کی خدمت کریں، لیکن یہ عمل بہت ہی سست رفتاری سے جاری ہے۔ اب کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے بہت زیادہ کوشش کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ تحریر لکھتے وقت بھی میرے پیشِ نظر ایک عیسائی ہندوستانی کا خط موجود ہے جس میں تحریر کیا گیا ہے کہ ان کے لئے اور ان کے دوستوں کے لئے یہ بہت ہی مشکل امر ہے کہ وہ کوئی تبدیلی کریں اس لئے کہ ان کے افسران بالادست مخالف ہیں۔ ان میں سے بعض نے مجھ سے یہاں تک کہا ہے کہ ان کی بہت احتیاط کے ساتھ نگرانی کی جاتی ہے اور ان کی ہر ایسی حرکت کو جس سے اندازہ ہو سکے کہ وہ قومی تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں، شدت کے ساتھ مذموم خیال کیا جاتا ہے

مرحوم پرنسپل رُدر را اور میں بسا اوقات اس خراب رجحان طبیعت کے

مسئلہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ اسے بہت ہی بُرا سمجھتے تھے۔ میں درحقیقت اپنے ایک مرے ہوئے دوست کی خدمت میں ہدیۂ تعریف اور احترام پیش کر رہا ہوں جبکہ میں قارئین کی اطلاع کے لئے یہ لکھتا ہوں کہ وہ بسا اوقات اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کرتے تھے کہ ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اتنی بڑی عمر میں اپنی زندگی کی غیر ضروری یورپین عادات میں جن میں ان کی پرورش ہوئی ہے کوئی تبدیلی کر سکیں۔ کیا یہ دراصل افسوس کے قابل بات نہیں ہے کہ بہت سے عیسائی ہندوستانی اپنی مادری زبان کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اس طرح سے کرتے ہیں کہ وہ صرف انگریزی زبان بول سکیں؟ کیا اس طریقہ سے وہ اس قوم سے الگ نہیں ہو رہے ہیں جس کے درمیان رہکر انہیں زندگی بسر کرنی ہے؟

لیکن وہ اپنی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ہندو اور مسلمان بھی تبدیلِ قومیت کر چکے ہیں۔ تم بھی ایسے ہی ہو، جیسے استدلال سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا کرتا۔ میں نقاد کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے یہ باتیں لکھ رہا ہوں جسے گذشتہ تیس سال سے ہزار ہا عیسائی ہندوستانیوں کے ساتھ گہرے تعلقات اور دوستانہ روابط کی عزت حاصل رہی ہے"

اس کے بعد کے ایک موقع پر کولمبو میں مسٹر گاندھی نے ایک خطبہ دیا جس پر اس وقت بہت زیادہ تبصرہ کیا گیا تھا۔ تقریر کا موضوع تھا "حضرت عیسیٰ کا مرتبہ"۔ اسی موضوع پر میں نے اس باب کا عنوان قرار دیا ہے۔ اس میں ذیل کے اقتباسات شامل تھے:۔

"میں برسوں سے حضرت عیسیٰ کو دنیا کے زبردست ہادیوں میں شمار کرتا ہوں اور میں یہ بات نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ کہہ رہا ہوں میں اس رائے کے ساتھ اظہار عجز بھی کر رہا ہوں اس لئے کہ میں اپنے دل میں یہی جذبہ موجزن پاتا ہوں۔ بلاشبہ عیسائی صاحبان حضرت عیسیٰ کو اس سے زیادہ بلند مرتبہ دیتے ہیں جتنا کہ میں بحیثیت ایک غیر عیسائی اور ہندو کے اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہوں۔ میں نے ارادتاً الفاظ دے سکتا ہوں کی بجائے الفاظ محسوس کر سکتا ہوں استعمال کئے ہیں۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ نہ میں اور نہ کوئی اور شخص اتنا غرور کر سکتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ ایک عظیم الشان ہستی کو فلاں درجہ دے رہا ہے

بنی نوع انسان کی طرف جس قدر ہادی آئے ہیں، ان کے مرتبے ایسے نہ تھے کہ دیئے جاتے۔ وہ رتبہ تو بہ حیثیت حق کے، بہ حیثیت خدمت گذاری کے ان کا ہو چکا ہے۔ لیکن ہم میں سے جو اشخاص ادنیٰ ترین اور نالائق ترین ہیں، وہ بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں بعض باتیں محسوس کر سکیں۔ ہم میں اور ان بڑے پیشواؤں میں جو تعلق ہے وہ بیوی اور خاوند کے نمونہ پر ہے۔ یہ بہت تباہ کن اور افسوسناک بات ہوگی اگر میں ذہنی طور پر یہ استدلال پیش کرنے لگوں کہ مجھے اپنی پسند کی بیوی کو کیا درجہ دینا چاہیئے۔ لہٰذا یہ میرے دینے کا سوال نہیں رہا۔ وہ اس مرتبہ پر خود بخود جا پہنچتی ہے جو حق کی حیثیت سے اسے میرے دل میں حاصل ہے۔ یہ محض احساس کا سوال ہے۔ اس طرح سے میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کو میرے دل میں جو مرتبہ حاصل

ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ایک زبردست ہادی تھے جن کا میری زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا ہے

میں اس کالج میں تعلیم پانے والے ۷۵ فی صدی طلبا سے کہوں گا کہ آپ کی زندگیاں نامکمل رہیں گی اگر آپ نہایت احترام کے ساتھ مسیح (ع) کی تعلیمات کا مطالعہ نہ کریں گے۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ لوگ خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں جو دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا احترام کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں وہ اپنے دلوں کو تنگ کرنے کی بجائے اور زیادہ وسیع کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کسی کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ سب نے بنی نوع انسان کو مالدار بنانے کے لئے خدمت کی ہے اور وہ اب بھی اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ فیاضانہ تعلیم کے نصاب میں دوسرے سب مذاہب کا احترام کے ساتھ مطالعہ بھی شامل ہونا چاہیئے

حضرت مسیح (ع) کی تعلیم کا نچوڑ "پہاڑی کے گیت" میں موجود ہے، بشرطیکہ اس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ کی جائے اور اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے۔ پہاڑی والے وعظ کے سلسلہ میں بھی پیغام کے بارے میں میری اپنی عاجزانہ تشریح کئی ایک امور میں راسخ العقیدہ اشخاص سے بالکل جدا گانہ ہے۔ جب میں جیل سے قبل از وقت رہا ہوا تھا اس وقت سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے جن سے زیادہ گہرا دوست میرا روئے زمین پر کوئی نہیں، مجھے ایک خط دکھایا تھا جسے بشپ صاحبان نے اپنی "بھیڑوں" کے

نام بھیجا تھا۔ ممکن ہے کہ میرا یہ کہنا بے ادبی میں شامل ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت عیسیٰ کے الفاظ کو جو معنی انہوں نے پہنائے تھے، میں اُن سے متفق نہ تھا

ایک شخص کا مذہب بہرحال اس کے اور اس کے خالق کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ لیکن اگر میں اپنے خیالات اور جذبات کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں ایک گونہ کشش محسوس کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تلاش حق میں آپ کی ہمدردی کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں اور نیز یہ کہ بہت سے عیسائی دوست حضرت مسیح (ع) کی تعلیمات کے متعلق میرے افکار و آرار سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ میرے دل میں حضرت مسیح (ع) کو کیا مرتبہ حاصل ہے

لہٰذا اگر میرے سامنے صرف پہاڑی والا وعظ ہوتا اور جو معنی میں نے پہنائے ہیں وہ ہوتے، تو یقیناً مجھے یہ کہنے میں باک نہ ہوتا کہ 'میں تو عیسائی ہوں'؛ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر اس موجودہ موقع پر میں نے ایسی کوئی بات کہدی تو یقیناً مجھے خوفناک ترین قسم کی غلط بیانی کے الزام کا نشانہ بننا پڑیگا

لیکن سلبی طور پر میں آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ میری رائے میں جو باتیں آج عیسائیت کے نام سے کی جا رہی ہیں، ان کا بیشتر حصہ پہاڑی والے وعظ کی تردید ہے۔ برائے مہربانی میرے الفاظ کا خیال رکھئے گا۔ میں فی الحال عیسائی عمل کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر رہا ہوں، میں تو صرف عیسائی عقیدہ کا، اس عیسائیت کا جیسا کہ اسے مغرب میں سمجھا جاتا ہے، تذکرہ

کر رہا ہوں۔ مجھے اس رنجیدہ حقیقت کا علم ہے کہ ہر جگہ عمل عقیدہ سے بہت کم رہتا ہے۔ لہٰذا میں یہ بات بطور تنقید کے نہیں کہتا۔ میں اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ اگرچہ میں اپنی زندگی کے ہر ہر لمحہ اپنے زبانی دعاوی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاہم میرا عمل میرے زبانی دعووں کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں۔ لہٰذا مجھ سے یہ امر بہت بعید ہے کہ میں نکتہ چینی کی اسپرٹ میں اس قسم کی کوئی بات کہوں۔ لیکن میں آپ حضرات کے روبرو دنیا میں عیسائیت کی ظاہری شکل اور عیسائی عقائد کے بارے میں اپنی بنیادی مشکلات پیش کر دینا چاہتا ہوں

ایک بات ہے جو بائبل کے ابتدائی مطالعہ کے دوران میں خود بخود میرے دماغ میں داخل ہو گئی تھی۔ جب میں نے ایک حصہ پڑھا تو مجھ پر اس کا فوری اثر ہوا۔ وہ آیت یہ تھی:۔ تم پہلے خدا کی سلطنت اور اس کی نیکی کی جستجو کرو اور باقی سب باتیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی؛ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اس آیت کی اسپرٹ کو سمجھ جائیں گے، اس کے حقیقی مفہوم کو دل میں اتار لیں گے اور اس پر عمل پیرا بھی ہو جائیں گے تو اس وقت آپ کو یہ جاننے کی ضرورت نہ پڑے گی کہ آپ کے دل میں یا میرے دل میں مسیح (م) کا یا کسی دوسرے ہادی کا درجہ کیا ہے۔ اگر آپ اس اخلاقی بھنگی کا کام کریں گے اس طرح سے کہ آپ کے دل صاف اور پاکیزہ ہو جائیں اور آپ انہیں تیار رکھیں، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ تمام زبردست ہادی ہماری جانب سے کسی دعوت نامہ کے بغیر ہی اپنی اپنی

جگہ پر متمکن ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک تمام اچھی تعلیم کی بنیاد یہی ہے۔ دماغ کی تربیت دل کی تربیت کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ خدا آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ اپنے دلوں کو صاف و پاک بنا سکیں

جب میں نے جنوبی افریقہ میں ۱۸۹۳ء میں نہایت عقیدتمند طالب علم کی طرح عیسوی علم ادب کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو اس وقت میں نے بار بار اپنے دل سے سوال کیا۔ "کیا یہی عیسائیت ہے؟" اور میں صرف یہی کہہ سکا کہ "نہیں، نہیں، جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں وہ یقیناً عیسائیت نہیں ہے۔ اور میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں سے یہ آواز نکلتی ہے کہ میری وہ رائے صحیح تھی، اس لئے کہ وہ عیسائیت ایسی نہ تھی جو حضرت عیسیٰ (ع) کے شایانِ شان ہوتی اور وہ درحقیقت پہاڑی والے وعظ کے تو بالکل مخالف تھی

میرا اپنے متعلق تو یہ دعویٰ ہے کہ ایمان اور دعا میری جان ہے اور اگر میرے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دئے جائیں تو بھی مجھے یقین ہے کہ خدا تعالےٰ مجھے اتنی توفیق دے گا کہ میں اس کا انکار نہ کروں بلکہ یہی کہے جاؤں کہ وہ موجود ہے۔ مسلمان کہتے ہیں:۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ یعنی سوائے خدا کے اور کوئی چیز نہیں۔ عیسائی بھی یہی بات کہتے ہیں:۔ بدھ مذہب کا پیرو بھی یہی بات کہتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لفظ "خدا" کے بارے میں جداگانہ مفہوم پیش کرتا ہے۔ ہم ضرورتاً ایسا کرنے کے لئے مجبور ہیں، اس لئے کہ خدا تعالیٰ کو نہ صرف ہمارا چھوٹا سا کرہ

بلکہ اس قسم کے سیکڑوں کرے اور دور دراز دنیائیں نہایت عزیز ہیں۔ ہم رینگنے والے ذرا ذرا سے جانور کس طرح سے اس کی عظمت کا اندازہ کرسکتے ہیں اور کس طرح سے اس کی بے پایاں محبت اور بے انتہا رحم وکرم کا تصور کرسکتے ہیں؟ اس کی لا انتہا محبت اور رحم وکرم اس قدر عظیم الشان ہے کہ وہ انسان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کی ہستی سے انکار کردے، اس کے متعلق آپس میں نہ صرف دست وگریبان ہو بلکہ اپنے ہی ہمجنس انسانوں کا گلا کاٹے!

اس طرح اگرچہ ہم خدا کے بارے میں ایکساں الفاظ استعمال کرینگے تاہم وہ ہم سب کے لئے ایک ہی مفہوم نہ رکھیں گے۔ لیکن یہ کوئی ہرج کی بات نہیں۔ ہمیں اپنی تقریر کے ذریعہ یا اپنی تحریر کے ذریعہ دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کی ضرورت نہیں۔ ہم درحقیقت یہ بات اپنی زندگیوں کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہیں۔ ہماری زندگیاں دوسروں کے لئے کھلی ہوئی کتابیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ خود مطالعہ کرسکیں

کاش میں اپنے سارے مشنری دوستوں کو اس امر کی ترغیب دے سکتا کہ وہ اپنے مشن کے بارے میں یہی تخیل اپنے پیش نظر رکھیں! پھر اس کے بعد ہم میں ان مذہبی امور کے بارے میں نہ کوئی باہمی بے اعتمادی، نہ شک وشبہ، نہ حسد، نہ تنازعہ پیدا ہوگا بلکہ اتحاد عمل اور صلح وآشتی جلوہ گر ہوجائیگی

ہم ہندوستان کے لوگ ان عیسائی مشنری کوششوں کو جو ہم تک مغرب سے آئی ہیں، بے اعتمادی کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لئے کہ ان کی ظاہری شکل وصورت مغربی ہے

ایک نتیجہ جس کی نسبت میری خواہش ہے کہ اسے آپ اس تمام گفتگو سے اخذ کریں، یہ ہے کہ خود آپ کو اپنے قدرتی ماحول سے باہر نہ جانا چاہیئے، اور اہل مغرب کو اس ملک کے اطوار اور رسوم پر جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے تشدد نہ حملہ اس وقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ بنیادی طور پر اخلاق کے منافی نہ ہوں۔ حضرت عیسیٰ (ع) کی تعلیم کو اس چیز سے مت ملاؤ جو تہذیب نو کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں آپ حضرات سے جو مشنری ہیں درخواست کرتا ہوں کہ جن لوگوں کی قسمت کے ساتھ آپ اپنی زندگیوں کو وابستہ کر رہے ہیں، ان کے ساتھ بے جانے بوجھے تشدد نہ کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بات آپ کے پیشہ میں داخل نہیں کہ آپ اہالیان مشرق کی زندگیوں کی جڑوں تک کو کھود کر پھینک دیں۔ ان میں جو اچھائی ہو اسے قبول کیجئے۔ جیساکہ مسیح نے ہم سب کو تعلیم دی ہے: "رائے کا اظہار مت کرو تاکہ تمھارے بارے میں بھی رائے ظاہر نہ کی جائے۔ معاف کر دو تاکہ تمھیں بھی معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ تم خواہ کسی ترازو سے تولو، تمھیں بھی پھر اسی طرح تول کر دیا جائے گا"

باوجود اس کے کہ آپ کو مغربی تہذیب کی عظمت پر یقین ہے اور باوجود اسکے کہ آپ اپنے کارناموں پر نازاں ہیں، تاہم میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ انکساری اور فروتنی پر عمل پیرا ہوں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ایماندارانہ شکوک کے لیے بھی کچھ گنجائش رکھیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی پوری سادگی کے ساتھ بسر

کرنی چاہیئے اور اگر ہماری زندگی صحیح ہے تو پھر جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسروں پر اس کا اثر خود بخود پڑے گا

پہاڑی کے وعظ میں جو دولت آپ کو عطا کی گئی ہے، آپ بلاشبہ اس سے اچھی طرح سے متمتع ہوں، لیکن اگر پھر آپ مسیح (ع) کے وعظ کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہیں گے تو پھر ٹاٹ اور بھبوت آپ کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ وعظ کی تعلیمات ہم میں سے ہر ایک کے لیے ہے۔ آپ خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کر سکتے۔ خدائے رحمٰن و رحیم جو مجسم بُردباری ہے، دولت کو بھی کچھ دن اپنا جادو دکھانے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن اے طالب علمو اور اے نوجوانو، میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ دولت کے اس تباہ کرنے والے اور تباہ ہو جانے والے تماشہ سے احتراز کیجئے جس کا آج میں اپنے گرد وپیش مشاہدہ کر رہا ہوں"

جو کچھ میں نے یہاں پر بیان کیا ہے اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مہاتما گاندھی ہمیشہ ہندوستانی عیسائیوں اور یورپین مشنریوں کے بارے میں ناقدانہ طرز عمل رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ان میں ان کے بہت سے نہایت عقیدتمند معتقد اور دوست بھی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں مقاومت مجہول کی مہم میں حصہ لینے والوں میں سے بعض شریف ترین اشخاص ہندوستانی عیسائی ہی تھے۔ سابرمتی میں بعض محبوب ترین یوریپن مشنریوں سے زیادہ اور کسی کی آمد پر مسرت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس مسرت کا مشاہدہ کیا ہے جو وہ آشرم کی زندگی میں حصہ لینے سے محسوس کرتے ہیں۔

یورپین خواتین گھر کے کام کاج میں مسز گاندھی کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور ان کی مادرانہ شفقت سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں

مہاتما گاندھی کو بہترین نوعیت کی ہندوستانی عیسائیت کے ساتھ جو دلی شغف ہے، اس کے اظہار کا سب سے اچھا طریقہ غالبًا یہ ہے کہ میں اُس رقت آمیز مضمون کو یہاں پر تمام وکمال نقل کر دوں جو انہوں نے دہلی کے مرحوم پرنسپل سوشیل کمار رُودرا کے انتقال پر تحریر کیا تھا۔ خود میرا تذکرہ بھی اس کے اندر موجود ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مضمون کو جوں کا توں رہنے دینا چاہیئے۔ ان کا مضمون حسب ذیل ہے:۔

"میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک محترم دوست اور اور خاموش خادم الناس پرنسپل سوشیل کمار رُودرا کی موت پر میرے رنج وغم میں شریک ہوں جو ۳۰ جون کو منگل کے دن واقع ہوئی۔ ہندوستان جس کا سب سے بڑا روگ اس کی سیاسی غلامی ہے، صرف انہی اشخاص کو پہچانتا ہے جو اسے دور کرنے کی غرض سے کھلم کھلا بیوروکریسی سے جم کر لڑتے ہیں جس نے خندقوں کی تہری لائن قایم کر کے یعنی فوج اور بیڑہ، روپیہ اور ڈپلومیسی کے ذریعہ اپنی حفاظت کر رکھی ہے۔ وہ قدرتی طور پر زندگی کے دوسرے شعبوں میں اپنے بے غرض اور قربانی کرنے والے کارکنوں کو نہیں پہچانتا حالانکہ وہ شعبے اتنے ہی مفید ہیں جتنے کہ خالصتًا سیاسی شعبے۔ ایسے ہی ایک گمنام کارکن سوشیل رُودرا تھے جو سینٹ اسٹیفنز کالج کے سابق پرنسپل تھے۔ وہ اول درجہ کے ماہر تعلیم تھے۔ بہ پرنسپل کی حیثیت سے انہوں

نے اپنے آپ کو عام طور پر ہر دلعزیز بنا لیا تھا۔ ان کے اور ان کے شاگردوں کے درمیان ایک قسم کا روحانی رشتہ تھا۔ اگرچہ وہ عیسائی تھے لیکن ان کے سینہ میں ہندو مذہب اور اسلام دونوں کے لئے گنجایش تھی اور وہ ان دونوں مذاہب کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ایسی عیسائیت پر ایمان رکھتے تھے جو حضرت مسیح (ع) کو دنیا کا نجات دہندہ تسلیم نہ کرنے والے ہر شخص کو دوزخ میں ڈال دینے کی روادار ہو۔ وہ اپنے مذہب کی نیکنامی کا بہت لحاظ رکھتے تھے اور ساتھ ہی دوسرے مذاہب سے بھی بہت رواداری برتتے تھے۔ وہ سیاسیات کا بھی غائر نظر سے مطالعہ کرنے والوں میں سے تھے۔ جہاں وہ مفروضہ انتہا پسندوں کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کی نمائش نہ کرتے تھے وہاں وہ انہیں چھپاتے بھی نہ تھے۔ ۱۹۱۵ء سے وطن میں آنے کے بعد سے جب کبھی مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوتا تھا میں ان کا ہی مہمان ہوا کرتا تھا۔ جب تک میں نے راؤلٹ ایکٹ کے بارے میں ستیاگرہ کا اعلان نہیں کیا، ہماری دوستی کا جہاز بغیر کسی خطرے کے چلتا رہا۔ اعلیٰ طبقوں میں ان کے بہت سے انگریز دوست تھے وہ خالصتًا انگریزی مشن سے تعلق رکھتے تھے وہ پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے جو اپنے کالج میں مقرر ہوئے اس لئے میں نے محسوس کیا کہ اُن کی میرے ساتھ اس قدر گہری وابستگی اور ان کا مجھے اپنے گھر میں مہمان بنانا کہیں ان کی شہرت کے لئے مضر نہ ہو اور ان کے کالج کو خواہ مخواہ خطرے میں مبتلا نہ کر دے، لہٰذا میں نے ان سے اپنے لئے دوسری جائے پناہ تلاش کر لینے کی اجازت چاہی مگر انہوں نے جو جواب دیا وہ اُن کے شایانِ شان تھا

انہوں نے فرمایا: 'میرا مذہب اس سے کہیں گہرا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ میری بعض آرا میری زندگی کا جزو ہیں۔ وہ بہت طویل اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ممکن نہیں کہ آپ کو اپنے یہاں ایک معزز دوست محترم مہمان کے طور پر رکھنے سے میرے بارے میں کبھی کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔ لیکن اگر ان دو چیزوں میں سے کبھی کسی ایک کو منتخب کر لینے کا سوال میرے سامنے رکھا گیا کہ یا تو جو رسوخ مجھے انگریزوں میں حاصل ہے اسے کھو دوں یا آپ کی دوستی سے دست بردار ہو جاؤں، تو میں جانتا ہوں کہ میں کس چیز کا انتخاب کروں گا۔ آپ مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔'

میں نے پوچھا کہ 'اُن سب قسم کے دوستوں کا کیا ہوگا جو مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں؟ جب تک میں دہلی ہوں اس وقت تک یقیناً آپ اپنے مکان کو کاہر دالسراے نہیں بنانے دیں گے۔'

انہوں نے جواب میں فرمایا: 'سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان سب باتوں کو پسند کرتا ہوں۔ جو دوست آپ سے ملنے آیا کرتے ہیں میں انھیں پسند کرتا ہوں مجھے یہ خیال کرنے سے خوشی ہوتی ہے کہ آپ کو اپنے یہاں رکھنے سے میں اپنے ملک کی تھوڑی بہت خدمت کر رہا ہوں۔'

قارئین شاید اس امر سے واقف نہ ہوں کہ وائسرائے کے نام جو کھلا خط میں نے بھیجا تھا جس میں مطالبۂ خلافت کو عملی شکل دی گئی تھی، اس کا تصور اور مسودہ بھی پرنسپل رُدرا کے مکان ہی میں مرتب کیا گیا تھا۔ وہ اور چارلی اینڈریوز میرے مسودہ پر نظرثانی کرنے والوں میں سے تھے۔ انہی کی فیاضانہ

چھت کے نیچے ہی عدم تعاون پر غور و خوض کیا گیا تھا اور اس کا پروگرام تیار کیا گیا تھا۔ وہ اس پرائویٹ کانفرنس میں بھی جو علی برادران، چند اور مسلم دوستوں اور میرے درمیان ہو رہی تھی، ایک خاموش مگر گہری دلچسپی لینے والے تماشہ بین کی حیثیت رکھتے تھے

مذہبی تخیل پر ہی ان کے تمام اعمال و کردار کا انحصار ہوتا تھا اور اس لئے دنیاوی طاقت کے خوف کا تو کوئی سوال ہی درپیش نہ تھا اگرچہ اسی تخیل کی بدولت وہ اس قابل ہوئے تھے کہ وہ دنیاوی طاقت کے وجود کو اور اس کے استعمال اور دوستی کی صحیح طریقہ سے جانچ کر سکیں۔ انہوں نے اپنی زندگی سے یہ حقیقت ثابت کر دی تھی کہ مذہبی تخیل ہی صحیح معنوں میں توازن پیدا کرنے والی چیز ہے جس کا خوشگوار نتیجہ عمل اور اعتقاد کے مابین باہمی خوبصورت یگانگت کی شکل میں نکلتا ہے

پرنسپل رُدرا نے اپنی بہتر سے بہتر آدمیوں کو جن کی تمنا کی جا سکتی ہے کھینچ لیا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی وجہ سے ہمیں پرنسپل رُدرا جیسی ہستی ملی۔ وہ دونوں دو قالب ایک روح تھے۔ ان کے باہمی تعلقات سچی دوستی کی دنیا میں بہترین مطالعہ کی چیز ہیں۔ پرنسپل رُدرا اپنے پیچھے دو لڑکے اور لڑکی چھوڑ گئے ہیں جو سب کے سب جوان ہیں اور زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہ اس امر سے واقف ہیں کہ ان کے غم میں ان کے شریف النفس باپ کے بیشمار دوست اور مداحین بھی شریک ہیں۔"[1]

[1] اس مسئلہ پر مزید معلومات کے لئے دیکھو ضمیمہ جات چہارم و پنجم

باب پنجم

روحی قوت کا آشرم[1]

مہاتما گاندھی کے اصولوں کو پورے طور پر سمجھنا اس وقت تک ہرگز ممکن نہیں جب تک کہ ان کے آشرم کا جہاں ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ ہندوستان میں ہر بڑا اخلاقی مصلح یا روحانی پیشوا اپنے تخلیقی خیالات کو عمل میں لانے کی غرض سے دیر یا سویر ایک آشرم کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ مثلاً گوپال کرشنا گوکھلے نے جو ہندوستان کے بہت بڑے مدبر ہو گذرے ہیں، پونہ میں سرونٹس آف سوسائٹی کی بنا ڈالی۔ شاعر اعظم رابندرانا تھ ٹیگور نے شانتی نکیتن واقع بنگال میں ایک حیرت انگیز آشرم قائم کیا اور سوامی شردھانند آنجہانی نے آریہ سماج کے سلسلہ میں کانگڑی ضلع ہردوار میں گورکل کی بنیاد ڈالی

ایسے آشرموں میں باشندہ کی حیثیت سے رہ کر زندگی بسر کرنا انتہائی درجہ کا دلچسپ تجربہ ہے کیونکہ صحیح طور پر صرف اسی وقت بانی کی اسپرٹ اور شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور جب مذہبی پیشوا خود بھی بقید حیات ہو تو دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہم اُس وقت یہ دیکھنے کے قابل ہو جاتے

[1] اس آشرم کو اب مہاتما جی نے بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر (غالباً ہمیشہ کیلئے) بند کر دیا ہے۔ مترجم

ہیں کہ وہ تخلیقی مطمحِ نظر اُس مقدس زندگی کی عظیم الشان شخصیت کے گرداگرد فی الحقیقت کس طرح سے اپنے آپ کو عملی شکل میں پیش کرتا ہے جو بعد کو دوسروں کی زندگیوں کے ذریعہ اپنی توسیع کرتا رہتا ہے

مریدی کا جذبہ تمام مشرقی ممالک میں عام طور سے موجود ہے اور جوشیلے نوجوان ایسے آشرموں کی طرف اس طرح سے رجوع ہوتے ہیں بعینہٖ جس طرح سے کہ پانی اپنی سطح آپ ڈھونڈھ لیتا ہے، اس لئے کہ روحانی دنیا میں بھی کشش کا قانون پایا جاتا ہے جو اُس قدرتی قانون سے جو ہمارے گرد و پیش کی جسمانی دنیا کو باہمی کشش کے ذریعہ مجتمع کئے ہوئے ہیں، کچھ کم پائدار نہیں ہے۔ گذشتہ پچیس سال میں جو میں نے مشرق میں بسر کئے ہیں، صرف چند باتیں ایسی ہوں گی جنھوں نے مجھے حقیقتاً متاثر کیا ہے، لیکن جتنا میں ہندوستان میں انسانی دماغ کی مذہب کی جانب قدرتی کشش کو دیکھ کر اور اُس احترام کو دیکھ کر اثر پذیر ہوا ہوں جو سچی روحانی ہستیوں کا کیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ وہ اپنے مطمحِ نظر کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں ہوں، اتنا میں کسی اور بات سے نہیں ہوا

ہمیں مہاتما گاندھی کے مذہبی خیالات کو سمجھنے کے بارے میں جنھیں وہ اپنے آشرم میں حرفاً حرفاً عمل میں لانا چاہتے ہیں، ایک مکمل بیان مل جانے سے ایک گونہ امداد مل گئی ہے۔ جس وقت وہ اصول مرتب کئے گئے تھے، اُس وقت انہوں نے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودہ کو میرے پاس بغرض تنقید بھیج دیا تھا۔ جواب میں میں نے اُن کی خدمت میں ایک طویل بیان ارسال کیا تھا

اور نہایت سنجیدگی سے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ عہدِ تجرد کو حذف کردیں جو میری رائے میں نہ صرف یہ کہ ہندو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا بلکہ ایسی شے ہے جس کے نتائج لازمی طور سے خراب ہی ہوں گے" لیکن اُس وقت تو وہ اس پائنٹ پر نہایت سختی سے قایم رہے۔ اگرچہ مابعد کی تحریرات سے میں نے اندازہ کرلیا کہ انہوں نے اب بعض صورتوں میں آشرم کے رہنے والوں کی کثرت رائے سے اس میں ترمیم کردی ہے

ان کا مکمل بیان حسب ذیل ہے:۔

"ایک کام خواہ اسے بڑے سے بڑا آدمی انجام دے، اُس وقت تک حقیقی ترقی نہیں حاصل کرسکے گا جب تک کہ اس کا بیک گراؤنڈ (پس منظر) صریحی طور پر مذہبی نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہب ہے کیا چیز؟ میں تو اس کا جواب یہ دوں گا کہ اُس سے مراد وہ مذہب نہیں جو دنیا کی جملہ مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان حاصل کرے۔ مذہب ایسی چیز نہیں جسے دماغ کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہو بلکہ اسے صرف دل کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے

مذہب ہم سے الگ کوئی شے نہیں ہے، ہمیں اسے اپنے اندر سے ابھار کر پیدا کرنا ہوگا۔ یہ ہمیشہ سے ہمارے اندر ہے: بعض کو اس کا احساس ہے اور بعض کو بالکل نہیں۔ لیکن یہ چیز وہاں ہمیشہ سے موجود ہے۔ اور خواہ ہم اِس مذہبی حس کو جو ہمارے اندر ہے، بیرونی امداد کے ذریعہ یا اندرونی ارتقا کے ذریعہ بیدار کریں (اور اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ یہ بیداری کس طرح سے عمل میں آتی ہے) بہرحال اسے بیدار کرنے کی سخت ضرورت ہے بشرطیکہ ہم کوئی

کام صحیح طریقہ سے انجام دینا چاہتے ہوں یا کوئی ایسی چیز حاصل کرنا چاہتے ہوں جو عرصۂ دراز تک قایم رہے

ہماری مذہبی کتابوں میں چند قواعد انسانی زندگی کے اصولوں کے طور پر درج ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کئے بغیر ہم مذہب کا معقول تصور نہیں کر سکتے۔ ان پر بے کم و کاست یقین رکھتے ہوئے میں نے ضروری خیال کیا ہے کہ میں اس ادارہ کے قیام میں اپنے ہم خیال اصحاب کا اشتراکِ عمل حاصل کروں۔ ذیل میں وہ قواعد درج کئے جاتے ہیں جو مرتب کر لئے گئے ہیں اور ہر شخص پر جو اس کا ممبر ہونا چاہے ان کی پابندی لازمی ہوگی

سب سے پہلا اور سب سے مقدم

سچائی کا عہد

ہے۔ سچائی سے وہ مفہوم مراد نہیں ہے جسے ہم عام طور پر سمجھتے ہیں اور نہ وہ سچائی مراد ہے جو محض اس مقولہ میں مضمر ہے کہ "ایمانداری سب سے اچھی پالیسی ہے"، جس سے یہ مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب سے اچھی پالیسی نہ ہو تو ہمیں اس سے انحراف کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ یہاں سچائی سے یہ مراد ہے کہ خواہ کچھ بھی گذرے ہمیں اپنی زندگی کو سچائی کے اس قانون کے مطابق بسر کرنا چاہیئے۔ اور تعریف کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کی غرض سے میں نے پرہلاد[1] کی زندگی کی مشہور و معروف مثال کو پیش

[1] نوعمر لڑکے پرہلاد کی کہانی جس نے سچائی کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں

نظر رکھا ہے۔ سچائی کی خاطر اس نے اپنے باپ کی بھی مخالفت کرنے سے دریغ نہیں کیا، اور اس نے اپنے بچاؤ کے لئے وہ ہتھیار استعمال نہیں کئے جو اس کے باپ نے کئے تھے۔ برخلاف اس کے وہ سچائی کی حمایت میں جیسا کہ وہ اس کا مفہوم سمجھتا تھا، مرنے کے لئے تیار ہو گیا اور ان ضربات کا انتقام لینے کی اس نے ذرہ برابر پرواہ نہ کی جو اس کے باپ نے یا اس کے باپ کے مقرر کردہ آدمیوں کی طرف سے اسے پہنچائی گئی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے آپ کو واروں سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے برعکس اس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان تمام جسمانی عقوبتوں کو برداشت کیا جو اس پر روا رکھی گئی تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر سچائی غالب آئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس نے ان اذیتوں کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ خود اپنی زندگی میں یہ امر ثابت کرنے کے قابل ہو سکے گا کہ سچائی کا قانون اٹل ہے۔ یہ بات تو تھی ہی لیکن اگر وہ جسمانی سختیوں کے دوران ہی میں مر جاتا تو اس وقت بھی وہ سچائی کے دامن سے لپٹا رہتا۔ یہ ہے سچائی کا حقیقی مفہوم جس کی میں پیروی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے آشرم میں ہم یہ قاعدہ بنائیں گے کہ ہمیں بالضرور نہیں کہنا چاہیئے جب ہم نہیں کہنا چاہتے ہوں، خواہ نتائج کچھ ہی کیوں نہ نکلیں اس کے بعد

قدیم ہندوستانی علم ادب میں ایک نہایت مشہور چیز ہے۔ ہر ہندوستانی بچہ اس سے واقف ہے بعینہ جس طرح سے مغرب میں جارج واشنگٹن کی کہانی شہرت رکھتی ہے

اصولِ اہنسا

آتا ہے۔ اہنسا کے لفظی معنی ہیں "نہ مارنا" لیکن میرے نزدیک اس کے اندر ایک وسیع دنیائے معنی پنہاں ہے اور میں اس کے تصور میں خیالات کی ایسی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہوں جو بیحد ہی اونچی ہیں۔ اس کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ تم کسی کے دل کو نہ دکھاؤ، تم اپنے دل میں برے خیالات نہ جمنے دو خواہ وہ خیالات کسی ایسے شخص کے متعلق ہی کیوں نہ ہوں جو اپنے تئیں تمہارا دشمن سمجھتا ہے۔ جو شخص اس اصول پر عمل پیرا رہتا ہے وہ کسی کا دشمن نہیں بن سکتا۔ لیکن ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے آپ کو اس کا دشمن خیال کریں۔ اسی لئے یہ بات مقرر کی گئی ہے کہ ہم ایسے اشخاص کے بارے میں بھی برے خیالات نہ رکھیں۔ اگر ہم گھونسے کا بدلہ گھونسے سے دینگے تو ہم اہنسا کے اصول سے انحراف کریں گے۔ لیکن میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ اگر ہم کسی دوست کے فعل سے یا مفروضہ دشمن کے فعل پر اظہار ناراضگی کریں تو اس وقت بھی ہم اس اصول سے بہت گرے ہوئے رہیں گے۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں ناراض نہ ہونا چاہیئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں مخالفت کئے بغیر ایک بات کو مان لینا چاہیئے ناراض ہونے سے مراد یہ ہے کہ دشمن کو بھی کسی نہ کسی قسم کا گزند پہنچے یا یہ کہ وہ ہمارے راستہ سے ہٹا دیا جائے ہماری کسی کارروائی کے نتیجہ کے طور پر نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کی کارروائی کے ذریعہ یا ملکوں خدائی وساطت سے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسا بھی خیال رکھیں گے

تو ہم عدم تشدد کے اصول سے ہٹ جائیں گے جو لوگ آشرم میں شامل ہوں گے انہیں حرفاً حرفاً اسی معنی کی پیروی کرنی ہوگی

اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کلی طور پر اس اصول پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔ یہ ایک مطمحِ نظر ہے جس پر ہمیں پہنچنا ہے اور یہ ایک ایسا مطمحِ نظر ہے جس تک ہم اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب ہم میں ایسا کرنے کی اہلیت ہو۔ لیکن یہ جیومیٹری کا کوئی سوال نہیں ہے اور نہ یہ اعلیٰ ریاضیات میں مشکل سوالات کو حل کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ہم میں سے اکثر اشخاص نے ان سوالات کو حل کرنے میں بہت رت جگائی کی ہے۔ لیکن اگر آپ اس اصول کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو ابھی آپ کو اور زیادہ رُت جگائی کرنی ہوگی اور بہت شدید تکالیف سہنی ہونگی اس سے قبل کہ آپ اس مقصد اعلیٰ کے قریب پہنچیں۔ یہ محض مطمحِ نظر ہے اور اس سے زیادہ نہیں جس پر آپ کو اور مجھ کو پہنچنا ہے بشرطیکہ ہم یہ سمجھنا چاہیں کہ مذہبی زندگی سے کیا مراد ہے

جو شخص اس اصول کی تاثیر اور قوت پر یقین رکھتا ہے وہ اپنی آخری منزل میں جبکہ وہ منزل مقصود تک پہنچنے کے قریب ہو جاتا ہے، یہ محسوس کرتا ہے کہ تمام دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر آپ اپنی محبت یعنی اہنسا کا اظہار ایسے طریقہ سے کریں گے کہ وہ آپ کے مفروضہ دشمن کے دل پر کالنقش فی الحجر ہو جائے تو لازمی طور پر وہ اس کا جواب محبت کی شکل میں دے گا۔ اس قاعدہ کے ماتحت منظم خفیہ اقدامات قتل یا ایسے قتلوں کے لئے جو کھلم کھلا

کئے جائیں گے، کوئی جگہ نہیں ہے، یا ایسے تشدد کی جو ملک کی خاطر کیا جائے
یا ان اعزا کی عزت کی حفاظت کرنے کی خاطر روا رکھا جائے جو آپ کی سپردگی
میں ہوں۔ یہ اصول ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم ان لوگوں کی عزت کو جو ہماری سپردگی
میں ہو ، اس طرح سے بچائیں کہ ہم اپنی زندگیوں کو اس شخص کے حوالہ
کر دیں جو عزت پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اور ضربات پہنچانے کے مقابلہ میں یہ بات
کہیں زیادہ جرأت کی طالب ہے۔ اگر آپ کوئی انتقامی کارروائی نہ کریں
بلکہ اپنے اعزا اور دشمن کے درمیان اپنی جگہ پر قایم ہو جائیں اور بدلہ لئے بغیر
آپ ضربات خود کھاتے رہیں تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ میں آپ کو اپنا قول
دیتا ہوں کہ اس کا سارا تشدد آپ پر صرف ہو جائے گا اور آپ کے دوست
صحیح وسلامت رہ جائیں گے۔ زندگی کی اس اسکیم کے ماتحت حب الوطنی کا
کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جو ایسی لڑائیوں کو جو آپ آج یورپ میں دیکھ رہے
ہیں، حق بجانب ٹھہرا سکے
اس کے بعد

تجرد کا عہد

آتا ہے۔ جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں یا حقیقی مذہبی زندگی کی شان
دیکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں خواہ وہ شادی
شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شادی صرف عورت کو مرد کے قریب لے
آتی ہے اور وہ مخصوص معنوں میں دوست ہو جاتے ہیں اس طرح سے کہ نہ
تو اس زندگی میں علیحدہ ہوتے ہیں اور نہ آنے والی زندگیوں میں — یہ

مطمحِ نظر ان لوگوں کے پیش نظر رکھ دیا جاتا ہے جو آشرم میں آتے ہیں۔ میں اس پر طویل بحث کرنا نہیں چاہتا

اس کے بعد ایک مزید وعدہ

ضبطِ دہن کا عہد

ہے۔ جو شخص اپنے حیوانی جذبات پر قابو رکھنے کا خواہشمند ہے وہ اس کام کو آسانی کے ساتھ کرلے گا بشرطیکہ وہ اپنے دہن پر انضباط رکھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس عہد پر عمل کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاوقتیکہ ہم ہیجان میں لانے والے تحریک پیدا کرنے والے اور شہوت پیدا کرنے والے مسالوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں گے ہم یقیناً حیوانی جذبات کی فضول، غیر ضروری اور جوش میں لانے والی تحریک پر ضبط رکھنے کے قابل نہ ہوں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ہم اپنے جسموں کی مقدس امانت کا جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، غلط استعمال کریں گے اور درجہ میں جانوروں اور حیوانوں سے کم ہو جائیں گے اور اس وقت ہمارا کام یہ رہ جائے گا کہ کھائیں پئیں اور شہوت رانی کریں جس میں ہم اور جانور اشتراک رکھتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی کسی گھوڑے یا گائے کو دیکھا ہے کہ وہ ہماری طرح اپنے کام و دہن کا غلط استعمال کرے؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تہذیب و تمدن کی علامت ہے یا حقیقی زندگی کا ثبوت ہے کہ اپنی کھانے پینے کی چیزوں کے پیچھے یہاں تک پھریں کہ ہم بالکل پاگل بن جائیں اور ایسے اخبارات کے پیچھے دوڑتے پھریں جو ان کھانوں کے بارے میں اشتہارات شائع کرتے ہیں؟

اس کے بعد

چوری نہ کرنے کا عہد

آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک لحاظ سے ہم سب چور ہیں۔ اگر میں ایک ایسی چیز لے لوں جس کی مجھے فوری استعمال کی ضرورت نہیں ہے اور اسے رکھ لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے کسی دوسرے کے پاس سے اُسے چرالیا ہے۔ یہ بغیر کسی استثنا کے قدرت کا بنیادی قانون ہے کہ قدرت روز بروز ہماری ضروریات کے لئے کافی چیزیں پیدا کر دیتی ہے، اور اگر ہر شخص اُتنا لے لے جو اس کے لئے کفایت کرے اور اس سے زیادہ نہ لے تو اس دنیا سے افلاس مفقود ہو جائے گا اور کوئی شخص ایسا نہ نکلے گا جو فاقہ کشی سے مر جائے۔ میں سوشلسٹ نہیں ہوں اور میں جایدادیں رکھنے والے اشخاص کو اُن کی جایدادوں سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ذاتی طور پر ہم میں سے ان اشخاص کو جو اندھیرے میں روشنی دیکھنے کے متمنی ہیں، اس قاعدے کی پابندی کرنی لازمی ہے۔ میں کسی آدمی کو اس کی املاک سے محروم کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ اُس صورت میں میں عدم تشدد کے اصول سے انحراف کر رہا ہوں گا۔ اگر کسی شخص کے پاس مجھ سے زیادہ سامان و اسباب اور املاک ہوں تو وہ چیزیں اسے مبارک ہوں۔ لیکن جہاں تک میری اپنی زندگی کو با قاعدہ بنانا مقصود ہے میں کسی ایسی چیز کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا جس کی مجھے ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں کروڑہا لوگ ایسے ہیں جنھیں ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور وہ کھانا بھی

ایک ایسی چپاتی پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ذرا سا نمک ملا ہوا ہوتا ہے اور گھی نام کو نہیں ہوتا۔ جو چیزیں درحقیقت ہمارے پاس ہیں ان پر آپ کا یا میرا اس وقت تک کوئی حق نہیں جب تک کہ ان کروڑ ہا اشخاص کو کھانا او کپڑا نہ مل جائے۔ آپ کو اور مجھے جو حالات سے زیادہ واقف ہیں، اپنی ضرورتوں کو ٹھیک طرح سے ترتیب دینا چاہیئے تاکہ ان کی تیمارداری کی جا سکے اور ان کے لیئے کھانا کپڑا مہیا کیا جا سکے

اس کے بعد کوئی چیز نہ رکھنے کا عہد ہے جو اول الذکر عہد کا لازمی نتیجہ ہے اور اس موقع پر جبکہ مختلف مشکلات کا مختصر سا خلاصہ اور ان کا جواب دیا جا رہا ہے، کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں

اس کے بعد

سودیشی کا عہد

آتا ہے۔ سودیشی کا عہد ایک ضروری عہد ہے۔ ہم اپنی ہستی کے ایک مقدس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جب ہم اپنے پڑوس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی ضروریات پیدا کرنے کی غرض سے دور دراز مقامات پر چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بمبئی سے آئے اور آپ کو سامان دکھلائے تو آپ بمبئی کے سوداگر کا مال خریدنے میں حق بجانب نہیں ہیں جب تک کہ آپ کے گھر کے قریب ایک سوداگر موجود ہے جو مدراس میں پیدا ہوا ہے اور جس کی پرورش بھی وہیں ہوئی ہے

سودیشی کے بارے میں میرا یہی نظریہ ہے۔ اپنے گاؤں میں آپ اپنے

دیہاتی حجام کی امداد کرنے کے پابند ہیں اس زیادہ مکمل حجام کے مقابلہ میں جو مدراس سے آپ کے پاس آیا ہوگا۔ اگر آپ اس امر کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ کے گاؤں کا حجام اپنے فن میں مدراس والے حجام جیسا بن جائے تو آپ اسے تربیت دے سکتے ہیں۔ آپ بالضرور اسے مدراس بھیج دیجئے بشرطیکہ آپ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے فن کو اچھی طرح سے سیکھ لے۔ جب تک آپ یہ نہ کرلیں اُس وقت تک آپ کسی اور حجام کے پاس جانے میں حق بجانب نہیں ہیں۔ یہی حقیقی سودیشی ہے اس لئے جب ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان میں نہیں بن سکتیں تو ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کے بغیر گذارہ کرلیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں ایسی بہت سی چیزوں کو ترک کرنا پڑ جائے، لیکن میری بات پر یقین رکھیئے کہ جب آپ اس قسم کا خیال رکھنے لگیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے سر سے بہت بھاری بوجھ ہٹا لیا گیا ہے، بعینہٖ جس طرح سے مسافر کی کیفیت ہوئی جس کا حال "پلگرمز پروگریس" ؎ جیسی بے نظیر کتاب میں درج ہے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جبکہ وہ بھاری بوجھ جو نادانستہ طور پر مسافر اٹھائے لیجا رہا تھا، اس کے سر پر سے گر گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اب زیادہ زیادہ آزاد آدمی ہے بہ نسبت اس وقت کے جب وہ سفر پر روانہ ہوا تھا اسی طرح آپ بھی اب کے مقابلہ میں اپنے تئیں زیادہ آزاد آدمی محسوس کریں گے اگر فی الفور سودیشی کی زندگی اختیار کرلیں گے۔ ہم نے

؎ PILGRIM'S PROGRESS

بے خوفی کا عہد

بھی لے رکھا ہے۔ میں نے ہندوستان میں اپنے مختلف دوروں میں یہ بات معلوم کی تھی کہ میرے ملک پر ذابح پیدا کرنے والا خوف طاری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم پبلک میں اپنا منہ نہ کھولیں: ہم صرف خفیہ طریقہ سے اپنی آرا کے متعلق گفتگو کریں۔ ہم اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہر قسم کی گفتگو کرنے کے مجاز ہیں، لیکن وہ باتیں بالعموم عامۃ الناس کے لئے نہیں ہوا کرتیں

اگر ہم نے خاموش رہنے کی قسم کھائی ہوتی تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ صرف ایک ذات ایسی ہے جس کا ہمیں خوف کرنا چاہیئے اور وہ خدا ہے۔ جب ہم خدا کا خوف کریں گے تو پھر ہم کسی آدمی سے نہیں ڈریں گے خواہ وہ کتنے بڑے عہدہ پر کیوں نہ فائز ہو، اور اگر آپ سچائی کے عہد کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بے خوفی بالکل ضروری ہے۔ اس سے قبل کہ ہم ہندوستان کی قسمت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں ہمیں اس بے خوفی کی عادت ڈالنی ہوگی

اور ہم نے

اچھوتوں کے متعلق بھی عہد

لے رکھا ہے۔ ہندو مذہب کے دامن پر ایک نہ مٹنے والا داغ ہے جسے وہ ہر جگہ لئے پھر رہا ہے۔ میں یہ یقین نہیں کرتا کہ قدیم الایام سے یہ بات ہم تک پہنچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھوت چھات کی یہ تباہ کن، کمبخت اور غلام بنانے والی اسپرٹ ہم میں اُس وقت پیدا ہوئی ہوگی جب ہم تنزل کی آخری سٹری

پر ہوں گے۔ اس وقت سے یہ خرابی بدستور ہم میں قایم رہی اور آج بھی
ہم میں موجود ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک لعنت ہے جو ہم پر مسلط ہے اور
جب تک وہ لعنت ہم پر مسلط رہے گی اس وقت تک میرے خیال میں ہم
یہ رائے رکھنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقدس سرزمین کا ہر دکھ اس ایک شخص
جرم کی مناسب سزا ہے جس کا ارتکاب ہم کر رہے ہیں۔ یہ امر کہ ایک شخص
کو اس کے پیشہ کی وجہ سے اچھوت قرار دے لیا جائے، میری سمجھ سے باہر
ہے اور اگر آپ بھی جو اس وقت طالب علمی کی دنیا میں ہیں اور جو یہ تمام
جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس جرم میں شریک ہو گئے تو یاد رکھئے کہ یہ کہیں
بہتر ہے کہ آپ سرے سے کوئی تعلیم ہی حاصل نہ کریں

ملکی زبانوں کے ذریعہ تعلیم

یورپ میں ہر تہذیب یافتہ شخص نہ صرف اپنی زبان سیکھتا ہے بلکہ
دوسری زبانیں بھی
ہندوستان میں زبان کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے ہمیں یعنی
اس آشرم والوں کو چاہیئے کہ ہم اتنی ہندوستانی زبانیں سیکھ لیں جتنی
ہمارے لئے ممکن ہوں۔ ان زبانوں کو حاصل کرنے کی زحمت انگریزی زبان
پر عبور حاصل کرنے کی زحمت سے کہیں کم ہے۔ ہم اپنے بچپن کے تمام سالوں
کو اپنے حافظہ سے کیسے محو کر سکتے ہیں؟ لیکن بعینہ ہم یہی کارروائی کرتے ہیں
جب ہم کسی غیر ملکی زبان کی وساطت سے اپنی اصلی زندگی شروع کرتے
ہیں۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کا خمیازہ ہمیں بہت زیادہ بھگتنا پڑے گا

اور اب آپ دیکھ لیں گے کہ اس تعلیم اور چھوت چھات میں کیا تعلق ہے ۔ یہ کہ علم اور تعلیم کی ترویج کے باوجود چھوت چھات بدستور قایم ہے۔ تعلیم نے ہمیں اس قابل تو بنا دیا ہے کہ ہم یہ خوفناک جرم دیکھ لیں لیکن ہم پر خوف مسلط ہے اور اس لئے ہم اپنے گھروں میں اس اصول پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے

کھدر کا عہد

آپ پوچھیں گے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کیوں استعمال کریں؟ آپ کہیں گے کہ ہاتھ کا کام ان لوگوں کو کرنا چاہیئے جو اَن پڑھ ہیں۔ میں تو محض ادبی کتابیں اور سیاسی مضامین پڑھنے میں اپنا وقت صرف کر سکتا ہوں ۔ ہمیں محنت و مزدوری کی عظمت کا احساس کرنا ہے ۔ اگر حجام یا چمار کالج میں داخل ہو جائے تو اس صورت میں بھی اسے اپنا پیشہ ترک نہ کرنا چاہیئے میری رائے میں ایسے پیشے بالکل ویسے ہی اچھے ہیں جیسے ڈاکٹری کا پیشہ

سب سے آخر میں جب آپ ان قواعد کی پابندی کر چکیں، تو پھر آپ کو

سیاسیات کے مذہبی استعمال

کی جانب متوجہ ہونا پڑے گا۔ سیاسیات اگر اسے مذہب سے علیحدہ کر لیا جائے، ایک بالکل بے معنی سی چیز رہ جاتی ہے ۔ اگر طلبا اس ملک کے سیاسی پلیٹ فارموں پر بڑی تعداد میں نظر آئیں تو یہ قومی نشو و نما کی کوئی صحت بخش علامت نہ ہو گی ، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں سیاسیات کا مطالعہ نہ کرنا چاہیئے۔ سیاسیات ہماری زندگی کا جزو

ہے ، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے قومی اداروں کو سمجھیں۔ یہ کام ہم اپنے بچپن سے کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارے آشرم میں ہر بچہ کو اپنے ملک کے سیاسی اداروں کو سمجھنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ جاننے کی کہ ہمارا ملک نئے جذبات ، نئی امنگوں اور نئی زندگی سے کس طرح متحرک اور اثر اندوز ہو رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں مذہبی اعتقاد کی مستقل اور یقینی روشنی کی بھی ضرورت ہے ایسے اعتقاد کی ضرورت نہیں جو محض عقل سے اپیل کرے بلکہ ایسے اعتقاد کی جو کالنقش فی الحجر ہو جائے۔ سب سے پہلے ہم اپنے مذہبی شعور کا احساس کرنا چاہتے ہیں اور جونہی کہ ہم نے یہ کام کر لیا ، زندگی کا تمام محکمہ ہمارے لئے کھل جائے گا ، اور پھر وہ ہم سب کا مقدس استحقاق ہو جائے گا تاکہ جب نوعمر اشخاص اپنی جوانی کو پہنچیں تو وہ زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب طور پر مسلح ہوں۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے : سیاسی زندگی کا بیشتر حصہ طلبا تک محدود ہے لیکن جونہی وہ طالب علمانہ زندگی کو ختم کر دیتے ہیں وہ قعرِ گمنامی میں چلے جاتے ہیں ، معمولی سے معمولی ملازمتیں تلاش کر لیتے ہیں ، انہیں خدا کا ، تازہ ہوا یا چمکدار روشنی کا کچھ علم نہیں ہونے پاتا اور نہ انہیں حقیقی پُرجوش خود مختاری کا ہی احساس رہتا ہے جو ان قوانین کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے جنھیں میں نے اس موقع پر آپ کے سامنے پیش کیا ہے"

ان مختلف اصولوں کا جو مہاتما گاندھی کے آشرم کی زندگی کی تہ میں کام کر رہے ہیں ، تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان میں ضمیر کے مختلف اندرونی افعال کو جو پابندیِ قوانین کے ظاہری افعال کی صورت میں

رونما ہوتے ہیں، عجیب و غریب طریقہ سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔ جہاں مہاتما گاندھی اندرونی اصول پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں (کیونکہ اس کے بغیر ہر بیرونی فعل بالکل بیکار رہو جاتا ہے) وہاں ساتھ ہی وہ اندرونی اصول کو فی الفور عمل کی کسوٹی پر پرکھنا بھی چاہتے ہیں۔ یہ بالکل حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے مطابق ہے جو پہاڑی کے وعظ میں ذیل کے الفاظ میں دی گئی ہے: "تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچان لوگے۔ کیا لوگ خاردار جھاڑیوں سے انگور جمع کر سکتے ہیں یا کانٹے دار پودوں سے انجیر توڑ سکتے ہیں؟"

اس طرح سے کام و دہن کے انضباط کا عہد سچائی اختیار کرنے اور چوری نہ کرنے اور اپنے قبضہ میں کوئی چیز نہ رکھنے کے عہدوں کے بعد آتا ہے بطور ایک آسان ذریعہ کے تاکہ ان عظیم الشان مطامح نظر تک رسائی حاصل ہو سکے۔ وہ ایک شخص کے لئے یہ بات عملاً ناممکن سمجھتے ہیں کہ وہ کام و دہن کی لذتوں سے بھی لطف اندوز ہو اور ساتھ ہی طویل مدت تک حقیقی معنوں میں سچا، بے خوف، ایماندار اور یکسو رہ سکے

کسی ایسے آشرم کے قواعد سے جہاں ضبطِ نفس مذہبی زندگی کے نمایاں پہلو کی حیثیت سے پیش کیا جائے، وہاں اس طریقہ سے اندرونی اور بیرونی زندگی کے درمیان منطقی تعلق معلوم کر لینا مشکل نہیں رہتا۔ لیکن ذاتی طور پر میں نے ابتدا ہی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عمر بھر شادی نہ کرنے کا عہد شادی جیسی مقدس چیز کی توہین ہے اور اس لئے میں نے سچائی اور اہمسا کے عہدوں کے ساتھ اس عہد کی شمولیت پر اعتراض کیا تھا۔ لیکن جہاں مجھے قدیم مذہب کے متعلق

یہ بات معلوم تھی کہ وہ تجرد کی زندگی کو شادی شدہ زندگی سے اعلیٰ سمجھکر اس سلبی پہلو پر زور دیتا ہے وہاں ہندو مذہب کے بارے میں مجھے ہمیشہ یہی معلوم ہوا ہے کہ اس کا رحجان اس کے مخالف رہا ہے۔ بعض امور میں ہندو مذہب کی نشو ونما اس طریقہ سے ہوئی ہے کہ براہ راست عیسائی مذہب سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہ شادی سے قبل کی ابتدائی زندگی کے دوران میں تو ضبطِ نفس یعنی برہمچریہ پر زور دیتا ہے لیکن زندگی کی دوسری منزل میں متاہل زندگی بسر کرنے اور اولاد پیدا کرنے کو حقیقی معنوں میں روحانی سمجھ کر تقویت دیتا ہے۔ اس طرح سے ہندو مذہب جہاں تک میں اسے سمجھ سکا ہوں شادی کو ایک مقدس معاہدہ قرار دیتا ہے جو شہوت رانی کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ وہ اندرونی ضبطِ نفس کے حصول کی ایک نہایت اعلیٰ شکل ہے۔ مہاتما گاندھی کی روحانی طاقت کے آشرم کے ضوابط میں شادی کے متعلق جو نظریہ درج تھا وہ مجھے غیر قدرتی معلوم ہوا تھا اور اس لئے مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ سارے آشرم کے لئے تجرد کا یہ عہد مجھے ہندو مذہب کی بنیاد کو قطع کرنیوالا دکھائی دیا اور یہی وجہ ہے کہ میں نے انہیں لکھا کہ اسے واپس لے لینا چاہیئے

بعض عہد جنھیں مہاتما گاندھی نے آخر میں درج کیا ہے، بدیہی طور پر مقامی نوعیت رکھتے ہیں اور وہ اپنے اندر کوئی مستقل یا دیرپا اہمیت نہیں رکھتے۔ 'ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم'، 'چھوت چھات کا تدارک'، 'سیاسیات کا استعمال'، اپنی موجودہ صورت میں ہندوستان کی فوری ضروریات کے لئے ہیں نہ کہ بنی نوع انسان کی عالمگیر ضروریات کے لئے

دیگر دو عہدوں کے بارے میں جو خالصتاً بیرونی پہلو رکھتے ہیں مثلاً سودیشی کا عہد اور کھدر کا عہد مہاتما گاندھی کی یہ رائے ہے کہ وہ نہ تو مقامی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ وہ عارضی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ترقی کا جو عندیہ انہوں نے قایم کر رکھا ہے، اس کی وہ بنیاد ہیں۔ لیکن چونکہ ان پر کسی اور جگہ دو علیحدہ ابواب میں بحث کی جائے گی اس لئے ان پر یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں

روحانی طاقت کے آشرم کے قواعد سے اب ذرا اس زندگی کی طرف منعطف ہو جائیے جسے اہل آشرم بسر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ذیل کا بیان جو بعض وزیٹروں نے دیا ہے تصویر کو زیادہ مکمل بنا دے گا۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اختصار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، لیکن میں نے بیان کے ذاتی تعلق اور انسانی دلچسپی کو جوں کا توں قایم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بیان حسب ذیل ہے:۔

میں خود مہاتما گاندھی کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں۔ سچائی اور صداقت ان کے چہرے کے ہر خط میں عیاں ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدلے میں اسی سچائی اور صداقت کو طلب کرتی ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ کوئی آدمی تصنع اختیار نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان کی تیز نگاہیں ان تمام بیرونی پردوں کے آر پار ہو جاتی ہیں۔ ہم ان کے بعض نہایت گہرے دوستوں سے پہلے مل چکے تھے اور باری باری سے ہر ایک کے معترف تھے۔ اب جبکہ خود ان سے مل لئے ہیں ہم اچھی طرح سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ اس قدر محبت اور عقیدت کیوں رکھی جاتی ہے۔ احاطہ

کے اندر کے تمام رہنے والے بوڑھے سے لیکر جوان تک نہایت مسرت کے جذبہ کے ساتھ ان کی واپسی کے منتظر تھے۔ سادگی اور خاموشی کے ساتھ کسی کو علم ہوئے بغیر وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے تاکہ بعد کو اپنے خاندان اور احباب کے بیچ میں آکر بیٹھیں۔ بچوں کے غول کے غول ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان کے ماحول میں رہ کر خوف یا ڈر کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان کے متعلق یہ بات خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں۔ تمام دن وہ آزادانہ طور پر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملتے رہے، ان کے گھروں میں جاتے رہے اور آشرم کی مختلف تفصیلات سے دلچسپی لیتے رہے

یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ پہلی ملاقات کے بعد جو جذبہ ہم میں باقی رہا وہ یہ تھا کہ ہم نے ایک آدمی سے ملاقات کی ہے جو دنیا کے کسی اور زندہ شخص سے کہیں زیادہ مسیح کے قریب ہے

شام کو ہم نے تھوڑی سی چہل قدمی کی اور اس کے بعد کھانے کے لئے چلے گئے۔ ساڑھے چھ بجے ہم نے پرارتھنا کی اور جب یہ سب کچھ ختم ہو گیا تو پھر ہم نے خود ان کی دعوت پر دو گیت سنائے۔ شروع شروع میں ہم نے زور زور سے الفاظ ادا کئے

گذشتہ شام کو جو دعائیں مانگی گئی تھیں وہ اگرچہ دل آویز اور بجد متاثر کرنے والی تھیں تاہم آج شام کو ہماری مسرت بہت زیادہ تھی کیونکہ مہاتما گاندھی اپنے گھر واپس آگئے تھے۔ ہر ایک نے ان کی موجودگی کی برکت کو محسوس کیا جب وہ ہماری طرف منہ کئے ہوئے بیٹھے تھے اور ان کے قریب ان کی پرنبھتیجی کھیل رہی تھی۔ جو چند

الفاظ اُن کی زبان سے نکلے اُن کے مخاطب بچے تھے جو سب کے سب سامنے بیٹھے تھے۔ ہر شخص خاموش فضا کو متحرک کرنے میں متامّل تھا جس نے گویا ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اور جب ہم آہستگی کے ساتھ منتشر ہو رہے تھے ہر شخص کے چہرے سے یہ عیاں تھا کہ وہ سکون کا احساس لیکر جا رہا ہے۔ وہ ناقابل فراموش شام تھی ۔۔ وہ ایک قیمتی یادداشت تھی جو زندگی کو قابل فخر چیز بنا دیتی ہے

اپنی واپسی کے بعد انہوں نے پورے دو دن تک خاموشی رکھی تاکہ وہ کاٹھیاوار کانفرنس کے لئے تیاری کر لیں۔ یہ خاموشی منگل کی شام کو عین برار تھنا سے پہلے توڑی گئی جب ہمیں ان سے ایک دوسری ملاقات کی مسرت نصیب ہوئی، اور انہوں نے ہمیں صبح کی چہل قدمی کے وقت جیل کے دروازہ تک معیت کی دعوت دی۔ وہ تو جیل کو اپنا دوسرا گھر سمجھتے ہیں، اور جب ہم نے یہ کہا کہ "آپ کے لئے جیلخانہ باعث خوف نہیں رہا" تو انہوں نے جواب دیا کہ "بیشک میرے لئے اب وہاں کوئی ڈر نہیں رہا"

اگلا دن ایک یادگار دن تھا۔ اپنے وعدہ کے مطابق وہ نو بجے ہمارے کمرے میں تشریف لے آئے اور ہم چہل قدمی کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب ہم جیل کے احاطہ کے قریب سے گذرے اس وقت ہم نے اچھی اچھی ترکاریاں اُگی ہوئی دیکھیں اس نے ہماری گفتگو کو قیدخانوں کی اصلاح کی طرف منعطف کر دیا اور ہم نے اتفاق کیا کہ ایسے اداروں کو سزا کے تخیل سے دست بردار ہو جانا چاہیئے اور اس کی بجائے اصلاح کی جانب راغب ہو جانا چاہیئے اور یہ کہ اکثر جرائم معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں

انہوں نے ہم سے بیان کیا کہ آشرم کی ابتدا کرتے وقت ان سے ایک زبردست سوال پوچھا گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ آیا وہ اچھوتوں کو اپنے یہاں بسنے کے لئے تیار ہو گے اور اس کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا تھا۔ سوال کرنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ ایک ہی مہینہ کے اندر انہیں اس آزمائش میں ڈال دیں گے، اس لئے کہ جب ایک شادی شدہ اچھوت جوڑے نے داخلہ کے لئے درخواست دی تو اسے انہوں نے فی الفور منظور کر لیا۔ یہ شخص ایک چھوٹے سے آشرم کا اب پرنسپل ہے اور اس کی بیٹی کو مسٹر گاندھی نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ وہ ان چھوٹی بچیوں میں سے ایک ہے جو پرارتھنا کے وقت محبت آمیز طریقہ سے ان کے گرد و پیش رہتی ہے

پیر کے دن ہم نے جلسے کے کمرہ میں اپنا کام جاری رکھا اور ملنے کے لئے جس قدر تانگے کی ضرورت تھی، اسے حاصل کر لیا۔ شام کی پرارتھنا کے بعد ہماری دو دوست عورتیں ہمیں اپنے گھر لے گئیں۔ ہمارے استقبال کے لئے ہر جگہ چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ قریب کے مکان سے ایک ترجمان کو بلا لیا گیا اور انہوں نے نہایت مہربانی آمیز طریقہ سے ہمیں اپنے میزبان اور ان کی بیوی کی جو ایک زمانہ میں فجی میں رہ چکے تھے، عجیب و غریب داستان سنانے میں ایک گھنٹہ صرف کر دیا

ہم دوسری صبح کو روئی دھننے کے کمرہ میں بہت سویرے پہنچ گئے اور پھر مہاتما گاندھی کی آمد کا انتظار کرنے کی غرض سے اپنے کمرہ میں لوٹ گئے۔ ساڑھے نو بجے وہ تشریف لائے اور ہم نہایت مسرت کے ساتھ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم خود بولنے کی بجائے ان کی باتوں کو سنیں گے۔ اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی غرض سے ہم نے دو ایک سوال لکھ لئے

ہم نے سب سے پہلے کاتنے کی غرض کے بارے میں سوال کیا اس لئے کہ ہم جاننا چاہتے تھے کہ آیا ان کا مقصد پست اقوام کو بلند کرنا ہے یا یہ کہ اس کا منشا تمام جماعتوں کو ایک ہی سطح پر لانا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کا مقصد یہ دونوں باتیں ہیں۔ وہ ایک طرف پست اقوام کے لوٹے جانے کے عمل کا تدارک کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف غرور و تمکنت کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک شخص کے لئے اپنی خوراک آپ بونا اور اپنی ہی زمین کی پیداوار سے پہننے کے کپڑے تیار کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ارد گرد کی ہوا میں سانس لینا۔ اس مقصد کے لئے جو شخص کام نہ کرے اُسے نہ تو کھانا دینا چاہیئے اور نہ کپڑا

جب ہم نے ان سے پوچھا کہ آیا کاتنا اور بننا ایک ہی مقصد کی طرف لیجانے کا ذریعہ ہے یا وہ خود مقصد ہے تو جواب میں انہوں نے فرمایا کہ بنی نوع انسان صرف ذریعہ ہی کو کام میں لاسکتا ہے، انتہائی مقصد ہماری نظروں سے ہمیشہ دور رہتا ہے جونہی ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد پر پہنچ گئے ہیں، اسی وقت دوسرا مقصد پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم یہاں پر جس امر سے تعلق رکھتے ہیں وہ صرف زندگی کے سیدھے سادے ذرائع ہیں یعنی ابتدائی ضروریات، باقی چیزوں کو ہم خدا کے ہاتھ میں سونپ سکتے ہیں۔ وہ زندگی کی غیر ضروری اشیاء سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، ان کا اصل تعلق ضروریات زندگی سے ہے۔ جب تک ایک شخص اپنے لئے ان چیزوں کو حاصل نہ کرلے گا ان کے خیال میں اس کا کام نامکمل رہے گا اور اس طریقہ سے ان کا کام صرف ہندوستان کے لئے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے

اس کے بعد ہم نے ان سے پوچھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا حقیقی کام

کیا ہے اور انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ہندوستان کی خدمت کرنا۔ وہ انگریزوں کی طرف ہمیشہ سے دوستانہ خیالات رکھتے ہیں، لیکن جب تک وہ ہندوستان کی بہتری کا کام کرنے کے لئے جنوبی افریقہ سے آ گئے، اس وقت تک وہ معلوم نہ کر سکے کہ وہ کس قدر محبِ وطن ہیں اور کہاں تک راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

ان کی انگریزوں سے دوستی ہمیشہ سے نہایت سچی رہی ہے لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستانی معاملات میں سدھار ناممکن ہے جب تک کہ انگریز مربیانہ سرپرستی اور رکاوٹ کا موجودہ طرزِ عمل جاری رکھیں گے۔ جب وہ محسوس کر لیں گے کہ لوٹ کھسوٹ کی بجائے خدمت گزاری ان کا اصلی مقصد ہونا چاہیئے تو اس کے بعد سچی دوستی پیدا ہو گی اور دونوں قوموں میں اتحاد آمیز اشتراکِ عمل رونما ہو جائے گا

جب پوچھا گیا کہ آیا بیرونی مداخلت سے ہندوستان کی حفاظت کرنے کی غرض سے انگریزی حکومت کی ضرورت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ "نہیں۔ لیکن چونکہ وہ یہاں پر ہیں اس لئے میرا مقصد یہ ہے کہ میں ان پر زور دوں کہ وہ دوست اور مساوی بن کر ہمارے ساتھ کام کریں"۔ انہوں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ انگریز ہندوستان کو ذرائع مندی، طاقت اور ہدایت کا سبق دے سکتے ہیں جو اُن کی نمایاں خصوصیات ہیں اور یہ کہ ہندوستان کو امداد دینے کے لئے انہی صفات کی ضرورت ہے تاکہ وہ اُس قعرِ پستی سے باہر نکل آئے جس میں وہ گرا ہوا ہے

صبح اور شام کی پرارتھنا آشرم کی روزانہ زندگی کا ایک خاص پہلو ہے تمام مرد، عورتیں اور بچے ایسے وقت میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں جبکہ اوپر آسمان

پر ستارے چمک رہے ہیں اور چاندکی روشنی میں دریا ایک روپہلی دھاری کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ اور مہاتما گاندھی مجسّم ڈسپلن بنے ہوئے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی پیکر محبت و شفقت بھی۔ اشلوکوں کی پڑہنت کے بعد اور گانا گا چکنے کے بعد انھوں نے اپنا پیغام دیا جسے ہمارے لئے ترجمہ کرکے سنایا گیا، جو یہ ہے۔ ”مجھے سلطنت، نجات یا بہشت کی ضرورت نہیں رہیں تو صرف مظلوم اور غریب اشخاص کی مصائب کو دور کردینا چاہتا ہوں“

بدھ کے دن گھٹنے والے چاند اور تین سیاروں نے پھر صبح کے آسمان کو ہمیں ایک ایسی شکل میں پیش کیا جس کی تصویر مدتوں ہمارے دماغوں سے محو نہ ہوگی۔ یہ جانتے ہوئے کہ مسٹر گاندھی صبح کی گاڑی سے دہلی روانہ ہونے والے ہیں، ہم ان کی خدمت میں بہت سویرے پہونچ گئے۔ ہم نے انہیں اپنے کمرے میں میز کے سامنے فرش پر بیٹھے ہوئے پایا۔ فرش پر کھدر کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اور جب بلند ہونے والے سورج نے تمام جگہ کو منور کر دیا وہ ان سنسان لیکن ممتاز ماحول میں عجیب و غریب ہستی معلوم ہو رہے تھے۔ کمرہ تمام آرائشوں سے یکسر مبرّا ہے۔ کتابوں کی چند الماریاں ہیں، ایک چھوٹی میز ہے، ایک کپڑے کی آرام کرسی ہے جو دیوار سے لگی پڑی رہتی ہے، دو چرخے ہیں اور ایک نیچا بنچ ہے۔ اور یہ ان کے فرنیچر کی ساری کائنات ہے

جب وہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ ایک بات صحیح ہے اور جب انہیں پورا

یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بالضرور صحیح ہوگی، اس کے بعد وہ اسے کر گزرتے ہیں اور پھر کبھی ذرا سا شک وشبہ بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے گی تو وہ ایماندارانہ ہوگی اور خدا تعالےٰ اسے معاف کر دیگا اور اس کی تلافی کرنے کی توفیق عطا فرمائیگا۔ لیکن اگر کسی بات کے متعلق وہ شک محسوس کرتے ہیں تو پھر اس کا خیال تک نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں سچا تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے "میں جانتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں، اور مجھے اپنی ذات پر پورا اعتماد ہے اس لئے میں بے خوف بن کر آگے بڑھتا ہوں۔"

انھوں نے بیان فرمایا کہ کاتنے اور بننے کے معاملہ میں کسی دوسرے صوبہ کے مقابلہ میں گجرات زیادہ موزوں ہے اس لئے کہ یہاں پر معاملات کو منظم طریقہ سے سنبھالا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کے کسی دوسرے حصہ کی بہ نسبت ان دونوں کاموں کے سکھانے والے یہاں پر زیادہ ملتے ہیں وہ اچھوتوں کے سلسلہ میں مدراس کی طرف جانے کے خواہشمند ہیں جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا "میں ہر جگہ جانے کے لئے تیار ہوں جہاں کہیں لوگوں کو میری ضرورت ہو"

جب ہم رخصت ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ جب میں واپس آجاؤنگا تو اس وقت آپ بھی یہاں ہوں گے"۔ اور رخصت ہونے کے بعد ہم نے بہت بڑا خلا اور بہت بڑی کمی محسوس کی جب ہم نے غور کیا کہ اس عجیب وغریب مہینے کے صرف چند ہی دن ہماری قسمت میں لکھے تھے

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم نے اس جگہ کے تمام احول کو دیکھا جو اس مقصد کو جن کے لئے وہ بنائی گئی ہے پورا کرنے والوں کو اپنے کام میں خوشی محسوس کرتے مزدوروں کو مسرت اور قناعت سے بھرا ہوا ہونا بچوں تک کو تعلیم سے متمتع ہونے کا موقع ملنا اور دوسرے دن کے لئے کسی تکلیف دہ خیال کی عدم موجودگی تو ہمارے دلوں کو اس بات کا خیال کرکے سخت صدمہ ہوا کہ ہم کس قدر جلدی وہاں سے روانہ ہو گئے

یہاں پر آکر بہ نسبت کسی اور جگہ کے ہمیں اپنی مصروف زندگیوں میں ان الفاظ کی سچائی معلوم ہوئی کہ "محنت کرنا عین عبادت ہے"

باب ششم

سودیشی کا مذہبی مفہوم

مہاتما گاندھی کی مذہبی زندگی کی جن چند خصوصیات نے اپنے غیر متوقع پن اور انفرادیت کی بدولت مجھے زیادہ پُر زور طریقہ سے متاثر کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سدیشی کو مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ لفظ "سودیشی" دو لفظوں سے مرکب ہے جن کے معنی ہیں "اپنے ملک کا"۔ ان کے خیال میں سودیشی اور ہندو مذہب دونوں ایک دوسرے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہیں اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں پر اس کا تذکرہ ان کے مذہبی عقیدہ کے جزو کے طور پر کر دیا جائے اگرچہ قدیم خیال کے بہت سے ہندو اُسے ہندو مذہب کا جزو لاینفک تصور نہیں کرتے۔ شاید یہ بھی خود مہاتما گاندھی کی اُپج ہو کہ وہ اپنے ہندو دھرم کے ایک پہلو کا اظہار اپنی انفرادی رائے کے ذریعہ کر دیتے ہیں

مہاتما گاندھی کے نزدیک سودیشی نام ہے ایک اصول کا یعنی یہ کہ ایک شخص کے گرد و پیش کی چیزوں کو ہر دوسری شے پر ترجیح ہونی چاہیئے اور یہ کہ ایک شخص کو دوسروں کے وطن کی بجائے اپنے ہی وطن کے روبرو ہا یہ احترام پیش کرنا چاہیئے۔ مزید برآں اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ تبدیلی مذہب ایسی شے

ہے جس کا ذہن میں تصور تک نہیں آنا چاہیئے۔ سودیشی میں انہیں وہ اصول کارفرما نظر آتا ہے جو عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ان کے تعلق کی تشریح کر دیتا ہے۔ ان کے نزدیک قومی حب الوطنی کی طرح مذہبی حب الوطنی بھی ہوا کرتی ہے

یہ اصول سودیشی جس پر وہ مذہبی عقیدہ کی طرح نہایت سختی سے قائم ہیں، صاف طور پر اس امر کی حمایت کرتا ہے کہ جس معاشرتی حالت میں کسی کی پیدائش عمل میں آئے اُس کے اُسی درجہ کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہیئے۔ کلیسائے انگلستان کی مسلمہ کتاب عقائد کے الفاظ میں جس کا یس منظر از منۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام پر مبنی ہے، وہ اصول لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ "زندگی کی اُسی حالت میں رہیں جس میں خدا تعالےٰ نے انہیں پیدا کیا ہے"! اس سے کسی حد تک اس امر کی تشریح ہو جاتی ہے کہ ذات پات کو جسے وہ ورن آشرم کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ایک معقول نظام کی حیثیت سے کس طرح حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی روحانی مذہبی کتابوں کے بنیادی اصولوں کو مانتے ہوئے اپنے آپ کو قدیم خیال کا ہندو کہنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ اِس عقیدہ کو اس کی انتہائی شکل میں کتاب موسومہ "گوسپل آف سودیشی"[1] میں پیش کیا جا چکا ہے جسے ان کے ایک معتقد نے تحریر کیا تھا اور جس کا دیباچہ خود انہوں نے تحریر فرمایا تھا اگرچہ بعد میں انہوں نے اس اصول کی بعد محدود اشکال کے بارے میں اپنی پسندیدگی واپس

[1] GOSPEL OF SWADESHI

نے لی تھی جنھیں خود مصنف نے قایم کیا تھا اور کھلم کھلا ان کا اعلان روا رکھا تھا۔ اس بات کا دوبارہ اعادہ کردینا ضروری ہے کہ بہت سے اشخاص اگرچہ وہ پرانے خیال کے ہندو ہیں اِس اصولِ سدیشی کے کلیتًا منکر ہیں کہ وہ ہندو دھرم کا جزو لاینفک ہے۔ بہت سے دوسرے اشخاص باوجود اس کے کہ وہ موجودہ حالات میں مختلف ذاتوں کے مابین شادی بیاہ کرنے کے انکار پر اب تک مصر ہیں، ذات پات کے نظام کی مفروضہ تعیینِ پیدائش سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن بحیثیت ہندو کے ان باتوں میں مسٹر گاندھی کا اعتقاد ایک بنیادی چیز بن گیا ہے اور اگرچہ وہ اور امور میں نہایت وسعت خیالی کے حامی ہیں مگر ان معاملات میں وہ نہایت کٹر وضع کے رجعت پسند واقع ہوئے ہیں

ان کی نظر میں سودیشی ایک مذہبی فریضہ ہے اور اس کا اندازہ اُس اہمیت سے لگایا جا سکتا ہے جو اسے ستیاگرہ آشرم واقع سابرمتی میں حاصل ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اُس باب میں کی گئی ہے جس میں "روحانی قوت کے آشرم"[۵] کا حال درج ہے۔ تاہم یہ حقیقت اِس واقعہ سے اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کہ جب کہ سیحین مشنری کانفرنس کے موقع پر جو مدراس میں ۱۴ فروری ۱۹۱۶ء کو منعقد ہوئی تھی، ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کسی ایسے مذہبی موضوع پر جسے وہ اولین اہمیت دیتے ہوں، مجمع مشنریوں کے سامنے اظہار خیالات کریں تو اس وقت انھوں نے سودیشی ہی کو اپنے خاص مضمون کی حیثیت سے پسند کیا تھا۔ وہ ایسے نادر موقع پر سودیشی جیسی چیز پر ہرگز ہرگز تقریر نہ کرتے

---

۵ دیکھو باب پنجم

(کیونکہ وہ ہندوستان میں عقیدتمند مذہبی مردوں اور عورتوں کے ایسے مجمع کے رو برو پہلی مرتبہ تقریر کر رہے تھے جسے وہ اس کی زبردست سچائی کے بارے میں قائل کرنا چاہتے تھے) اگر وہ دل میں یہ محسوس نہ کرتے کہ جس مذہبی اصول کی تشریح وہ کر رہے ہیں وہ خدائی باتوں میں اولین روحانی تجربہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس مسئلہ پر ان سے متعدد بار طویل اور تھکا دینے والے مباحث کرنے کے بعد میں اس کی مذہبی نوعیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ زور دار الفاظ میں ایسے خیالات پیش کر سکتا ہوں اس لئے کہ اس معاملہ میں وہ نہایت محکم ہیں اور عرصہ ہوا کہ انہوں نے گہرے غور و فکر کے بعد اپنی رائے قایم کی تھی جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس مسئلہ پر ان کی آخری رائے کیا ہے تو انہوں نے وہ تقریر حوالہ کر دی جو مدراس میں مشنریوں کے سامنے کی گئی تھی۔ --

"گہرے غور و فکر کے بعد میں نے سودیشی کی ایک ایسی تعریف قایم کی ہے جو غالباً بہترین طریقہ سے میرے مفہوم کو ادا کر دیتی ہے،

سودیشی ہماری اس اندرونی اسپرٹ کا نام ہے جو ہمیں اپنی قریب ترین گرد و پیش کی چیزوں کے استعمال اور ان کی خدمت کا پابند بناتی ہے اس طرح سے کہ زیادہ دور کی چیزوں کو خارج رکھا جائے

مثلاً (اول) مذہب کے معاملہ میں مجھے اپنے آبائی مذہب کا پابند ہونا چاہیئے۔ اگر مجھے اپنے مذہب میں کوئی نقص معلوم ہو تو اس صورت میں میرا فرض ہے نہ میں اس کے نقائص کو دور کر کے اس کی خدمت پر کمربستہ رہوں (دوم) سیاسیات کی دنیا میں مجھے دیسی اداروں کا استعمال کرنا چاہیئے اور ان کے سقم

نقائص کا علاج کر کے ان کی خدمت کرنی چاہیئے (سوم) اقتصادیات کے میدان میں مجھے صرف ان اشیاء کا استعمال کرنا چاہیئے جنھیں میرے قریب ترین پڑوسی تیار کرتے ہیں اور جب کبھی ان میں نقائص پائے جائیں اسوقت ان مصنوعات کو بہتر اور مکمل بنا کر مجھے ان کی خدمت کرنی چاہیئے

(اول) ہندو مذہب ایک رجعت پسندانہ مذہب ہے اور اسی بنا پر وہ ایک زبردست طاقت بن گیا ہے بوجہ اس سودیشی روح کے جو اس کی تہ میں اپنا کام کر رہی ہے۔ یہ نہایت ہی بردبار مذہب ہے اس لئے کہ وہ اپنا پرچار نہیں کرتا اور آج بھی اس میں توسیع کی ویسی ہی لچک موجود ہے جیسی کہ ماضی میں اس میں پائی جاتی رہی ہے۔ وہ بدھ مت کو اپنے میں جذب کر لینے میں نہ کہ ہندوستان سے باہر نکال دینے میں (جیسا کہ لوگ میرے خیال میں غلطی سے عقیدہ رکھتے ہیں) کامیاب ہو گیا ہے۔ سودیشی کی وجہ سے ایک ہندو اپنا مذہب تبدیل کرنے سے انکار کر دیتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ لازمی طور پر اسے بہترین خیال کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اُسے معلوم ہے کہ وہ اصلاحات کا نفاذ کر کے اسے مکمل بنا سکتا ہے۔ اور جو بات میں نے ہندو دھرم کے بارے میں بیان کی ہے وہ غالبًا دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذاہب پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لیکن میری رائے میں ہندو مذہب پر تو یہ بات بالکل صادق آتی ہے اور یہاں پر وہ پوائنٹ پیدا ہو جاتا ہے جسے پیش کرنے کی میں کوشش کر رہا ہوں

اگر اس بات میں جو میں نے بیان کی ہے، کچھ بھی صداقت ہے تو اس

صورت میں کیا ہندوستان کی عظیم الشان مشنری جماعتیں جن کے لئے
وہ نہایت سچائی کے ساتھ شکر گذار رہے بوجہ اس کے جو وہ اب تک اس کے
لئے کر چکی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں، بہتر طریقہ سے کام نہ کریں گی اور تبدیلی
مذہب کے مقصد کو نظرانداز کر کے اور صرف اپنے رفاہ عام کے کام کو جاری
رکھ کر عیسائیت کی خدمت پہلے سے بہتر طریقہ سے انجام نہ دیں گی؟ میں
نہایت خلوص اور انکساری کے ساتھ یہ تجویز پیش کر رہا ہوں

میں نے بائیبل کے مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اسے اپنی
مذہبی کتب کا جزو خیال کرتا ہوں۔ پہاڑی کے وعظ کی روح بھگوت گیتا کی
طرح میرے دل پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جس جوش عقیدت کے ساتھ ایک عیسائی
"مجھے روشنی کی طرف لے چل" والا گیت یا اسی نوعیت کے بعض دیگر الہامی گیت
پڑھتا ہے، بعینہٖ اسی والہانہ وارفتگی کے ساتھ میں بھی انہیں پڑھا کرتا
ہوں اور اس باب میں میں کسی عیسائی سے کم نہیں ہوں۔ میں مختلف فرقوں
کے مشہور و معروف عیسائی مشنری صاحبان کے زیر اثر رہ چکا ہوں اور یہ میری
خوش قسمتی ہے کہ آج بھی ان میں سے بعض کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات
قایم ہیں۔ اس طرح سے میں نے متذکرہ بالا تجویز ایک متعصب ہندو کی حیثیت
سے نہیں بلکہ مذہب کے ایک عاجز اور غیر جانبدار طالب علم کی حیثیت سے
جس کے رجحانات زیادہ تر عیسائیت کی طرف مائل ہیں، پیش کی ہے

کیا یہ ممکن نہیں کہ "اب تم دنیا بھر میں جاؤ" کے پیغام کی کسی قدر تنگ نظری
کے ساتھ تشریح کی گئی ہو اور اس کی حقیقی روح کو نظرانداز کر دیا گیا ہو؟ ہمیں تجربہ کی

کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ کہ بہت سی صورتوں میں تبدیلیِ مذہب کا اثر دل تک پہنچنے کی بجائے صرف پیٹ تک پہنچتا ہے۔ اور ہر صورت میں تبدیلی مذہب کا واقعہ اپنے پیچھے ایک زخم چھوڑ جاتا ہے جس سے (میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں) بچنا ممکن ہے۔ یہ بات بھی میں تجربہ ہی سے کہہ رہا ہوں کہ ہر بڑے مذہب میں تجدیدِ روح اور تبدیلیِ دل پوری طرح ممکن ہے

مجھے معلوم ہے کہ میں ایک خطرناک راستہ پر گامزن ہوں، لیکن میں اپنے موضوع کے اس حصہ کو ختم کرتے وقت یہ کہکر معذرت خواہ ہونا نہیں چاہتا کہ جو خوفناک ظلم آج یورپ میں جاری و ساری ہے اس سے شاید یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسیح ناصری کے پیغام کو جو امن اور شانتی کے پیغمبر تھے، یورپ میں بہت کم سمجھا جا رہا ہے اور یہ کہ اس پر مشرق ہی کی طرف سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے

(دوم) سیاسی امور میں سودیشی کی اسپرٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے میری رائے ہے کہ ہندوستان کے ملکی ادارے اور دیہاتی پنچائتیں ہمارے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔ ہندوستان درحقیقت ایک جمہوریت پسند ملک ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام صدمات سہنے کے بعد بھی وہ ابھی تک زندہ ہے۔ راجے، مہاراجے، روسا اور اعلیٰ افسران خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ملکی عامۃ الناس سے صرف محاصل کی تحصیل کے لئے ملتے ہیں ور موخر الذکر بھی اپنی باری سے یہ خیال کرتے ہیں کہ جہاں تک قیصر کو قیصر کا حق

ادا کرنے کا تعلق ہے، وہ اسے ادا کر چکے ہیں اور باقی امور میں وہ من مانی کارروائی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ ذات پات کا وسیع نظام نہ صرف قوم کی وسیع ضروریات کے عین مطابق تھا بلکہ وہ اس کے سیاسی مقاصد کو بھی پورا کرتا تھا۔ دیہات کے لوگ ذات پات کے نظام ہی کی بدولت اپنے اندرونی معاملات کا انتظام کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ وہ حکمران طاقت کے مظالم کا بھی سدِ باب کیا کرتے تھے۔ ذات پات کا نظام قایم کرنے والی قوم کے بارے میں اس کی حیرت انگیز تنظیمی قوتوں سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ جاننے کا خواہشمند ہے کہ وہ نظام کس قدر منظم ہے جو بغیر کسی ظاہری کوشش کے دس لاکھ سے زیادہ جاتریوں کی ضروریات کا انتظام کرسکتا ہے، تو اسے ہردوار جاکر صرف کھمبھ[1] کا میلہ دیکھ لینا چاہیئے۔ تاہم یہ کہنا فیشن میں داخل ہوگیا ہے کہ ہم میں تنظیمی قابلیت مفقود رہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ الزام ان لوگوں پر جنھوں نے جدید روایات میں پرورش پائی ہے، کس حد تک چسپاں ہو جاتا ہے۔ سودیشی کی اسپرٹ سے ہماری تقریباً مہلک غلطی ہی اُن کمیوں کی ذمہ دار ہے جن کے ماتحت ہم آج اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں

ہم تعلیم یافتہ جماعتوں نے ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کافۃ الناس پر اثر نہیں ڈال سکے۔ ہم عوام الناس کی نمایندگی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی انگریز

---

[1] ہندوؤں کا ایک مخصوص میلہ ہے جس میں دور دراز دیہات کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں اسنان کی غرض سے شریک ہوتے ہیں

افسروں جیسا سمجھتے ہیں۔ ان کے دل دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی کھلی ہوئی کتاب کا حکم نہیں رکھتے۔ اُن کے جذبات ہمارے جذبات نہیں ہیں اس وجہ سے ہم میں اور ان میں ایک گونہ علیحدگی ہو گئی ہے اور آپ بھی نئی تحقیقات منظم کرنے کی قوت کی کمی کو محسوس نہیں کرتے بلکہ اس مطابقت اور یگانگت کا فقدان دیکھتے ہیں جو نمایندگی کرنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے جن کی وہ نمایندگی کرتے ہیں۔ اگر گذشتہ پچاس سال کی مدت میں ہماری تعلیم ملکی زبانوں کے ذریعہ عمل میں آئی ہوتی تو ہمارے بڑے اور ہمارے ملازم اور ہمارے پڑوسی ہمارے علم میں شریک ہو سکتے تھے اور جے، سی۔ بوس اور پی، سی، رے کے علمی انکشافات کی رسائی رامائن اور مہابھارت کی طرح سے ہر گھر میں ہو سکتی تھی

جہاں تک عامۃ الناس کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کے وہ عظیم الشان انکشافات بالکل غیر ملکیوں کے انکشافات جیسے ہیں۔ اگر علم کے تمام شعبہ جات میں ملکی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تو اس صورت میں انہیں حیرت انگیز فائدہ پہنچتا۔ دیہات میں حفظانِ صحت کا مسئلہ مدتوں پہلے حل ہو چکا ہوتا۔ دیہاتی پنچایتیں آج ایک زندہ طاقت ہوتیں اور ہندوستان میں اس کی ضروریات کی مناسبت سے کبھی کی حکومت خود اختیاری قایم ہو چکی ہوتی اور اس کی مقدس اور پوتر سرزمین پر منظم قتل و خونریزی کا ذلت آفرین منظر پیش نہ آتا

(سوم) ہندوستان کے تباہ کن افلاس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اقتصادی

زندگی میں ہم سودیشی سے انحراف کر گئے ہیں۔ اگر تجارت کی ایک بھی چیز بیرونی ممالک سے نہ لائی جاتی تو آج ہندوستان میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہ رہی ہوتیں۔ لیکن اس کے مقدر میں یہ لکھا نہ تھا۔ ہم میں لالچ میں پڑ گئے اور انگلستان کی بھی یہی حالت ہوئی۔ انگلستان اور ہندوستان کا تعلق صاف طور پر ایک غلطی پر مبنی تھا۔ لیکن انگلستان کسی غلطی کی بنا پر ہندوستان میں نہیں رہا۔ یہ اس کی تسلیم شدہ پالیسی ہے کہ ہندوستان اس کے ہاتھ میں ہندوستانیوں کے لئے ایک امانت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو لنکا شائر کو علٰحدہ رہنا چاہیئے، اور اگر اصول سودیشی صحیح ہے تو لنکا شائر بغیر کسی نقصان کے علٰحدہ رہ سکتا ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ عندالوقت اسے صدمہ محسوس ہو

میں اقتصادی سودیشی کو تحریک بائیکاٹ نہیں سمجھتا جو کسی انتقامی جذبہ کی بنا پر اٹھائی گئی ہو، بلکہ میں اسے مذہبی تحریک خیال کرتا ہوں جس کی پیروی سب کو کرنی چاہیئے۔ میں ماہر اقتصادیات نہیں ہوں لیکن میں نے اس پر چند کتابیں پڑھی ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ انگلستان آسانی کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کر سکتا تھا اور جس قدر پیداوار کی اسے ضرورت ہے وہ اپنے یہاں پیدا کر سکتا تھا

ہندوستان لنکا شائر یا کسی اور ملک کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا قبل اس کے کہ وہ خود اپنے لئے زندہ رہ سکے۔ اور وہ اپنے لئے صرف اس وقت زندہ رہ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے ہی حدود کے اندر اپنی ضروریات کے لئے سب کچھ پیدا

کرنے۔ اسے ضرورت نہیں کہ وہ مجنونانہ اور تباہ کن مقابلہ کے بھنور میں جاکر
پھنسے جو برادرکشی. حسد اور بہت سی دوسری خرابیوں کے پیدا کرنیکا ضامن
ہے

ہندوستان کی دستی صنعت پارچہ بافی نہایت زبوں حالت میں ہے۔
گذشتہ سال اپنی سیاحت کے دوران میں میں نے خاص طور پر زیادہ سے
زیادہ جلاہوں سے ملاقات کی اور میرے قلب کو یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی
کہ وہ اپناکس قدر نقصان کر چکے ہیں اور یہ کہ وہ اس پیشہ کو جو کسی زمانہ میں
نہایت اچھی حالت میں تھا اور نہایت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کس
کس طریقہ سے ترک کر چکے ہیں۔ اگر ہم اصول سودیشی پر چلیں تو اس وقت میرا
اور آپ کا فرض ہوگا کہ ایسے پڑوسی تلاش کریں جو آپ اپنی ضروریات
پوری کرسکتے ہیں۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ایسے پڑوسی موجود ہیں جنہیں صحت بخش
پیشہ کی ضرورت ہے۔ پھر ہندوستان کا ہر گاؤں ایک مکمل شے اور آپ اپنی
ضروریات پوری کرنے والی چیز بن جائے گا اور دوسرے دیہات کے ساتھ
صرف ضروری اشیاء کا تبادلہ کرے گا۔ جہاں وہ مقامی طور پر تیار نہیں ہوتیں
ممکن ہے کہ یہ سب باتیں احمقانہ معلوم ہوں۔ لیکن ہندوستان ایسا ملک
ہے جہاں حماقت پائی جاتی ہے۔ یہ بات احمقانہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے حلق
کو پیاس کی وجہ سے اور زیادہ خشک بنایا جائے ایسی حالت میں جبکہ کوئی
شریف مسلمان پینے کے لئے پوتر پانی پیش کرنے پر تیار ہو، لیکن ہزارہا ہندو
ایسے ہیں جو کسی مسلمان گھرانے سے پانی پینے کی بجائے پیاس سے مرجانا زیادہ

پسند کریں گے۔ یہ احمق آدمی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ تعین کر لینے کے بعد کہ ان کا مذہب متقاضی ہے کہ انہیں صرف ہندوستان کا ساختہ کپڑا پہننا چاہیئے اور وہی چیز کھانی چاہیئے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے، کوئی دوسرا کپڑا پہننا یا کوئی اور کھانے کی چیز کھانا چھوڑ دیں۔ میں زندگی کے کسی شعبہ میں قانون سازی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو خرابیوں میں سے ایک کم درجہ کی خرابی ہے لیکن میں غیر ملکی اشیاء پر بہت زیادہ حفاظتی محصول کا خیر مقدم کروں گا

نیٹال نے جو ایک برطانوی نوآبادی ہے، دوسری برطانوی نوآبادی مارشیس سے آنے والی شکر پر محصول لگا کر اپنی صنعت شکر سازی کی حفاظت کر لی۔ انگلستان نے ہندوستان کے گلے آزاد تجارت کا اصول زبردستی منڈھ کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ممکن ہے اس سے انگلستان کو کھانا ملتا ہو لیکن اس ملک کے لئے تو وہ زہر ثابت ہوئی ہے

یہ بات بار بار پیش کی جا چکی ہے کہ اقتصادی زندگی میں ہندوستان سودیشی کو اختیار نہیں کر سکتا۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ سودیشی کو زندگی کا اصول نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک یہ فعل محض حب الوطنی کی ایک کوشش کے مترادف ہے جس کے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر اس میں ایثار یا قربانی مضمر ہو۔ لیکن سودیشی (جیسا کہ یہاں پر تعریف کی گئی ہے) ایک مذہبی اصول ہے جس کی پیروی ضروری ہے خواہ اس سے افراد کو جسمانی تکلیف ہی پہنچ جائے۔ سودیشی پر چلنے والا شخص ان سیکڑوں چیزوں کے بغیر زندگی بسر

کرنا سیکھ لے گا جنھیں آج وہ اپنے لئے ضروری خیال کرتا ہے
اب مجھے صرف ایک اعتراض کا جواب دینا باقی ہے جو سودیشی کے
خلاف کیا جاتا ہے۔ معترضین اسے نہایت خود غرضانہ اصول قرار دیتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ اخلاق کے مہذب مجموعۂ قوانین میں اس کی کوئی سند
نہیں ملتی۔ ان کے نزدیک سودیشی پر عمل پیرا ہونا قدیم وحشیانہ زندگی
کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔ میں اس مسئلہ کی تفصیلات میں نہیں
پڑ سکتا، لیکن میں عرض کروں گا کہ سودیشی ہی ایک ایسا اصول ہے جو
عاجزی اور محبت کے قانون کے عین مطابق ہے۔ سارے ہندوستان کی
خدمت کرنے کی غرض سے کسی تحریک کو اٹھانے کا سوال گستاخی ہے
درآنحالیکہ میں اپنے خاندان کی بھی خدمت کرنے کے قابل نہیں ہوں،
میرے لئے یہ بہتر ہے کہ میں اپنے خاندان پر اپنی کوشش کو مرکوز کردوں
اور سمجھوں کہ اس کے ذریعہ سے میں تمام قوم کی اور اگر آپ کہنا پسند کریں
تو تمام انسانیت کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ عاجزی اور محبت ہے
نیت ہی فعل کی اچھائی یا برائی کا تعین کرے گی۔ مثلاً میں اپنے خاندان
کی خدمت غلط طریقے سے کر سکتا ہوں بلا لحاظ ان تکالیف کے جو میری
وجہ سے دوسروں کو پہنچیں گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ میں ایسی نوکری
کر لوں جس میں مجھے لوگوں سے روپیہ اینٹھنے کا موقع ملے۔ اس کے ذریعہ میں
مالدار ہو جاؤں اور بعد میں اپنے خاندان کے بہت سے ناجائز مطالبات
کو پورا کروں۔ یہاں پر میں نہ تو خاندان کی خدمت کر رہا ہوں اور نہ

نہ سلطنت کی۔ یا میں یہ سمجھ لوں کہ خدا نے مجھے ہاتھ پاؤں صرف اسلئے دئے ہیں کہ میں ان کے ذریعہ اپنے لئے روزی کماؤں اور ان لوگوں کے لئے جو میرے متعلقین ہوں۔ اس وقت میں اپنی زندگی کو سادہ بنالونگا اور نیز انکی جن تک براہ راست میری پہونچ ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں میں خاندانی خدمت اور کسی کو ضرر پہونچائے بغیر کر رہا ہوں گا۔ اب فرض کیجئے کہ ہر شخص اس طرز زندگی پر عامل ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں ہمارا ملک بہترین بن جائے گا سب کے سب اس درجہ پر ایک دم نہ پہونچیں گے، لیکن ہم سے وہ لوگ جو اسے عملی جامہ پہنائیں گے، بدیہی طور پر اس مسرت بخش دن کی آمد کو قریب تر کر دیں گے

زندگی کے اس نقشہ کے ماتحت اگر میں کسی دوسرے ملک کی خدمت کرنے کی بجائے محض ہندوستان کی خدمت کروں تو میں کسی اور ملک کے مفاد کو نقصان نہ پہونچاؤں گا۔ میری حب الوطنی ایسی ہے جس میں دوسرے ممالک شامل نہیں ہیں اور ایسی بھی ہے جس میں دوسرے ممالک شامل ہیں اول الذکر اس معنی میں کہ میں اپنی توجہ اپنے وطن کی جانب نہایت عاجزی کے ساتھ منعطف رکھتا ہوں لیکن موخر الذکر اس معنی میں کہ میری خدمت مقابلہ کی اسپرٹ سے معرا ہے۔ "اپنی چیز کو اس طرح سے استعمال کرو کہ اس سے کسی دوسرے کی ملک کو ضرر نہ پہونچے" نہ صرف ایک اچھا قانونی نظریہ ہے بلکہ وہ زندگی کے ایک شاندار اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اہنسا، محبت کو بطریق مناسب عمل میں لانے کی کنجی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جو ایک عظیم الشان مذہب کے محافظ ہیں،

یہ بتادیں کہ جس حب الوطنی کی بنیاد نفرت پر ہوگی وہ قاتل ہے، لیکن جس حب الوطنی کی بنیاد محبت پر ہوگی۔ وہ زندگی بخش ہے"

مسئلہ سودیشی پر اس تقریر کا گہرا مطالعہ کرنے سے خود مہاتما گاندھی کی اپنی مذہبی زندگی کی بعض اہم تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔ (اگر میں انکو اچھی طرح سے سمجھ سکا ہوں تو) میں یہ کہوں گا کہ وہ اس وضع کے شخص نہیں ہیں جو کبھی اس بات کی امید رکھتے ہوں کہ دنیا میں کبھی ایک مذہب کی حکومت ہوگی یا دنیا میں کبھی ایک سلطنت کا وجود قائم ہوگا۔ بلکہ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مختلف ممالک بدستور سابق موجود رہیں گے جو انفرادی طور پر مگر ایک دوسرے کے ساتھ محبت آمیز، مشفقہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے اپنا مستقبل آپ بنائیں گے انکے مابین ہمیشہ ناقابلِ تسخیر رکاوٹیں حائل رہیں گی جو اُن کی رائے میں خدا کی طرف سے مقدر کی جا چکی ہیں۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں اس بارے میں وہ ٹیگور سے شدید اختلاف رکھتے ہیں جو حب الوطنی اور مذہب کے ایسے محدود اور تنگ نظریہ کے قائل نہیں ہیں۔ ٹیگور کی رائے میں ان حدود سے گذر جانا نہایت ضروری ہے مگر گاندھی کی رائے میں ان کا مناسب قیام انسانی زندگی کی موجودہ منزل میں نہایت لازمی ہے۔ مسئلہ تناسخ پر نہایت پختہ عقیدہ رکھنے کی وجہ سے وہ زندگی کے اس موجودہ دور میں اتحاد کی کسی آگے کی منزل پر پہونچنے کا فکر نہیں کرنا چاہتے

مجھے وہ نہایت ہی دلچسپ گفتگو یاد ہے جو شادی کے تعلقات کے متعلق انسے ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سودیشی کے اپنے نظریہ کی تشریح بہت

ہی دلچسپ طریقہ سے کی۔ بحث و تمحیص کے دوران میں میں نے انکے سامنے ہمارے اپنے ہی دو خاندانوں کے مابین شادی کا ایک خالصتاً فرضی کیس پیش کیا جنھیں ذات پات کے حدود اور رسمی مذہب کے قیود کو توڑ دینا چاہیئے[۱]

میں نے ان سے کہا: "فرض کیجئے کہ میری ایک لڑکی ہے جو ہر لحاظ سے آپکے لڑکے کی بیوی بننے کے لئے موزوں ہے اور ساتھ ہی وہ دونوں ایک دوسرے کیساتھ پاکیزہ ترین نوعیت کی محبت و عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے مجھسے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ آپ مجھ سے سگے بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں ایسی صورت میں کیا آپ محض ذات پات یا مذہب کے اختلاف کی بنا پر ایسی شادی میں حائل ہونا پسند کریں گے؟"

مہاتما گاندھی نے قریب قریب ذیل کے الفاظ میں جواب دیا:۔

"بیشک، میں کبھی ایسی شادی کی اجازت نہ دونگا۔ اس لئے کہ یہ بات میرے مذہبی خیالات کے خلاف ہے کہ میں ان حدود سے تجاوز کروں جن میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ذات پات کے باہر شادی کرنے کی کبھی اجازت نہ دونگا، ساتھ ہی میں ذاتوں کی مصنوعی زیادتی کا قائل نہیں ہوں، جو ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ برائی اور چھوت چھات کی برائی دونوں ورن کے حقیقی مقصد سے جداگانہ چیزیں ہیں"

میں نے ان سے پوچھا کہ پھر آپکے نزدیک حقیقی ذات کے نظام کا مفہوم کیا

---

[۱] وضاحت کی خاطر میں اس امر کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور اس لئے میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی کے چار لڑکے ہیں اور لڑکی ایک بھی نہیں

ہے جسے آپ ورن آشرم دھرم کہتے ہیں

انہوں نے جواب میں فرمایا کہ آپکے سامنے اس کی تشریح کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اسلئے کہ آپ کبھی بھی اس کے ڈسپلن (ضابطہ) کے ماتحت نہیں آئے مجھ جیسے آدمی کے نزدیک جو چار ورنوں پر عقیدہ رکھتا ہے، انسانی زندگی سیارۂ ارض پر اس موجودہ پیدائش کے دوران میں محض سلسلہ کی ایک کڑی ہے ابھی اور مرحلوں میں سے گذرنا باقی ہے اس سے پیشتر کہ یہ زندگی ختم ہو۔ ہماری موجودہ زندگی ایک ضابطہ ہے جسے خاص قواعد کے اندر جو اس خاص منزل کے لئے مناسب ہیں رہنا ہے۔ مثلاً اس منزل میں ہم اپنے والدین یا اپنا مقام پیدائش یا اپنے اجداد اپنی مرضی سے منتخب نہیں کرسکتے پھر ہمیں کیا حق پہونچتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہم اس موجودہ قلیل زندگی میں ان تمام قیود کو توڑ دیں جن میں خود خدا تعالیٰ نے بوقت پیدائش ہمیں رکھا ہے؟ گیتا نے بہت دانشمندی کیساتھ ہمیں تعلیم دی ہے کہ ایک شخص کا خود اپنا مذہبی فرض ادا کرلینا دوسروں کے مذہبی فرض کی بجا آوری کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہے۔ یہ مذہبی فرض جسے ہم دھرم کے نام سے یاد کرتے ہیں (اور یہ وہ لفظ ہے جسکا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا) میرے خیال میں اس ماحول پر مشتمل ہے جس میں پیدائش کے وقت خدا تعالیٰ نے ہمیں رکھنا مناسب سمجھا تھا۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ ہم ان حالات پیدائش کے ساتھ یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کریں نہ کہ انکے خلاف بغاوت برپا کریں یا انکے حدود کو نظرانداز کرنے کی سعی کریں خواہ اس کی تحریک انفرادی یا ذاتی وجوہ کی بناپر کیجائے،،

میں نے اپنے الفاظ کی وساطت سے اُن خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے جنھیں مہاتما گاندھی نے اس قابل یادگار صبح کو میرے رُو برو ظاہر فرمائے تھے۔ یہ معلوم کرنا آسان تھا کہ سودیشی کے متعلق خود ان کا اپنا تخیل ورن آشرم دھرم یعنی ان کی ہندوانہ مذہبی تربیت کیساتھ نہایت گہرے طور پر وابستہ ہے، کیونکہ جہاں ٹیگور نے ہمیشہ کیلئے ذات پات کے نظام کو ترک کردیا ہے، وہاں گاندھی ابھی تک یہ اعلان کر رہے ہیں کہ سماج کی قدرتی تقسیم کی حیثیت سے وہ ابتدائی چار ورنوں یا ذاتوں کے قائل ہیں

میں جس امر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ سودیشی کے بارے میں مہاتما گاندھی کا عقیدہ "قومیت" کے اُس تخیل سے مختلف ہے جو آج مغرب میں جاری و ساری ہے اگرچہ بعض موقعوں پر اُن میں خطرناک طریقہ سے ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہوگئی ہے اور اسی وجہ سے ان کے بعض زیادہ پُرجوش پیروؤں نے اسے غلطی سے اسی کا مترادف سمجھ لیا ہے۔ بہرحال وہ زیادہ تر قدیم حالت سے متعلق ہے اس لئے وہ خود ورن آشرم دھرم یعنی ذات پات کے مذہب کی طرف عود کرتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندو ذات پات کا مذہب آج بھی زیادہ کثر اشخاص میں سناتن دھرم یعنی دائمی مذہب کے نام سے شہرت رکھتا ہے

باب ہفتم

اہمسا کی تعلیم

مہاتما گاندھی کے عملی مذہبی مقاصد میں اہمسا یعنی عدم تشدد پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ مغرب والوں کے لئے اس امر کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کس طرح سے یہ چیز انکے مذہب کا بنیادی اصول بن گئی ہے۔ یہ چیز ان کے خیال میں سچائی کیساتھ پورے طور پر وابستہ ہے۔ انکی رائے میں اس سیارہ پر کی ساری زندگی کی اور خود خدا تعالیٰ کی سچائی کا راز زندگی کے تقدس اور تشدد کے استعمال کے انکار میں مضمر ہے۔ اس اصول کا نام انھوں نے اہمسا رکھا ہے جس کے لفظی معنی ہیں عدم تشدد۔ (بائبل میں) مراسلہ بنام ڈایوگ نیٹس میں ایک قدیم عیسائی کا مقولہ درج ہے: "تشدد خدا کی صفات میں داخل نہیں ہے"۔ یقیناً وہ دل سے انکی تائید کرینگے

اس پوزیشن کے اختیار کرنے میں مہاتما گاندھی نے ہندو نقطۂ نظر سے نہ تو کوئی جدت دکھائی ہے اور نہ کوئی انقلاب پیدا کرنیوالی بات پیش کی ہے اسلئے کہ مہابھارت کے دور دراز زمانہ میں بھی اہمسا کی اس ایک صفت کو ہندو مذہب نے ہمیشہ مذہبی فرض کی تکمیل قرار دیا ہے۔ مہابھارت کے الفاظ جنکا ترجمہ ان الفاظ میں کیا جاسکتا ہے کہ "اہمسا اعلیٰ ترین مذہب ہے"

ہمارے ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ عوام میں ویسے ہی مشہور ہو گئے ہیں جیسے مغربی ممالک میں بائیبل کی بعض نہایت مشہور آیات۔ میں نے خود دیہاتیوں کے منہ سے متعدد بار اس قول کو سنا ہے

جب ہم اہمسا کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ محض ایک سلبی پہلو نہیں ہے، اس میں نیکی کرنیکا ایجابی پہلو بھی اتنا ہی مضمر ہے جتنا کہ نقصان پہونچانے سے انکار کرنیکا سلبی پہلو۔ مہابھارت کے اسی ٹکڑے میں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہمسا اعلیٰ ترین مہربانی اور اعلیٰ ترین قربانی ہے اس بات کو نمایاں کر دیا گیا ہے

یہ سچ ہے کہ ہندو مذہب کے بعض فرقوں میں سلبی پہلو زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ مثلاً جینیوں میں یہ عقیدہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی بھی زندگی لینے کے انکار میں مرکوز ہو گیا ہے۔ اس طور پر یہ انسانیت کے لئے ایک ایسا بار بن گیا ہے جس کا اٹھانا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہ صرف ایک مثال ہے اس امر کی کہ ایک اعلیٰ اور عظیم الشان سچائی کے لغوی مفہوم کو انتہائی طور پر کس طرح استعمال کیا گیا ہے جہاں تک مہاتما گاندھی کی ذات کا تعلق ہے وہ کسی ایسی محدود اور تنگ تشریح کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اہمسا کے اصول کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ "الفاظ قاتل ہیں لیکن انکا مفہوم زندگی بخش ہے"

ظاہر ہے کہ یہ امر ناممکن ہے کہ ایک ہی باب کے محدود صفحات کے اندر ایک ایسی دنیا میں جو آج ہمارے گرد و پیش ہے، اس اصول کے جملہ

مسائل اور مشکلات سے بحث کیجا سکے۔ اس کے باوجود یہ بات ثابت کیجا سکتی ہے کہ مہاتما گاندھی کے مقاومت مجہول کی جملہ تحریکوں کی تہہ میں خواہ وہ جنوبی افریقہ میں شروع کی گئی ہوں یا ہندوستان میں، اہمسا ہی کارفرما ہے۔ اس عنوان کے ماتحت انھوں نے خاص خاص طریقوں کا ایک مجموعہ تیار کرلیا ہے۔ مقاومت مجہول کے بہت سے طریقوں کو محض اس لئے مسترد کردیا گیا ہے کہ ان سے تشدد کا اندیشہ تھا یا اسلئے کہ ان کی وجہ سے سچائی کو قربان کرنا پڑتا تھا۔ باقی طریقوں کو محض اسلئے منظور کرلیا گیا ہے کہ ان سے نہ تو تشدد پیدا ہوتا تھا اور نہ سچائی کو قربان کرنا پڑتا تھا

دو پہلو ایسے ہیں جو اہمسا کے بارے میں مہاتما گاندھی کے اعمال کے متعلق مغربی قارئین کے ضمیر سے ضرور اپیل کرسکتے ہیں۔ اول الذکر پہلو میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سے انہوں نے ایک چھوٹے بچھڑے کی تکالیف کا، جو حالت نزع میں مبتلا تھا، افیون کا انجکشن دیکر خاتمہ کردیا۔ ایک گائے کا یہ قتل جیسا کہ اسے کہا جا سکتا ہے، حیرت انگیز جرأت کا فعل تھا جو ہندوستان یعنی ہندوؤں کے مرکزی مقام میں عمل میں آیا تھا۔ اس فعل نے ہندو مذہب کے بنیادی اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے اشخاص کی اندھی عقیدت کو جو انکے ساتھ تھی سخت صدمہ پہونچایا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ فعل بجائے خود اصول اہمسا کی براہِ راست خلاف ورزی ہے۔ تباہی پھیلانیوالے بندروں کو تشدد کے ذریعہ آشرم سے جو عدم تشدد کا پابند ہے باہر نکال دینے کے مسئلہ نے ان کے پیروؤں میں بہت کچھ بدمزگی پیدا کردی ہے

دوسرا پہلو وہ تعلق ہے جو مہاتما گاندھی کو جنگی اور فوجی خدمت کیلئے رنگروٹ بھرتی کرنے سے رہا ہے۔ یہاں بھی اُنکی زندگی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے انکے پیرودں کو نہایت خوفناک طریقہ سے پریشان کیا ہے اس لئے کہ اہنسا پر ایمان رکھنے کے باوجود مہاتما گاندھی نے ایک زمانہ میں فی الحقیقت جنگ عظمیٰ کے لئے رنگروٹ بھرتی کرانے کی ترغیب دی تھی۔ قدرتی طور پر میں اس میں اور دیگر امور میں ان کے اپنے طرزِ عمل میں باہمی مطابقت پیدا کرنے کے ناقابل رہا ہوں اور یہ ان چند باتوں میں سے ایک ہے جن میں میں اُن سے تکلیف دہ اختلاف رکھتا ہوں۔ مابعد کے صفحات میں اُنکی تفصیلی تشریحات دی جائیں گی جن میں انھوں نے رنگروٹ بھرتی کرنے کے فعل کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور میں نے اسی لئے ان کی تحریرات کے بہت زیادہ اقتباسات درج کردیے ہیں

اس کتاب کے مابعد کے آنیوالے ابواب میں جو ان کی زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق رکھتے ہیں سنہری حروف میں وہ بے غرضانہ افعال تحریر شدہ ملیں گے جن میں انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے روحانی قوت پر اعتماد کیا ہے اور ہر مادی قوت کے استعمال کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان کے یہ افعال جو ان کی ساری زندگی پر حاوی ہیں نہایت بااعنت کے ساتھ اُس روحانی طاقت کا ثبوت ہیں جو انکی زندگی کا بنیادی اصول بن گیا ہے۔ لوگ جنگ کے لئے ان کے رنگروٹ بھرتی کرنے کے متعلق مختلف آرا رکھنے کے مجاز ہیں۔ مگر مقاومتِ مجہول کی ایک تحریک

کے بعد دوسری تحریک میں ان کے طرزِ عمل کی انتہائی شرافت کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ وہاں انہوں نے اپنا روحانی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے ہر قسم کی مادی طاقت کے مظاہرہ کو کلیتاً نظر انداز کر دیا ہے

پہلے اقتباس میں جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے اس "خوفناک آزمائش" کی کیفیت پیش کی جا رہی ہے جس میں وہ اس وقت گذرنے پر مجبور ہوئے تھے جبکہ انھوں نے مجبوراً ایک چھوٹے سے عضو بریدہ بچھڑے کی تکلیف کو کم کیا تھا۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"سابرمتی آشرم میں کاؤ سروس سوسائٹی؎ (گایوں کی خدمت کرنیوالی انجمن) کی طرف سے ایک چھوٹی سی بہترین قسم کی ڈیری اور ٹینری چلائی جانے کی کوشش عمل میں آ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں جو کام ہو رہا ہے وہ ہر قدم پر ایسی ایسی پیچیدہ اخلاقی گتھیاں پیدا کر دیتا ہے جو پیدا نہ ہوتیں اگر خالصتاً اہمسا کے ذریعہ سچائی حاصل کرنے کے مطمحِ نظر کو جو آشرم کے سامنے ہے عملی جامہ پہنانے کا جوش موجود نہ ہوتا۔

مثالاً چند دن ہوئے ایک بچھڑا جسکے اعضا کی قطع و برید ہو چکی تھی آشرم میں حالتِ نزع میں پڑا ہوا تھا۔ جو علاج اور تیمارداری ممکن تھی وہ سب کی جا چکی تھی۔ سرجن نے جس سے اس معاملہ میں مشورہ لیا گیا تھا، ظاہر کر دیا تھا کہ صورتِ حالات نہایت مایوس کن ہے اور اب کوئی مداوا کارگر

؎ COW SERVICE SOCIETY

نہ ہوگا۔ جانور کی تکلیف اس قدر شدید تھی کہ سخت کرب و بلا کے بغیر اس کا پہلو تک نہیں بدلا جا سکتا تھا

ان حالات میں میں نے محسوس کیا کہ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ خود اس کی زندگی کا خاتمہ کرکے اس کی جسمانی عقوبت کو ختم کر دیا جائے میں نے انتظامیہ کمیٹی کیساتھ ابتدائی مشورہ کیا اور اکثر ممبران نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد معاملہ سارے آشرم کے روبرو پیش کیا گیا۔ دوران مباحثہ میں ایک محترم پڑوسی نے نہایت شد و مد کے ساتھ درد کو کم کرنے ہی کی غرض سے سہی، جان لینے کی مخالفت کی اور مرنے والے جانور کی تیمارداری کرنے کی غرض سے اپنی خدمات پیش کیں۔ تیمارداری یہ تھی کہ آشرم کی چند بہنوں کے اشتراکِ عمل سے جانور سے مکھیوں کو دور رکھا جائے اور اس کے معدہ میں غذا پہونچانے کی کوشش کیجائے دوست کی مخالفت کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ہمیں جان لینے کا کوئی حق نہیں اس لئے کہ ہم اسے پیدا نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر مجھے اس کی مخالفت بے معنی معلوم ہوئی۔ وہ بامعنی سمجھی جاتی اگر جان لینے میں ہماری خود غرضی کو کچھ دخل ہوتا بالآخر میں نے نہایت عاجزی مگر عقیدہ کی پختگی کے ساتھ اپنی موجودگی میں ایک ڈاکٹر کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ ازراہ مہربانی زہر کے انجکشن کے ذریعہ بچھڑے میں دائمی سکون کی حالت پیدا کر دے۔

یہ تمام کام دو منٹ سے بھی کم عرصہ میں ختم ہوگیا

مجھے معلوم تھا کہ رائے عامہ میرے طریقِ عمل کو پسند نہ کریگی اور یہ کہ وہ

اس میں سوائے تشدد کے اور کوئی چیز نہ دیکھے گی لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک شخص کو فرض کی ادائگی میں رائے عامہ کا خیال نہیں کرنا چاہئے میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ایک شخص وہی کام کرنے کا پابند ہے جو اسے صحیح معلوم ہو خواہ دوسروں کو غلط ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ اور تجربہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ یہی صحیح طریقِ عمل ہے

میں تسلیم کرتا ہوں کہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے لیکن صرف غیر شعوری غلطی کی وجہ سے ایک شخص غلطی کو تسلیم کرنا سیکھ جاتا ہے۔ برعکس اسکے اگر کوئی شخص رائے عامہ کے خوف سے اپنے ضمیر کی آواز پر چلنے سے قاصر رہے تو وہ کبھی بھی صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرسکیگا، اور بالآخر ان دونوں کے باہمی فرق کا احساس جاتا رہیگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر نے کہا ہے:۔

محبت کا راستہ درحقیقت خوفناک آزمائش ہے
ڈرنیوالے ہمیشہ اس سے دور رہتے ہیں

ایسا کا راستہ یعنی محبت کا راستہ لیا اوقات تنہا طے کرنا پڑتا ہے

لیکن مجھ سے یہ سوال نہایت جائز طریقہ سے پوچھا جا سکتا ہے: کیا میں اس اصول کو جس کی تشریح میں نے بچھڑے کے سلسلہ میں کی ہے بنی نوع انسان پر بھی چسپاں کرنا پسند کرونگا؟ کیا میں خود اپنے لئے اس کا اطلاق پسند کرونگا؟ میرا جواب ہے! ہاں۔ وہی قانون دونوں صورتوں پر عائد ہوتا ہے۔ یہ قانون جیسا ایک کے ساتھ ویسا سب کے ساتھ

کسی مستثنیات کا قائل نہیں، ورنہ بچھڑے کا قتل غلط اور متشدد انہ ٹھہرے گا مگر عملاً ہم اپنے بیمار اعزا کی تکالیف کو موت کے ذریعہ کم نہیں کیا کرتے اسلئے کہ انکی امداد کے ذرائع بالعموم ہمارے پاس ہوا کرتے ہیں اور اس لئے کہ وہ خود غور کرنے اور اپنا فیصلہ آپ کرنے کے قابل ہوتے ہیں لیکن یہ فرض کرتے ہوئے کہ کسی بیمار دوست کی صورت میں میں کسی قسم کی امداد دینے کے قابل نہیں ہوں اور بحالی صحت بھی ناممکنات سے ہے اور مریض خوف ناک نزع کی کشمکش میں حالتِ بیہوشی میں پڑا ہے، اس وقت میں موت کے ذریعہ اس کی مصائب کا خاتمہ کرنے میں تشدد محسوس نہیں کرونگا

ٹھیک جس طرح سرجن تشدد کا استعمال نہیں کرتا بلکہ اہمسا پر اس کی خالص ترین شکل میں عمل پیرا رہتا ہے جبکہ وہ مریض کے جسم پر خود اسکے فائدے کے لئے اپنے چاقو کا استعمال کرتا ہے، بعینہٖ اسی طرح ایک شخص بعض فوری حالات میں اس امر کو ضروری خیال کر سکتا ہے کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور تکلیف اٹھانے والے شخص کی فائدہ رسانی کی خاطر سررشتۂ جاں کو جسم سے جدا کر دے۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جہاں سرجن مریض کی جان بچانے کی غرض سے آپریشن کرتا ہے دوسری صورت میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ظہور میں آتا ہے۔ لیکن زیادہ گہرا تجزیہ کرنے پر یہ محسوس ہوگا کہ ہر دو صورتوں میں جو انتہائی مقصد پیش نظر ہے وہ ایک ہی ہے۔ یعنی یہ کہ دکھ اٹھانے والی اندرونی روح کو کرب و بلا سے نجات دی جائے

لیکن اہنسا کے پیروؤں کے ساتھ دقت یہ آپڑتی ہے کہ وہ بالکل اندھے
پن کیساتھ اس کے قائل ہیں اور یہی اہنسا کو لوگوں میں پھیلانے کی راہ میں رکاوٹ
ثابت ہوتے ہیں۔ اہنسا کے مروجہ (اور میری رائے میں غلط) نظریہ نے
ہمارے ضمیر کو مردہ بنادیا ہے اور ہمیں تشدد کی دیگر اور زیادہ خراب
شکلوں مثلاً درشت الفاظ، درشت آرار، دشمنی، غصّہ، فساد، اور
بیرحمی کے جذبہ کی طرف سے بے حس کردیا ہے، اس نے ہمارے دلوں سے
یہ بات فراموش کرادی ہے کہ آدمیوں اور جانوروں کی بتدریج ایذارسانی
میں، خاتمہ اور لوٹ مار میں جو خود غرضانہ لالچ کی وجہ سے ان کے ساتھ
روا رکھی جاتی ہے، کمزوروں کو دیدہ و دانستہ ذلیل کرنے اور ان پر
ظلم کرنے میں اور ان کے احساس خودداری کو مجروح کرنے میں جس کا
مشاہدہ ہم آج اپنے گرد وپیش کر رہے ہیں کہیں زیادہ تشدد مضمر ہے
بہ نسبت اس کے کہ نیک جذبات کے ماتحت اور دوسروں کی فائدہ
رسانی کی خاطر کسی کی جان لے لی جائے
اہنسا کی حقیقت اور وسعت کے بارے میں یہی وہ بنیادی غلط فہمی
ہے یعنی انکی اضافی قیمتوں کے متعلق خیالات کی عام ابتری جو ہمارے اہنسا
کو محض عدم قتل کا مترادف سمجھنے کی ذمہ دار ہے اور تشدد کی اس خوفناک
زیادتی کو جو ہمارے ملک میں اہنسا کے نام سے روا رکھا جا رہا ہے
اہنسا کے نام نہاد پجاریوں پر کسی بیمار جانور کی جان لینے کے خیال سے
خواہ وہ اس کی جسمانی عقوبت کا خاتمہ کرنے کی غرض سے ہی کیوں نہ ہو

جو مقدس دہشت بظاہر طاری ہو جاتی ہے اس کا مقابلہ ذرا ان کی کامل بے اعتنائی اور لاپروائی سے کیجئے جو وہ گونگے بے زبان مویشیوں کی دنیا پر نت نئے ہونیوالے مظالم کی جانب روا رکھتے ہیں تو آپ تعجب کرنے لگیں گے کہ آیا آپ اہمسا کی سرزمین میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں یا شعوری یا غیر شعوری ریاکاری کی دنیا میں

اب میں دوسرے ضروری مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے آشرم دوچار ہو رہا ہے اور جس میں اہمسا کا اصول مضمر ہے۔ بندروں کی مصیبت نے ناک میں دم کر دیا ہے اور اس مسئلہ کے فوری حل کرنے کی ضرورت سختی سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس خاص حقوق رکھنے والی جماعت کی خصوصی توجہ اگی ہوئی ترکاریوں اور میووں کے درختوں کی جانب مبذول رہتی ہے اور اب ان کی مکمل تباہی قریب آن لگی ہے۔ ہماری تمام کوششوں کے باوجود ہم اس مصیبت کا موثر اور ساتھ ہی غیر تشددانہ علاج معلوم کرنے سے قاصر رہے ہیں

بندروں کو بھگا دینے کے خیال سے انہیں زخمی کر دینے کا خیال مجھے ناقابل برداشت معلوم ہوتا ہے اگرچہ میں انہیں مار ڈالنے کے سوال پر غور کر رہا ہوں بشرطیکہ اور کوئی چارہ کار نہ رہے لیکن یہ مسئلہ قبل الذکر کی طرح سے سادہ یا آسان نہیں ہے

مجھے بعض بندروں کو بھگا دینے میں اہمسا کی صریح خلاف ورزی دکھائی دیتی ہے۔ یہ خلاف ورزی نسبتاً اور زیادہ ہو جائیگی اگر انہیں مار ڈالنے کی

ضرورت پیش آئی، اس لئے کہ ذاتی فائدے کے خیال سے ضرر پہنچانے کا فعل خواہ اس میں جان لینے کی نوبت آئے یا نہ آئے، بلاشبہ تشدد میں داخل ہے

جسم کی تمامتر زندگی کسی نہ کسی تشدد کے ذریعہ قائم ہے۔ اسی لئے اعلیٰ ترین مذہب کی تعریف سلبی لفظ یعنی اہمسا سے کیگئی ہے۔ دنیا خدائی زنجیر سے جکڑی ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر جسم میں زندگی کو باقی رکھنے کی خاطر تشدد ایک جبلّی ضرورت بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہمسا کا مقلد ہمیشہ یہی دعا مانگتا ہے کہ اسے جسم کی غلامی سے کامل رہائی ملے

جب تک کوئی شخص جسم میں مقید ہے اس وقت تک وہ کلیتاً تشدد سے آزاد نہیں ہو سکتا اسلئے کہ کوئی شخص زندہ رہنے کی آرزو کو پورے طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ محض جسم پر زور ڈالنے سے کیا فائدہ جب خود روح اشتراکِ عمل سے انکار کردے؟ آپ فاقہ کشی کرکے اپنے آپ کو سپرد موت کر سکتے ہیں لیکن اگر ساتھ دماغ حسّی اشیا کے خیال میں لگا رہے تو اس صورت میں آپ کا روزہ ایک جھوٹی اور دھوکہ دینے والی چیز رہ جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک غریب، بےبس شخص کا جو زندہ رہنے کی آرزو کا غلام ہے کیا کام رہ جاتا ہے؟ وہ کس طرح سے اس تشدد کی اصلی نوعیت اور وسعت کا جس کا ارتکاب اسے کرنا ہے تعین کر سکتا ہے؟

سوسائیٹی نے بلاشبہ ایک معیار قائم کیا ہے اور اس حد تک شخص واحد کو اس کے بارے میں تکلیف اٹھانے سے بری کر دیا ہے۔ لیکن سچائی کے طالب

کو اپنی انفرادی ضرورت کے مطابق معیار کو درست کرنا اور اس میں فرق پیدا کرنا پڑتا ہے اور تشدّد کے چکر میں کمی کرنے کی غرض سے ایک مسلسل کوشش کرنی پڑتی ہے۔ لیکن کسان اپنی جفاکش اور غیر یقینی زندگی کے بوجھ سے اس قدر دبا ہوا ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ بطور خود ان مسائل پر غور کر سکے۔ اور تربیت یافتہ طبقہ اس کی امداد کرنے کی بجائے اس سے بے اعتنائی کا سلوک روا رکھتا ہے

میں چونکہ خود کسان رہ چکا ہوں اور کوئی سیدھی صاف شاہراہ مجھے ایسی نہیں ملتی جس پر میں گامزن رہوں اور اس لئے میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں اپنے لئے اور حتی الامکان اپنے ہم جنس پڑوسیوں کے لئے راستہ معین کروں۔ اور چونکہ بندروں کا مسئلہ ان بے شمار چھوٹے چھوٹے مسائل میں سے ایک ہے جن سے کسان کو سامنا رہتا ہے، لہٰذا میرا فرض ہے کہ میں ایسے ذرائع تلاش کروں جنکے ذریعہ کسان کی فصلوں کو ان سے بچایا جا سکے اس طرح سے کہ کم سے کم تشدّد عمل میں آئے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ گجرات کے کسان خاص چوکیدار ملازم رکھتے ہیں جن کی موجودگی ہی بندروں کو بھگا دیتی ہے اور پھر کسان کو ضرورت نہیں رہتی کہ ان کی جان لے۔ ممکن ہے ایسا ہوتا ہو، لیکن اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ خواہ یہ طریقہ کتنا ہی موثر کیوں نہ ہو یہ یقیناً بدیہی طور سے کسی نہ کسی موقع پر ان کو تباہ کر دینے کی کارروائی پر مبنی ہے

اس لئے کہ یہ ہمارے چچیرے بھائی بہت ہی چالباز اور سمجھ دار واقع ہوئے ہیں جس وقت انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے لئے کوئی حقیقی خطرہ موجود نہیں ہے اس وقت وہ بندوقوں کے چلانے سے بھی خوفزدہ نہ ہوں گے اور بندوقوں کے چلنے پر اور زیادہ غل مچائیں گے

کوئی بھی طریقہ جو مجھے معلوم ہے، تشدد سے خالی نہیں ہیں۔ اس لئے جہاں میں اس مسئلہ کا حل کرنے کے لئے ہر عملی تجویز کا خیر مقدم کرنے پر تیار رہوں، وہاں مشورہ دینے والوں کو مذکورہ بالا باتیں ذہن نشین رکھنی چاہئیں اور صرف ایسی تجاویز بھیجنی چاہئیں جنھیں وہ خود کامیابی کے ساتھ عمل میں لا چکے ہوں اور جن سے قلیل ترین نقصان پہنچ سکتا ہو"

یہ بحث و مباحثہ جسے مہاتما گاندھی نے اس طور پر جاری رکھا ہے اور جس سے اس امر کے متعلق خود ان کی روحانی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک انسان گوشت پوست کے قالب میں رہتا ہے وہ تشدد کے افعال کے ارتکاب سے نہیں بچ سکتا، اعلیٰ ترین مذہبی اہمیت کے خیال کو واضح کر دیتا ہے جو وہ اہنسا کی اس ایک صفت کو دیتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے ذریعہ ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ محض لفظی پیری نہیں کر رہے ہیں اور یہ کہ جب تک خود ان کا ضمیر صاف ہے وہ کس طور پر قول و فعل میں باہمی تباین کے الزام سے اپنے آپ کو بے پروا رکھتے ہیں

ایک اور مثال جس میں میری رائے میں ان کے طریق عمل کو حق بجانب ٹھہرانا اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، اب پیش کی جائے گی۔ وہ مثال ان

کی صفائی ہے جو انھوں نے برطانوی سلطنت کی مختلف لڑائیوں میں صلیب احمر کا کام کرنے کے سلسلہ میں دی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں حال ہی میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کا یہ کام خود ان کے اصول اہمسا کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مناسب ہوگا اگر ان کی صفائی کو خود ان کے الفاظ میں کسی قدر طوالت کیساتھ پیش کر دیا جائے۔ وہ اپنی صفائی نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ قریب قریب وہی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جو اوپر بیاں ہو چکی ہے۔ یعنی یہ کہ تمام تر انسانی زندگی برائی پر مبنی ہے اور یہ کہ ہمارا انتخاب دو برائیوں میں سے کمتر درجہ کی برائی کو قبول کر لینے تک محدود ہے نہ کہ اس تک کہ ہم برائی سے کلیتاً اپنے آپ کو بچائیں رکھیں۔ وہ زمزمہ سراز ہیں:۔

ایمبولنس کا کام کرنے میں میرے طرز عمل کے لئے کوئی صفائی پیش نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اسے اہمسا کے ترازو میں تولا جائے۔ میں ان لوگوں میں جو تباہی کے آلات کا استعمال کرتے ہیں اور ان میں جو صلیب احمر کا کام کرتے ہیں کوئی فرق نہیں کرنا چاہتا۔ دونوں جنگ میں شرکت کرتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں۔ دونوں جنگ کے جرم کے مجرم ہیں۔ لیکن ان تمام سالوں میں اپنی پچھلی کارروائیوں پر نظر ڈالنے کے بعد بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ جن حالات میں میں نے اپنے آپ کو پایا میں وہی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور تھا جو میں نے بالآخر اختیار کیا۔ نہ صرف جنگ بوئر میں بلکہ جنگِ عظمیٰ میں بھی اور اسی وجہ پر نام نہاد دیٹال کی زولو بغاوت میں جو

سنہ ۱۹۰۶ء میں برپا ہوئی
زندگی پر بہت سی قوتیں حکمرانی کرتی ہیں۔ اگر ہم صرف ایک عام
اصول کے ذریعہ طریق عمل کا تعین کرسکتے جس کا اطلاق کسی وقت میں اتنا
بدیہی ہوتا کہ اس کے لئے ایک منٹ کے غور کی بھی ضرورت نہ پڑتی تو زندگی
کیسے آسان طریقہ سے کٹتی! لیکن میں کسی واحد فعل کا بھی تصور نہیں
کرسکتا جس کا اس قدر آسانی کے ساتھ فیصلہ کیا جاسکتا ہو
جنگ کا پکا مخالف ہونے کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو تباہی پھیلانے
والے آلاتِ حرب کی تعلیم نہیں دی حالانکہ مجھے ایسی تعلیم کے بہت سے
مواقع حاصل تھے شاید یہی وجہ ہو کہ میں انسانی زندگی کی براہِ راست
تباہی کی ذمہ داری سے بچا رہا لیکن جب تک میں حکومت کے کسی ایسے
نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہوں جو قوت پر مبنی ہو اور برضا و رغبت
اُن بہت سی آسانیوں اور حقوق سے بہرہ اندوز ہوتا ہوں جو اس نے
میرے لئے پیدا کر رکھے ہیں میں پابند ہو جاتا ہوں کہ جب حکومت کسی
جنگ میں مصروف ہو میں اس کی انتہائی امداد کردوں سوائے جبکہ میں اس
حکومت سے عدم تعاون کرلوں اور ان حقوق سے جو وہ مجھے پیش کرتی
ہے اپنی پوری قوت کیساتھ دستبردار ہو جاؤں
میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ میں کسی ایسے ادارہ کا رکن
ہوں جو چند ایکڑ زمین کا مالک ہے جس کی فصلوں کو بندروں سے فوری
خطرہ کا سامنا ہو رہا ہے۔ میں ہر قسم کی زندگی کے تقدس پر ایمان رکھتا

ہوں اور اس لئے میں اسے تعلیم اہنسا کی خلاف ورزی سمجھتا ہوں کہ میں بندروں کو کسی قسم کا ضرر پہونچاؤں لیکن فصلوں کو بچانے کی غرض سے میں بندروں پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے اور اس کی رہنمائی کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ میں اس برائی سے بچنا پسند کرونگا۔ میں اس سے یوں بچ سکتا ہوں کہ یا تو میں ادارہ کو چھوڑ دوں یا اسے توڑ دوں۔ میں ایسا نہیں کرتا اس لئے کہ مجھے ایسی سوسائٹی کے ملنے کی توقع نہیں ہے جہاں کچھ زراعت نہ ہو اور اسی بنا پر تھوڑی بہت زندگی کی تباہی کا خطرہ نہ ہو۔ اس لئے میں ڈرتے ہوئے اور کانپتے ہوئے عجز اور ندامت کا اظہار کرتے ہوئے بندروں کو ضرر پہونچانے میں شریک ہو جاتا ہوں اس امید میں کہ شاید کسی دن اس مشکل کا حل نکل آئے۔

انہی وجوہ سے میں نے تین لڑائیوں میں شرکت کی جس سوسائٹی سے میں متعلق ہوں اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتا اور ایسا کرنا میرے لئے پاگل پن ہوتا اور ان تینوں مواقع پر انگریزی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرنے کا میرے ذہن میں خیال تک نہ تھا۔ اس حکومت کے بارے میں میری پوزیشن آج کلیتاً مختلف ہے اور اس لئے میں اپنی مرضی سے اس کی لڑائیوں میں شرکت نہیں کروں گا۔ میں قید میں جانا اور پھانسی پر چڑھ جانا پسند کرونگا اگر مجھے اس کی جنگی کارروائیوں میں لڑنے یا کسی اور طریقہ سے شرکت کرنے کے لئے مجبور کیا گیا

لیکن معمہ اس سے بھی حل نہیں ہو جاتا۔ اگر ہندوستان میں قومی

حکومت موجود ہو اور میں ان اشخاص کی فوجی ٹریننگ میں جو اسے حاصل
کرنے کے خواہشمند ہیں کوئی براہ راست حصہ بھی نہ لوں تو بھی میں اسکی
مخالفت نہیں کرونگا اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے تمام افراد عدم
تشدد پر اس حد تک عقیدہ نہیں رکھتے جو میں رکھتا ہوں کسی شخص یا
سوسائٹی کو جبر کے ذریعہ عدم تشدد کا پیرو بنانا ممکن نہیں ہے

عدم تشدد نہایت مستعد طریقہ سے عمل کرتا ہے۔ بسا اوقات
ایک شخص کے اعمال کو عدم تشدد کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش بے کار
ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اس کے اعمال بظاہر تشدد کا
پہلو رکھتے ہیں جب کہ وہ اس کے اعلیٰ ترین مفہوم میں کلیتاً عدم تشدد
پر عامل ہوتا ہے اور بعد میں وہ اسی رنگ میں نظر آتا ہے۔ میں اپنے
طرز عمل کے لئے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ
مذکورہ بالا مثال میں میں نے عدم تشدد کے بہترین مفاد کو ملحوظ
رکھا تھا۔ اور اس میں کسی ادنیٰ قسم کے قومی یا دوسرے مفاد کا کوئی
دخل نہ تھا میں قومی یا کسی دوسرے مفاد کو قربان کرکے ترقی دینے کا
قائل نہیں ہوں

میں اپنے استدلال کو طول دینا نہیں چاہتا۔ انسانی خیالات
کو ظاہر کرنے کے لئے زبان محض ایک ناقص ذریعہ ہے۔ جہاں تک
میری ذات کا تعلق ہے عدم تشدد محض فلسفیانہ اصول نہیں ہے۔
یہ میری زندگی کا قانون اور سانس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں متعدد

مرتبہ ناکام رہتا ہوں، بعض اوقات جان بوجھ کر لیکن زیادہ تر بے جانے بوجھے۔ یہ معاملہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے تعلق رکھتا ہے حقیقی رہنمائی خدا تعالیٰ پر ہمیشہ ہمیشہ بھروسہ کرنے سے نہایت عاجزی اختیار کرنے سے اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے سے، قربان کرنے کی غرض سے ہمیشہ تیار رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اعلیٰ ترین درجہ کی بے خوفی اور جرأت کی ضرورت ہے

بلکہ میری اندرونی روشنی مستقل اور صاف ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے صداقت اور عدم تشدد کے بغیر کوئی مفر نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ غلط اور زبردست برائی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن اس کا خاتمہ ہوگا۔ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ جو آزادی خونریزی یا دھوکہ کے ذریعہ حاصل کی جائے گی وہ حقیقی آزادی نہ ہوگی۔ یہ بہتر ہے کہ وہ تمام اعمال جن کا الزام مجھ پر ہے، کلیتاً غیر حق بجانب ٹھہریں بہ نسبت اس کے کہ میرے کسی فعل سے عدم تشدد کو قربان کرنا پڑ جائے یا یہ کہ میری نسبت یہ خیال کیا جائے کہ میں تشدد یا عدم صداقت کا موید ہوں خواہ وہ کسی شکل یا حیثیت میں ہو۔ تشدد اور عدم صداقت نہیں بلکہ عدم تشدد اور سچائی ہی ہماری زندگی کا قانون ہے۔"

میں مزید تشریح پیش کرنے کی جرأت کرونگا جو خود انھوں نے پیش کی ہے اگرچہ دلائل ایک حد تک مشترک ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"میں بد دیانتی کیساتھ یقین کرتا تھا کہ باوجود ان بہت سی تکالیف کے

جن کے ماتحت میرا ملک ہندوستان اپنی زندگی بسر کر رہا تھا وہ فی الحقیقت آزادی کی جانب گامزن ہو رہا ہے اور یہ کہ بحیثیت مجموعی برطانوی حکومت عام نقطۂ نظر سے کلیتاً بری نہیں ہے، اور یہ کہ برطانوی افسران تنگ خیال اور کم عقل ہونے کے باوجود ایماندار ہیں۔ یہ خیال رکھتے ہوئے میں نے وہ کام کرنا شروع کر دیا جسے عند الحالات ایک عام انگریز انجام دیتا ہے۔ میں اتنا عقلمند یا طاقتور نہ تھا کہ کوئی الگ کارروائی عمل میں لاتا۔ یہ میرا کام نہ تھا کہ میں وزرا کے فیصلوں کو جو عدالتی سنجیدگی رکھتے ہیں، تولتا یا ان پر نکتہ چینی کرتا۔ میں نے جنگ بوئر، زولو بغاوت یا جنگ عظمیٰ کے وقت وزرا سے کسی عناد کو منسوب نہیں کیا ہے میں نے انگریزوں کو خصوصیت کیساتھ برا خیال نہیں کیا تھا اور نہ اب سمجھتا ہوں۔ اور نہ میں نے انہیں دوسرے انسانوں سے بدتر خیال کیا تھا۔ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں کی طرح بے غرضانہ جذبات اور اعمال کی اہلیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی وہ دوسروں کی طرح غلطیاں بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نے محسوس کیا کہ بہ حیثیت انسان اور شہری ہونے کے میں نے سلطنت کے سامنے اس کی ضرورت کے موقع پر خواہ وہ مقامی ہو یا عام اپنی عاجزانہ خدمات پیش کر کے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ سوراج کے زمانہ میں میں ہر ہندوستانی سے اسی طرز عمل کی توقع رکھوں گا۔ مجھے بہت دکھ ہوگا اگر ہر پیش آنے والے موقع پر ہم میں سے ہر ایک خود اپنے لئے قانون کی حیثیت اختیار

کرلے گا اور ہماری آیندہ ہونے والی قومی اسمبلی کے ہر فعل کو سنہری ترازو میں تولنے لگے گا۔ میں اکثر معاملات میں قومی نمایندوں کے فیصلوں کے روبرو سر تسلیم خم کر دونگا لیکن مذکورہ نمایندوں کا انتخاب کرتے وقت میں خاص طور پر احتیاط برتونگا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی اور طریقہ سے عام جمہوری حکومت ایکدن کیلئے بھی ممکن نہ ہو سکیگی

اب جہاں تک میرا تعلق ہے، تمام صورت حالات بدل گئی ہے میرا خیال ہے کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ تجربہ نے مجھے پہلے سے زیادہ عقلمند بنا دیا ہے۔ میں موجودہ نظام حکومت کو کلیتاً خراب خیال کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اسے ختم کر دینے یا اس کی اصلاح کرنے کی غرض سے تمام قوم خصوصیت کے ساتھ کوشش کرے۔ اس میں اپنی اصلاح کی ذرا سی بھی قابلیت موجود نہیں ہے۔ میرا یہ عقیدہ کہ بہت سے انگریز حکام ایماندار ہیں، میری امداد نہیں کرتا اس لیے کہ میں انہیں بھی اتنا ہی اندھا اور دھوکہ زدہ خیال کرتا ہوں جتنا کہ ایک زمانہ میں میں خود تھا۔ لہٰذا میں سلطنت کو اپنا تسلیم کرنے یا اپنے تئیں اس کا شہری بنانے میں فخر نہیں سمجھتا۔ برخلاف اس کے میں پورے طور پر اس امر کو محسوس کرتا ہوں کہ میں سلطنت میں اچھوت کا درجہ رکھتا ہوں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اس کی از سر نو مکمل تشکیل یا تباہی کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں، بعینہٖ جس طرح سے کہ ایک اچھوت ہندو مذہب یا ہندو سماج کے بارے میں اس طور پر دعا مانگنے میں پورے طور پر حق

بجانب ہوگا

دوسرے نکتہ یعنی اہمسا کا سمجھنا قدرے وقت طلب ہے۔ اہمسا کے بارے میں جو میرا تخیل ہے وہ مجھے ہمیشہ مائل کرتا ہے کہ میں اپنے آپ کو تقریباً ہر قسم کی جدّ وجہد سے جس میں میں آج کل مصروف عمل ہوں، جدا کرلوں۔ میری روح اس وقت تک مطمئن نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی ایک ظلم یا کسی ایک تکلیف کو بے بسی کے ساتھ دیکھتی رہے گی لیکن مجھ جیسے کمزور، نحیف الجثہ اور دکھ زدہ شخص کے لئے ممکن نہیں کہ میں ہر غلطی کی اصلاح کردوں یا اپنے آپ کو ہر برائی سے جسے میں دیکھتا ہوں بری الذمہ قرار دے لوں۔ میری اندرونی روح مجھے ایک طرف کو کھینچتی ہے اور میرا نفس مجھے بالکل اس کے مخالف سمت میں لیجاتا ہے۔ ان دونوں قوتوں کے عمل سے آزادی ممکن ہے لیکن وہ آزادی صرف تدریجی اور تکلیف دہ منازل کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ میں مشین کی طرح عمل کرنے سے انکار کرکے آزادی حاصل نہیں کرسکتا بلکہ بے غرضانہ طریقہ سے سمجھ کے ساتھ یہ کشمکش نفس کے لئے ایک مسلسل عقوبت کی شکل اختیار کرلیتی ہے تاکہ روح کلیتاً آزاد ہوسکے

میں پھر ایک معمولی شہری کی طرح تھا جو اپنے ہم جنسوں سے زیادہ عقلمند نہ تھا، میرا یقین تو اہمسا پر تھا اور باقیوں کا اس پر ذرا بھی اعتقاد نہ تھا بلکہ وہ حکومت کی امداد کرنے کے اپنے فرض سے انکاری تھے اس لئے کہ غصہ اور عناد اس کے محرک تھے۔ وہ اپنی جہالت اور کمزوری کی وجہ سے

انکار کر رہے تھے۔ ایک رفیق کار ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہو گیا تھا کہ میں صحیح راستہ پر انہیں لے آؤں۔ اس لئے میں نے انہیں بتایا کہ ان کا صریح فرض کیا ہے، ان کے سامنے اصول اہمسا کی تشریح کی اور انہیں اختیار دیا کہ وہ جو راستہ اختیار کرنا چاہیں، اختیار کر لیں جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اہمسا کے بارے میں میں اپنے طرز عمل پر تائب نہیں ہوں۔ اس لئے کہ سوراج کے ماتحت بھی میں ان لوگوں کو جو ایسا کرنے پر تیار ہوں گے، مشورہ دینے میں تامل نہ کرونگا اور اس طریقہ سے ملک کے لئے جنگ کرونگا"

جنگ کے بارے میں میں ان کے استدلال کو بحث میں لائے بغیر وہیں کا وہیں چھوڑ دینے پر مجبور ہوں۔ اس سے مجھے تو اطمینان نہیں ہوتا، لیکن ان کے تجربہ میں خود ان کی حقیقی روح کے ذریعہ آزمائش اور جانچ کر لی گئی ہے اور وہ ابھی تک اس میں کوئی خامی نہیں پاتے۔ جب کبھی میں نے کوشش کی میرے لئے اس معاملہ میں انہیں یقین دلانا ممکن نہ ہوا ٹھیک جس طرح سے میں "بدیشی کپڑوں کی ہولی" کے تشدد کے متعلق مابعد کے زمانہ میں انہیں قائل نہ کر سکا۔ ان کا دوسرا فعل جو اہمسا کے صحیح مفہوم کے مخالف تھا، ایک اور باب کا موضوع ہے اور اس لئے میں نے وہیں ان کے خیالات کو پیش کر دیا ہے

باب ہشتم

کھدّر کا اخلاقی پہلو

مہاتما گاندھی کو غریبوں اور مظلوموں کے ساتھ جو گہری محبت ہے، وہ ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے جب سے ان کے خیالات میں ٹالسٹائی کی تصانیف اور پہاڑی کے وعظ اور بھگوت گیتا کے مطالعہ سے عظیم الشان انقلاب برپا ہوا ہے، اس وقت سے زندگی بھر اُن کا تمامتر طرز عمل یہ رہا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ایسے اشخاص کیساتھ وابستہ کرلیا ہے جو "نہایت غریب ہیں، ادنیٰ ترین طبقہ سے متعلق ہیں اور گمراہ ہیں" وہ عملاً انہی کی سی زندگی بسر کرتے اور ان کی بدقسمتی میں حصّہ دار بننے کی آرزو رکھتے ہیں اور ان کی یہ دعا کہ وہ اچھوت کی حیثیت سے پیدا ہوں، محض خالی خولی جذبہ نہیں ہے بلکہ وہ ایسے شخص کی دلی تمنّا ہے جو خود صداقت اور حقانیت کی روح ہے

ساتھ ہی اُن کی فطرت عملی واقع ہوئی ہے اور وہ الفاظ کی بجائے کردار میں شاعری کرتے ہیں۔ تجارتی اور زراعتی جماعت کے فرد کی حیثیت سے جو ویش کے نام سے موسوم ہے، انہیں اپنی ذات کا جو ورثہ ملا ہے اس نے ان میں یہ عملی پہلو پیدا کر دیا ہے جو ایک تخیّل پسند مگر با اصول شخص کے

لیئے جیسا کہ مہاتما گاندھی ہیں، تقریباً ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے لیئے یہ امر کس قدر قدرتی ہے کہ وہ اپنے وطن کے غریب باشندوں کی امداد و اعانت کے لئے اپنے مذہب کے ضروری جزو کے طور پر ایک عملی اقتصادی پروگرام تیار کریں۔ کھدر[1] کا یہ اقتصادی پہلو اصول سدیشی اور مسئلہ اہمسا کی طرح ان کی اخلاقی مطابعت حاصل کر چکا ہے۔ بلاشبہ سدیشی، کھدر اور اہمسا، یہ تینوں چیزیں عجیب و غریب طریقہ سے ایک ہی میں مدغم ہو گئی ہیں اور وہ ان کے روشن دماغ میں دیہات کے ان کروڑہا باشندوں کی مصائب کا واحد عملی علاج پیش کرتی ہیں جو ہندوستان میں قحط و فاقہ کشی کے بین بین زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے بارہا اس امر کی تشریح کی ہے کہ کس طرح اصول سدیشی انسان کو مقامی حالات پر مطمئن و قانع بنا دیتا ہے اور ان چیزوں پر جو خدا نے انسان کی زندگی کے لئے مہیا کی ہیں بجائے اس کے وہ غیر ضروری سامان تعیش کے حصول کی غرض سے دوسرے ممالک کو بے دردانہ طریقہ سے لوٹے اور اس طرح سے اپنے اندرونی اقتصادی توازن کو کھو دے اور نزاع کی بنیاد رکھ دے۔ اسی طرح انھوں نے متعدد مواقع پر مجھے بتایا ہے کہ کس طرح سے کاتنے اور بننے کی توسیع

---

[1] مہاتما گاندھی کے نقطۂ نظر سے آر بی گریگ کی کتاب "اقتصادیات کھدر" جسے ایس گنیسن سے ٹرپلی کین (مدراس) سے شائع کیا ہے اس مسئلہ پر مستند کتاب ہے اور وہ اُن کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکی ہے

ہی ہندوستان میں تشدد کی اسپرٹ کو پھیلنے سے روکنے کا واحد علاج ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ دیہات کے باشندوں کے ہاتھ میں ایک ایسی صنعت آجاتی ہے جو انہیں ان کے اوقاتِ فرصت میں مصروف بھی رکھیگی اور انہیں دن بدن زیادہ خوشحال بنا دیگی۔ ان کی بنیادی جس جو انکی اپنی دیتیس ذات سے تعلق رکھتی ہے، یہ ہے کہ خدا مادّی چیزوں میں اور اقتصادی ضرورتوں کی تکمیل کے ذریعہ ملتا ہے اور یہ کہ فاقہ زدہ اشخاص کے روبرو خدا کی محبت کا وعظ کہنا اور ساتھ ہی ان کی حالت کی درستگی سے غفلت برتنا خود خدائے برتر کی توہین کرنا ہے

کھدر کے پروگرام کی جو تشریح خود انھوں نے فرمائی ہے وہ اس قدر جامع ہے کہ اسکے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ رقمطراز ہیں:۔ اُس امر کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے کہ گھر میں کاتنے کی تحریک کا مفہوم کیا ہے، سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کے مفہوم میں کیا کیا باتیں داخل نہیں ہیں۔ مثلاً ہاتھ سے کاتنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی موجودہ صنعت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اس غرض سے کہ بالآخر اس کی جگہ لیلے، اُس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے کامی شخص کو جو اور طریقہ سے اپنے کام سے زیادہ روپیہ پیدا کر سکتا ہے، اس کام سے ہٹا دے۔ لہٰذا اس معاوضہ کا جو کاتنے سے حاصل ہو سکتا ہے، ایسی آمدنی سے مقابلہ کرنا جو کسی دوسرے کام سے مل سکتی ہو اور اس طرح سے اس کی اقتصادی اہمیت کو روپیہ پیسہ کی شکل میں تولنا صرف غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہاتھ سے کاتنا اس امر کا

دعویدار نہیں ہے کہ وہ مالدار بنا سکتا ہے۔ جو واحد دعویٰ اس کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ صرف وہی ہندوستان کے سب سے بڑے مسئلہ کا فوری عملی اور مستقل حل پیش کرتا ہے، یعنی سال بھر میں چھ مہینے کی اس مجبور بیکاری کا جس میں ہندوستان کی آبادی کی بہت بڑی تعداد کسی ایسے مناسب مشغلہ کے نہ ہونے کے سبب جس سے زراعت کو امداد ملے، مبتلا ہے اور عامۃ الناس کی اس مزمّن فاقہ کشی کا جو اس کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں چرخہ کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی اس لئے کہ جو معاوضہ اس سے ملتا ہے وہ مقابلتاً بہت قلیل ہے بشرطیکہ یہ دونوں وجوہ موجود نہ ہوتے۔ لہٰذا کاتنے کی اقتصادی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھنے کی غرض سے ضروری ہے کہ اہالیان ہندوستان کے تقریباً ناقابلِ یقین افلاس پر بھی غور کر لیا جائے اور نیز اس کے اسباب پر اس لئے کہ علاج یہی ہے کہ اسباب کو دور کر دیا جائے

ہندوستان کی تمام بڑی بڑی ملکی صنعتوں کی بتدریج تباہی بغیر اس کے کہ ان کی جگہ لینے کے لئے نئی صنعتیں پیدا ہوں، ملک کا استقلال کے ساتھ زراعتی بننے کا میلان، مویشیوں کے موجودہ ذخیرہ کا جسمانی انحطاط، خشک سالیاں اور قحط جو یکے بعد دیگرے بسرعت تمام ملک پر نازل ہو رہے ہیں، کسان کا روز افزوں نکبت و افلاس جو اسے اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی اور منقسم اراضی کے ٹکڑوں میں کسی قسم کی ترقی عمل میں لا سکے جو اپنی باری سے اس قابل نہیں کہ زراعت کے جدید آلات اور ترقی

یافتہ طریقوں کے لئے موزوں میدان بہم پہونچائیں، مہاجنوں اور روپیہ قرض دینے والی ایجنسیوں کی زراعت پر نگرانی جس کی وجہ سے کسان روپئی پر اپنی توجہ کو مرکوز کردیتا ہے اور اشیائے خورد و نوش کی گرانی کی خرابی میں مزید اضافہ کا باعث ہوتا ہے؛ یہ سب اور بہت سے دیگر امور نے افلاس اور بیکاری کو آج سب سے عظیم الشان مسئلہ بنا دیا ہے

انیسویں صدی کے پہلے ربع میں ڈاکٹر بکانن[1] اور مانٹگمری مارٹن[2] نے شمالی ہندوستان کے جو سروے کئے ہیں وہ اس امر کی بلیغ شہادت ہیں کہ دیہات اور شہر نہایت فارغ البالی کی حالت میں تھے، نیز اس امر کی کہ ہر شہر اور گاؤں میں ایک رضا کارانہ نظام تھا جو کروڑہا کاتنے والوں اور لکھوکھا بننے والوں اور ہزارہا رنگریزوں، رنگ دھونیوالوں، بڑھیئوں، لوہاروں اور چھوٹے چھوٹے دستکاروں کو تمام سال ہر ضلع میں مصروفِ کار رکھتا تھا اور کروڑہا روپے پیدا کراتا تھا اور پھر انہیں بہار، بنگال، یوپی، اور میسور میں نہایت نصفت شعاری کے ساتھ تقسیم کردیتا تھا۔ اگر اُس اختلاف کو دکھانے کے لئے کسی سرکاری شہادت کی ضرورت ہو جو آج کل کے اور اس زمانہ کے ہندوستان کی حالت میں میں پایا جاتا ہے تو مردم شماری کی رپورٹیں کافی سے زیادہ سامان بہم پہونچا سکتی ہیں۔ بڑے بڑے صوبوں میں کسان کی مقبوضہ اراضی کا اوسط رقبہ آج تقریباً تین ایکڑ پھیلتا ہے، سوائے بمبئی اور شمال مغربی

[1] Dr Buchanan [2] Montgomery Martin

صوبہ اور پنجاب کے جہاں اوسط تقریباً ساڑھے دس ایکڑ ہے

انہی فلاش اور افلاس زدہ اراضیات پر ہندوستان کی تمام آبادی کا ۷۲ فیصدی حصہ بظاہر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے مردم شماری کی ایک رپورٹ میں درج ہے؟ اس میں نہ تو کام کرنے والے کی پوری طاقت کام میں آتی ہے اور نہ زمین پورے طور پر بارآور ہوتی ہے" مسٹر ٹامسن[1] (بنگال کی مردم شماری) رقمطراز ہیں: "برطانوی بنگال میں ... زراعت کا کام کرنے والے اشخاص کی حقیقی تعداد ۱۱۰۶۰۶۲۹ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر کام کرنے والے کے حصہ میں ۲/۲ ایکڑ زمین آتی ہے۔ اسی قسم کے اعداد میں کاشتکار کی مفلسی کی تشریح مضمر ہے۔ سوا دو ایکڑ سے کم اراضی کی کاشت ایک شخص کو سال بھر میں صرف چند دن سے زیادہ کے لئے مصروف نہیں رکھ سکتی۔ کاشتکار چند دن تک ذرا زیادہ محنت کرتا ہے جبکہ اسے زمین میں ہل چلانا پڑتا ہے اور بیج بونا پڑتا ہے اور دوبارہ جب اسے فصل کاٹنی پڑتی ہے لیکن سال کے زیادہ حصہ میں اس کے پاس یا تو کام بالکل نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم"

مسٹر ایڈی[2] (صوبجات متحدہ کی مردم شماری) صوبہ کے کسان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "چھوٹے چھوٹے وقفوں کے لئے اس کے پاس بہت کام ہے اور ..... سال کے باقیماندہ ایام میں وہ تقریباً بیکار سا رہتا ہے۔ عدم جد وجہد کے یہ اوقات بے کاری میں کٹتے ہیں۔

[1] THOMPSON
[2] EDYE

اسی طرح مسٹر ہاڈن[1] (صوبجات متوسط کی مردم شماری) لکھتے ہیں: خریف کی فصل ہی جو برسات کے آخر میں بوئی جاتی ہے، ایک بڑی فصل ہے جو پیدا کی جاتی ہے اور جب یہ فصل کاٹ لی جاتی ہے تو اس کے بعد سے کام کی کمی ہو جاتی ہے جو اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ دوسرا موسم برسات شروع نہ ہو جائے۔ مسٹر کیلورٹ[2] اپنی کتاب "ویلتھ اینڈ ویلفئر آف دی پنجاب"[3] (پنجاب کی دولت اور بہبودی) میں یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اوسط درجہ کا کسان جو کام کرتا ہے وہ بارہ مہینے میں ۱۵۰ دن کی محنت سے زیادہ کا نہیں ہوتا، جب ایک ایسے صوبہ کی جہاں مقبوضہ اراضی کا اوسط رقبہ مقابلتاً بہت زیادہ ہے (۱۸ و ۱۹ ایکڑ) اور جہاں مزروعہ زمین کا فیصدی رقبہ (جو خشک علاقہ جات کے مقابلہ میں کسان کو بہتر طریقہ سے مصروف رکھتا ہے) ہندوستان میں دوسرے درجہ پر ہے، صورت حالات یہ ہو تو دوسرے صوبوں کی حالت کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تمام سرکاری افسران اس نکتہ پر متفق الرائے ہیں کہ تمام زراعتی آبادی سال بھر میں کم سے کم چھ مہینے تک بیکار رہتی ہے، اور ایک دو نے تو اس امر واقعی کی طرف خصوصیت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کسان کے نکبت و افلاس کا واحد سبب یہی بیکاری ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ خود لنکا شائر میں جہاں ہر کسان کے حصہ میں ۲۱ ایکڑ[4] اراضی آتی ہے۔ یہ خیال کیا

---

[2] CALVERT

جاتا ہے کہ یہ بہت ہی بڑے فائدہ کی بات ہوگی اگر خراب موسم میں اور جاڑے کے زمانہ میں کسانوں کو اپنے اپنے گھروں میں نفع دینے والا کوئی کام کرنے کو ملجائے جیسا کہ قدیم زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ ۱؎ اور اٹلی میں جس کے یہاں خود کپڑے کی زبردست تجارت ہے، تقریباً ہر ضلع کی جہاں بلبری کے درخت بوئے جاسکتے ہیں، کسان عورتیں کاتنے میں پورے طور پر مشغول رہتی ہیں۔ ۲؎ کسی ایسی ضمنی گھریلو صنعت کی اہمیت جس کا تعلق ہندوستان جیسے وسیع رقبہ رکھنے والے ملک میں زراعت سے ہو کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں ہوسکتی

لیکن یہ سوال کہ وہ ضمنی صنعت کونسی ہو، بہت کچھ بحث ومباحثہ کا مرکز بن گیا ہے۔ جب سے اور صرف جب سے گھروں میں کاتنے کی تحریک شروع ہوئی ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ حضرات نقاد اس امر کو تسلیم کرلیں گے کہ چرخہ ہی وہ چیز تھی جس نے سب سے پہلے انہیں غور وفکر کی دعوت دی۔ جب ایک مرتبہ وہ یہ تسلیم کرلیں گے تو پھر ان کی خدمت میں عرض کیا جاسکتا ہے کہ چرخہ فورڈ کے موٹر کار کی طرح سے کوئی ایجاد نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ہی چیز کی دوبارہ دریافت ہے بعینہ جس طرح سے کہ گم شدہ بچہ دوبارہ اپنی ماں کو پالے۔ نقاد کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ بچہ سے مراد یہاں پر لوگوں کی ایک وسیع جماعت ہے جو دنیا

۱؎ انگلستان کی دیہی مصنوعات ۔ مصنفہ گرین

۲؎ بمبئی کے مالکانِ مل کا بیان جو ٹیرف بورڈ کے روبرو دیا گیا

کا نہایت قدامت پسند طبقہ ہے اور جو ایک ہزار نو سو میل لمبے اور
ایک ہزار پانچسو میل چوڑے براعظم پر پھیلا ہوا ہے اور وہاں سے وہ صنعت
مراد ہے جس نے انہیں حرارت اور زندگی بخشی
ایک مرتبہ یہ حقیقت سمجھ میں آجانے کے بعد کوئی شخص بھی سنجیدگی
کیساتھ کسی دوسری صنعت کو مقابلہ میں پیش نہیں کرسکیگا۔ صنعتیں بہت
سی ہیں اور ان کے لئے وقت بھی نکالا جا سکتا ہے۔ آپ ڈیریاں قائم کرنے
کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کوئی ڈنمارک تو
نہیں ہے جس کے قبضہ میں انگلستان کی مکھن کی تجارت کا ۹۰ فی صدی حصہ آسانی
سے آگیا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ڈنمارک کو مکھن کی تجارت کے لئے تقریباً ۱۲ کروڑ
روپیہ ملا تھا اور تقریباً ۴۵ لاکھ سور کے گوشت کے لئے، اس لئے کہ سوروں
کی افزائش نسل بھی ڈیری کی صنعت کی ایک اہم شاخ ہے لیکن ہندوستان
کوئی ایسا بڑا ہندوستان معلوم نہیں کرسکتا جو اسکی ڈیری کی پیداوار کو
کو خرید لے اور کوئی شخص ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہندوستان سے یہ بات
نہیں کہہ سکتا کہ وہ سوروں کی کھالوں کی پکانے کی صنعت کو اختیار کرلے
پالتو جانوروں کی پرورش اور شہد کی مکھیوں کی افزائش نسل کو بھی اسی
سبب سے مسترد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ انہیں انکی جدت اور ان کے ضروری
ٹیکنیکل ہنر کی بنا پر مسترد نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہندوستان آج بھی اپنی زراعت
کو ترقی نہیں دے سکتا اور فی کس ایک ایکڑ کے حساب سے اپنی اراضی میں اضافہ
نہیں کرسکتا جس کے کرنے کی اس میں مقدرت ہے کیونکہ ہندوستان آئرلینڈ

نہیں ہے جہاں کے حیرت انگیز محکمۂ زراعت نے بیشمار کالج کھول رکھے ہیں اور بیشمار ماہرین کی خدمات کو کاؤنٹی کونسلوں کی سپردگی میں دے رکھا ہے۔ اور نہ کوئی شخص یہ تجویز پیش کریگا کہ باشندوں کی وسیع تعداد موزہ بافی یا بید کے کام یا ٹوکرے بنانے کے کام میں مصروف ہو سکتی ہے۔ یہ چیزیں سوت کی طرح سے فوراً نہیں بک سکتیں اور نہ انہیں مستقل منڈی مل سکتی ہے۔ آج بھی بنگال اور مدراس کے بعض حصوں میں سوت کی پرانی وضع کی منڈیاں جاری ہیں۔ ایک بنگالی سویلین نے غیر شعوری مذاق کیساتھ یہ تجویز پیش کی ہے کہ بنگال کے سن کے رقبوں میں سن کی ملیں کیوں نہیں قائم کی جائیں۔ غالباً انہیں تعجب ہوگا کہ کیوں اُن کے سویلین رفقا میں کوئی یہ تجویز پیش نہیں کرتا کہ کیوں نہ روئی کے رقبوں میں کپڑے کی مزید ملیں قائم کیجائیں وہ شاید اس امر کو فراموش کرگئے ہیں کہ آج سن کی ملوں میں ۲۵۰,۰۰۰ سے زیادہ مزدور ملازم نہیں ہیں اور جہاں وہ سن پیدا کرنے والے کو غریب کر رہی ہیں وہاں وہ چند سرمایہ داروں اور دلالوں کو موٹا بنا رہی ہیں۔ کپڑے کی صنعت کے ۷۰ سال بعد بھی اور ۵۰ کروڑ کا سرمایہ رکھتے ہوئے بھی کپڑے کی تجارت کے ملک التجار[1] صرف یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ فقط پندرہ لاکھ آدمیوں کی روزی کا انتظام کرنے کے قابل ہوئے ہیں یعنی صرف ۳۷۰,۰۰۰ مزدوروں کے خاندان کے لئے جو ان کی ملازمت میں ہیں اور چند کلرکوں اور اعلیٰ اسٹاف کے لئے

[1] بمبئی کے مالکانِ مل کا بیان جو ٹیرف بورڈ کے سامنے دیا گیا

لیکن اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کاتنے کی بہت ہی حقیر مزدوری ملتی ہے اور اس طرح سے یہ ایک قسم کا اقتصادی زیاں ہے۔ یہ امر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ کاتنے کو اصل پیشہ کی حیثیت سے کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ یہ صرف ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے جو بصورت دیگر بیکاری میں اپنا وقت ضائع کرتے۔ یہ امر کہ آیا دو آنے یومیہ یا یوں کہو کہ ایک آنہ یومیہ یا ۲۴ روپیہ سال ایک حقیر اجرت[1] ہے، ایک ایسا معاملہ ہے جس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جس نے عام باشندوں کا انتہائی نکبت وافلاس کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ ہندوستان کی فی کس آمدنی پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ انڈین اکونومک انکوائری کمیٹی نے تقریباً پندرہ مستند اشخاص کے اندازوں کو نقل کیا ہے جو مختلف وقتوں میں کئے گئے[2] تھے۔ جب سے دادا بھائی نوروزجی نے اس سنہری ہرنی کا تعاقب کرنا شروع کیا ہے، اس وقت سے اور بھی بہت سے اشخاص نے انکی پیروی کی ہے لیکن اب تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہرنی اس کے ہاتھ آگئی ہے لیکن اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو تخمینہ بتایا گیا ہے وہ صحیح تخمینہ سے صرف بُعد کا تعلق رکھتا ہے، مثلاً مسٹر فنلے شیرس[3] کا تخمینہ ۱۱۶ روپیہ ہے تو بھی میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا ۲۴ روپیے کا اضافہ معقول اضافہ متصور نہیں ہوگا؟

---

[1] بمبئی کے مالکانِ مل کا بیان جو ٹیرف بورڈ کے سامنے دیا گیا

[2] یعنی یہ معلوم کرنا کہ ہندوستان کی تمام آبادی کی فی کس آمدنی کسقدر ہے

[3] FINLAY SHIRRAS

ہاتھ سے کاتنے میں جو مخصوص فوائد مضمر ہیں وہ ہندوستان کی موجودہ
اقتصادی مصیبت کے واحد علاج کی حیثیت سے اسے موزوں ترین اور
مناسب ترین چیز بنا دیتے ہیں :۔

ا۔ وہ بیحد عملی چیز ہے کیونکہ ۔

(الف) اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے نہ تو کسی سرمایہ کی
ضرورت ہوتی ہے اور نہ قیمتی آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔
خام جنس اور اسے کام میں لانے کے آلات سستے اور
مقامی طور پر مل جاتے ہیں

(ب) اس کے لئے اس سے زیادہ ہنر یا عقل کی ضرورت
نہیں پڑتی جتنی کہ ہندوستان کے جاہل اور مفلوک الحال
باشندے رکھتے ہیں۔

(ج) اس کے لئے اتنی کم جسمانی مشقت کی ضرورت پڑتی ہے
کہ چھوٹے بچے بھی اور بوڑھے آدمی بھی اُسے چلا سکتے ہیں،
اور اس طریق پر خاندانی سرمایہ بڑھانے میں حصہ رسدی
کام کر سکتے ہیں

(د) اس کے لئے اس امر کی ضرورت نہیں کہ اسے از سرِ نو رواج
دینے کے لئے راستہ ہموار کیا جائے، اس لئے کہ ابھی تک
لوگوں میں کاتنے کی روایت زندہ ہے

۲۔ یہ ایک عام اور مستقل شے ہے اس لئے کہ خوراک کے بعد سوت

ہی ایسی چیز ہے جو مزدور کے گھر ہی پر غیر محدود اور فوری طریقہ سے فروخت ہو جانے کی یقینی قابلیت رکھتی ہے۔ اور اس طرح سے نکبت زدہ کسان کی آمدنی کو مستقل اور باقاعدہ بنا دیتی ہے

۳۔ برسات کے حالات اس پر اثر انداز نہیں ہوتے اور قحط کے ایام میں بھی اسے جاری رکھا جا سکتا ہے

۴۔ یہ لوگوں کے مذہبی یا معاشرتی محسوسات کے مخالف نہیں ہے

۵۔ یہ قحط کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ایک مکمل اور تیار ذریعہ ہے

۶۔ یہ کسان کی جھونپڑی میں کام کو پہونچا آتا ہے اور اس طرح سے اقتصادی تباہی کے حالات کے ماتحت بھی خاندان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے روکتا ہے

۷۔ یہی ایک قوت ہے جو ہندوستان کی دیہی باشندوں کے مفاد کو ایک حد تک پھر بحال کر سکتی ہے جو اب تباہی کے قریب آن لگے ہیں

۸۔ یہ چیز جلاہے کے لئے اور کسان کے لئے ایکساں طریقہ سے مفید ہے اس لئے کہ ہاتھ سے بننے کی صنعت کے لئے یہی ایک مستقل اور پائدار بنیاد بہم پہونچاتی ہے، جو فی الحال اسّی لاکھ سے ایک کروڑ آدمیوں کی روزی کا سہارا بنی ہوئی ہے اور ہندوستان کی پوشیدنی ضروریات کے تقریباً ایک

ثلث کو پورا کرتی ہے لیکن زیادہ تر ملوں کا کتا ہوا سوت استعمال کرتی ہے

۹۔ اس کے احیاء سے بہت سی اہم اور متعلقہ دیہی مشاغل کو ترقی و تحریک ملے گی۔ اور اس طرح سے دیہات زوال کی اس حالت سے بچ جائینگے جس میں وہ پڑ چکے ہیں

۱۰۔ یہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم ہندوستان کے کروڑہا اشخاص میں دولت کی مساوی تقسیم کو عمل میں لاسکتے ہیں

۱۱۔ صرف وہی موثر طریقہ پر بیکاری کے مسئلہ کو حل کرتا ہے نہ صرف کسانوں کی جزوی بیکاری کو بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کو بھی جو کام کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کام کی عظیم الشان وسعت متقاضی ہے کہ ملک کی تمام ذہنی قوتوں کو تحریک کی رہنمائی اور ہدایت کی غرض سے مجتمع کر دیا جائے

اب ہم غور کریں گے کہ تحریک چرخہ کی جانب سے جن دعاوی کو پیش کیا گیا ہے ان کی تکمیل کہاں تک ہوئی ہے۔ تحریک چرخہ ۱۹۲۰ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس کے اہم پہلو درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ **نظام**۔ ابتدائی متفرق اور منتشر کوششوں کی بجائے اب ہمارے پاس ایک باقاعدہ نظام ہے جس کی شاخیں ہر صوبہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کے پاس ۱۵ لاکھ روپے کا سرمایہ موجود ہے۔ یہ نظام سرمایہ جمع کرتا ہے اور قرضہ جات تقسیم کرتا ہے، جتنا کھدر تیار ہوتا ہے اور فروخت ہوتا ہے،

اور قرضہ جات تقسیم کرتا ہے، جتنا کھدّر تیار ہوتا ہے اور فروخت ہوتا ہے اس کی ماہ بماہ رپورٹیں شائع کرتا ہے اور ہر قسم کی قیمتی معلومات بھی جمع کرتا ہے، چرخہ، دھنکی اور سانچہ کو بہتر بنانے کی غرض سے اور انہیں ہر دلعزیز بنانے کی غرض سے تجربے کرتا ہے۔ رضاکارانہ طریقہ سے جو لوگ سوت تیار کرتے ہیں، ان سے سوت لیتا ہے، اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کرتا ہے اور سوت اور کپڑے کو بہتر بنانے کی غرض سے مختلف پیدا کنندہ مرکزوں کو ہدایات جاری کرتا ہے، کام کرنے والوں کو تمام ٹکنیکل عملوں کی روئی توڑنے سے لے کر کپڑا بننے اور رنگنے اور اسے منڈی میں بھیجنے کے قابل بنانے تک اور ساتھ ہی وہ کھادی کی فروخت کا بھی انتظام کرتا ہے

۲ ـــ کام ـ آل انڈیا اسپینرز ایسوسی ایشن کے عملی کام کو چند عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:ـ

(الف) پیداوار کے اعداد کا تعلق صرف اسی کام سے ہے جو بورڈ کی زیر نگرانی کیا جاتا ہے۔ ان میں وہ پیداوار شامل نہیں ہے جو تحریک چرخہ سے بالکل الگ آسام، راجپوتانہ، پنجاب اور مدراس کے بعض حصص میں روایتاً موجود ہے

سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں پیداوار کے اعداد سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء کے اعداد ۹۰۳۰۳۴ روپیہ کے مقابلہ میں ۹۴۹۳۴۸ روپیہ تھے سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سال کے مقابلہ میں بہت زیادہ بیشی

ہوئی ہے۔ فروخت کے اعداد دینے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ وہ تو پیداوار کو ظاہر کرتے ہیں لیکن جتنا کھدّر بنایا گیا ہے وہ عملاً سارے کا سارا فروخت ہوگیا ہے۔ ۴۳۰۳۰۹ اروپے کے کپڑے کے معنی ۳۸۰۶۰۶۸ گز کپڑے کے ہیں (گز کی اوسط قیمت ۸ر آنے لگائی گئی ہے) جس کے معنی یہ ہیں کہ ۷۲۴۲۲۵ اپونڈ سوت استعمال ہوا۔ یہ نتیجہ ہے دو سال کی مجتمع محنت کا۔ ایسی تحریک میں جو صرف پانچ سال پہلے شروع کیگئی تھی

(ب) سوت اور کپڑے کو بہتر بنانے اور صرفہ اور قیمت میں کمی کرنے کے مسائل پر ایک ساتھ غور کیا جا سکتا ہے

پانچ سال قبل نہ صرف مدراس میں بلکہ بہار اور بنگال میں نفیس قسم کا سوت تقریباً ناپید تھا لیکن اب دونوں صوبے اسے پیدا کرتے ہیں۔ معمولی سوت کو دن بدن ایکساں معیار پر لایا جا رہا ہے۔ ۱۵سے لیکر ۲۰ نمبر تک کا سوت سوائے گجرات کے بالعموم ہر جگہ کاتا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ سوت کو کلیتاً مکمل کرنے کے قابل ہوگئے ہیں بلکہ یہ کہ ناقص سوت کو اب ایک عارضی چیز سمجھا جا سکتا ہے۔ کھدّر کے تمام ڈپو اس سوت کی جانچ کرتے ہیں جو انہیں حاصل ہوتا ہے اور انھوں نے عملاً فیصلہ کر لیا ہے کہ کم درجہ کے سوت کو قبول نہ کیا جائے

(ج) قیمتیں — موثر لامرکزیت اور مختلف عملوں کا اجتماع ہاتھ سے کاتنے کی اقتصادیات کی کنجی ہیں بعینہٖ جس طرح سے مرکزیت اور مختلف عملوں کی تقسیم وسیع پیمانہ کی پیداوار کا قانون ہے۔ اس طرح گجرات میں

جہاں بنولوں کو روئی سے جدا کرنے، دھننے اور کاتنے کے کاموں کو مختلف اشخاص انجام دیتے ہیں، سوت کی پیداوار کی لاگت فی پونڈ نو آنے ساڑھے چار پائی تھی، ترپور میں جہاں کاتنے والا خود ہی روئی کو دھنتا بھی ہے لاگت چھ آنے ساڑھے دس پائی تھی، بنگال میں جہاں بنولوں کو الگ کرنے اور دھننے کا کام کاتنے والے کی طرف سے کیا جاتا ہے، لاگت ساڑھے پانچ آنے آئی تھی

اس سلسلہ میں جو کوششیں عمل میں آئی ہیں۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سوائے گجرات کے باقی تمام صوبوں میں پیدا کرنے کے صرفہ میں حیرت انگیز طریقہ سے کمی آگئی ہے۔ مدراس میں اور پنجاب میں لاگت اور قیمت میں آج ۵۰ فی صدی کی کمی ہوگئی ہے، بہ مقابلہ ۱۹۲۰ء کی حالت کے اور ۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں ۲۵ فی صدی کی کمی ہوگئی ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قیمت میں ۵۰ فی صدی کی کمی درحقیقت ۱۰۰ فی صدی کی کمی کے مترادف ہے اس لئے کہ پانچ سال قبل کی حالت کے مقابلہ میں کپڑے کی حالت ۵۰ فی صدی بہتر ہوگئی ہے، اگرچہ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ کمی ایک حد تک اس وجہ سے بھی ہوئی ہے کہ گذشتہ دو سال میں روئی کی قیمت گر گئی ہے

(د) روئی سے کھدر کے اقتصادیات کی نشو و نما میں آخری منزل پر ہم اس وقت پہونچتے ہیں جبکہ کاتنے والا نہ صرف یہ کہ تمام ابتدائی عمل خود انجام دے لیتا ہے بلکہ خود اپنی روئی کا ذخیرہ رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ گذشتہ سال کاٹھیاواڑ میں یہ عمل حیرت افزا نتائج کا باعث ہوا تھا۔ ان کے پاس

نہ صرف یہ کہ اچھی روئی تھی بلکہ انھوں نے بہت سی روئی ضائع ہونے سے بچالی تھی اور سوت بھی بہتر قسم کا پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ فی الحال روئی کی ساری فصل پر دلالوں یا مالکان مل کے دوکانداروں کا قبضہ ہے جو فصل کا بہترین حصہ لے جاتے ہیں اور صرف خراب وضع کی روئی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں جو زیادہ تر ایسی روئی ہوتی ہے جسے ہاتھ سے کاتنے والے اشخاص استعمال کرتے ہیں اور سوت کے خراب ہونے کی تشریح اس ایک حقیقت سے ہو جاتی ہے۔ جب ہاتھ سے کاتنے والا مزارع اپنے مفاد کو بہتر طریقہ سے سمجھنے لگیگا جیسا کہ اسے جلد سے جلد سمجھنا چاہیے تو وہ خود بخود اپنی روئی کو ذخیرہ رکھے گا اور ذاتی استعمال کے لیے نہ کہ اجرت کی خاطر روئی کاتنی شروع کر دیگا

۳ — قحط کے علاقے — اس بات کو اختصار کیساتھ پیش کرنا مشکل ہے کہ قحط کے رقبہ جات میں چرخہ کو امدادی کارروائی کے طور پر کس طرح سے اختیار کیا گیا۔ بعض لوگ کہیں گے کہ چرخہ کے زمانہ میں بھی قحط رونما ہوئے۔ بلاشبہ وہ واقع ہوئے لیکن اس کثرت کے ساتھ نہیں جس کثرت سے وہ ۱۸۶۲ء سے رونما ہو رہے ہیں۔ اس تاریخ کے بعد سے قحط کے کئی ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہو چکے ہیں جنھوں نے صرف سرکاری امداد کی حقیقی مشکل پر زور دیا ہے۔ جو اشخاص قحط کے عادی نہیں ہیں، وہ امداد کرنے میں متامل ہیں اور جو لوگ قحط کے عادی ہیں وہ امداد قبول کرنے کے شائق رہتے ہیں۔ جب خاندان ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتے ہیں اور نیم فاقہ کش

جماعتیں ایک متحرک مجمع کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، اس وقت اخلاقی انحطاط کا آغاز ہوتا ہے۔ سر ایڈورڈ کیرڈ[1] نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہی نظام کا قیام ہی انضباط کے ذریعہ جان بچانے کا واحد ذریعہ ہے؛ اور یہ کسی اور ترکیب سے قائم نہیں رکھا جا سکتا خصوصاً کہ اس امر سے کہ قحط زدہ اشخاص کے دروازے تک امداد حاصل کرنے کے ذریعہ یعنی چرخہ کو لے جایا جائے۔ یہی وہ کام ہے جسے کم عمر والے اور زیادہ عمر والے، کمزور اور بیمار دن رات اور بغیر کسی تکلیف کے انجام دے سکتے ہیں

ڈاکٹر پی، سی، رے نے ۲۴-۱۹۲۳ء میں مغربی بنگال کے سیلاب زدہ اور قحط زدہ علاقوں میں پہلے پہل دھان کا چھلکا اتارنے اور امداد پہنچانے کی دوسری صورتوں کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے معلوم کیا کہ وہ بیکار ہیں اور اس کے بعد انھوں نے چرخہ کی آزمائش کی جس نے باحسن وجوہ کام دیا۔ جس بات کو نمایاں کامیابی کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ چرخہ نے ان رقبوں میں اپنا گھر کر لیا ہے اور اس نے وہاں کے باشندوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنی معمولی آمدنی میں اضافہ کر سکیں اور فصلوں کی خرابی اور سیلابوں کا بہ نسبت پہلے کے زیادہ موثر طریقہ سے مقابلہ کر سکیں

اب تک ہم نے اس کام پر غور کیا ہے جو حاصل کیا جا چکا ہے، وہ کام بجائے خود مستقبل کے امکانات کا بہترین وعدہ ہے۔ لیکن یہ بات کہی جاتی

[1] SIR EDWARD CAIRD

ہے کہ ہم مشین کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابلہ کو پیش نظر نہیں رکھ رہے ہیں۔ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ گھر کے بنے ہوئے اور مشین کے بنے ہوئے کپڑے میں کوئی مقابلہ ہے؟ ملوں اور ملوں میں مقابلہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً غیر ملکی ملوں میں اور ملکی ملوں میں یا اُن ملوں میں جو انجن کے ذریعہ یا بجلی کی طاقت سے چلائی جاتی ہیں لیکن ایک ایسی صنعت میں جو زندگی بخش ہے اور دوسری میں جو بالکل زندگی بخش نہیں ہے، مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے یا کیوں ہونا چاہیئے؟

ہم اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کریں گے۔ زمانہ کی اشد ضروریات میں ایک ضرورت یہ ہے کہ لکھوکھا کسانوں کو اقتصادی مصیبت سے نجات دلائی جائے یعنی زراعتی جماعتوں کی جزوی بے کاری کو دور کر دیا جائے چرخہ ہی وہ صنعت ہے جو ایسی امداد اور ایسا کام بہم پہونچا سکتا ہے۔ پچاس کروڑ کا جو سرمایہ ملوں میں لگا ہوا ہے وہ صرف ۱۵ لاکھ اشخاص کے لئے روزی بہم پہونچا سکتا ہے یعنی ۳۷۰۰۰۰ لاکھ مزدوروں کے خاندانوں کے لئے جو زیادہ تر زراعتی جماعتوں سے لئے جاتے ہیں۔ اب یہ فرض کرتے ہوئے کہ ملوں کی صنعت اتنی پھیل جائے کہ وہ اتنا کپڑا بہم پہونچانے لگ جائے جتنا ہندوستان میں کھپتا ہے تو کیا جہاں تک لکھوکھا فاقہ زدہ اشخاص کا تعلق ہے صورتِ حالات بہتر ہو جائے گی؟ آئیے دیکھئے ہمارے ملک میں آج کپڑے کی کھپت ۴۶۱۰ ملین گز ہے۔ اتنی مقدار پیدا کرنے کی غرض سے تقریباً ۱۰۶۵ ملین پونڈ سوت کی ضرورت پڑے گی۔

۱۶۵ الین پونڈ کے سوت کے لئے ۱۱ الین تکلوں کی ضرورت پڑیگی اور سوت کو کپڑے کی شکل میں تبدیل کرنے کی غرض سے ۲۱۵۶۵۵ ساپنچوں کی ان ۱۱ الین تکلوں اور ۲۱۵۶۵۵ ساپنچوں کو چلانے کے لئے سرسری اندازہ کے مطابق ۶ لاکھ مزدوروں کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس صنعت سے زیادہ سے زیادہ ۲۵ لاکھ آدمیوں کی روزی کا سہارا ہوسکیگا اور یہ لوگ وہ ہیں جن کی خدمات سے زراعت ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائیگی لہذا اس کی صنعت زیادہ سے زیادہ اتنے زراعت پیشہ اشخاص کو ان کے گھروں سے علیحدہ کرسکیگی۔ وہ ان میں سے ایک کو بھی کوئی مزید صنعت نہیں دیسکتی۔ لہٰذا ملیں چرخہ سے بالکل جدا ہیں اور ان دونوں میں کوئی تقابل نہیں ہوسکتا

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر اسی قدر کپڑا گھریلو صنعت کے ذریعہ پیدا کیا جائے تو کتنے اشخاص برسر کار ہوسکیں گے۔ ۱۶۵ الین پونڈ سوت پیدا کرنے کے لئے کم سے کم ۴۶۰۰۰۰۰ چرخوں کی ضرورت ہوگی۔ جو ۲۵ پونڈ فی سال کے حساب سے سوت پیدا کریں گے۔ بالفاظ دیگر ۴۶۰۰۰۰۰ کاتنے والے کات کر اپنی آمدنیوں میں اضافہ کرسکیں گے۔ اس میں روئی اوٹنے والوں، روئی دھننے والوں، کلف لگانے والوں، رنگ ریزوں، بڑھیوں لوہاروں اور تعلیم یافتہ منتظموں اور ۳۳۰۷۰۰ بننے والوں کا اضافہ کردیجئے جن کی ضرورت اس صنعت کے قیام کے لئے پڑیگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی زراعتی آبادی کا کم سے کم نصف حصہ (مجموعی زراعتی آبادی

۲۲۴ ملین میں سے ۱۰ سال سے کم عمر کے بچوں کی تعداد کو بقدر ۶۱۶۴ ملین کے خارج کر دیا گیا ہے)

جہاں تک کپڑا استعمال کرنے کا تعلق ہے، اس اہم صنعت کے لئے اس کی امداد و اعانت حاصل کرنا ہمیشہ ممکن رہا ہے اور ساتھ ہی اس صنعت کے لئے بھی یہ امر ہمیشہ ممکن رہا ہے کہ وہ اس کی روز افزوں ضرورت کے تناسب کو پورا کرتی رہے۔ یہ صنعت نہایت ضروری ہے اس لئے کہ اس کا تخیل ان اقتصادی امور پہ ہے جو زندگی پر مبنی ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ اقوام کی اقتصادی حالت ایسی ہونی چاہئے جو انہیں زندہ رکھ سکے اب یہ ایک ایسی صنعت ہے جو ہندوستانیونکو نہ صرف اس قابل بنادیگی کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں جو ایسی دولت پیدا کرنیوالی جو حقیقی اور مساوی طریقہ پر تقسیم ہو سکے، ایسی دولت نہیں جو رسکن سلہ کے خوبصورت الفاظ میں درحقیقت دور از کار تباہی کی سنہری علامت ہو، ایسے خزانچ کی دولت نہو جو ساحل پر سے حاصل کیگئی ہو جہاں سامان سے بھرے ہوئے جہاز کو دھوکہ دیکر بلا لیا گیا ہو کیا حکومت سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایسی زندگی بخش صنعت کی حفاظت کریگی ضرورت سے زیادہ ہے؟ کیا اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ محض اسکی حفاظت کریگی بعینہ جسطرح سے پوسٹل سروس جیسی ضروری سروس کی حفاظت کا فرض اُسپر عائد ہوتا ہے بعض ممالک میں یہ بات معمولی سمجھی جاتی ہے کہ میونسپلٹیونکے منڈی کے حقوق کی حفاظت کیجائے اور کھدر کے بارے میں ہماری منڈی کے حقوق، کی حفاظت کرنے میں حکومت صرف اپنے پیشرووں کے گناہونکی تلافی کریگی جنھوں نے اس ملک کی واحد ضروری صنعت کا گلا گھونٹ دیا تھا"

سلہ RUSKIN

باب نہم

"ہماری اور انکی ذلّت"

جیسا کہ بعد کو ظاہر ہو گا میں نے چھوت چھات کے اس باب کے لئے مہاتما گاندھی کا اپنا عنوان قائم رکھا ہے۔ ساتھ ہی میں اسے ایک اور معنی میں بھی استعمال کرنا چاہتا ہوں جو ان کا کبھی نشانہ تھا، کیونکہ جب ہم ہندوستانی اچھوتوں کو کسی علیحدہ مقام پر رکھنے کا ذکر کرتے ہیں تو ہم دراصل اسوقت اپنی مغربی نسل اور رنگ کے مسئلہ سے بھی دوچار ہو جاتے ہیں جو ہمارے لئے باعث ننگ ہے بعینہٖ جس طرح سے کہ چھوت چھات ہندوستان کے لئے باعث شرم ہے

مغرب کے عیسائیوں کا کلیسا ہندو مذہب کی طرح دوسری نسل کے اشخاص کے ساتھ منصفانہ کارروائی اور فیاضانہ سلوک کرنے میں افسوسناک طریقہ سے قاصر رہا ہے۔ وہ افریقہ اور دوسرے مقامات میں خود چھوت چھات کے مسئلہ سے دوچار ہو رہا ہے جسے وہ اب تک حل نہیں کر سکا

ہندو مذہب کے بہت سے شریف ترین مذہبی لیڈروں نے جن میں چیتنیا اور نانک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، نسلی مساوات کی بہت کچھ کوشش کی ہے۔ گوتم بدھ نے حضرت عیسیٰؑ سے پانچ سو سال قبل اسکا اعلان کیا تھا

اور اچھوتوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا۔ لیکن یہ خرابی خوف اور نفرت کی نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی ہے یہاں تک کہ اس کا نتیجہ نسلی علیحدگی کی صورت میں نکلا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں ظاہری عدم صفائی یا گندگی کا مذہبی تخیل بھی داخل ہو گیا ہے یہاں تک کہ جو علیحدگی ابتدا میں معاشرتی اسباب کی بنا پر عمل میں آئی تھی اس نے اب مذہبی جواز حاصل کر لیا ہے۔ اس طرح سے یہ برائی ہندو مذہب کے قلب میں ناسور کی طرح جڑ پکڑ چکی ہے بعینہٖ جس طرح سے کہ بعض ممالک میں رنگ کا تعصب عیسائیوں کے کلیسا کے قلب میں پیدا ہو گیا ہے

جدید ہندوستان کے ہندوؤں میں پانچ کروڑ سے زیادہ اشخاص ہندو مذہب میں خارج شدہ یا اچھوتوں کی حیثیت سے داخل سمجھے گئے ہیں۔ موخرالذکر اصطلاح اس لئے استعمال کی جاتی ہے کہ اس نظریہ کے مطابق جو عام لوگوں میں پایا جاتا ہے اور حال میں اسے خود مذہب کا جزو خیال کر لیا گیا ہے، "اونچی ذات کے ہندو کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ اتفاقاً ان اچھوتوں میں سے کسی سے چھو جائے تو اسے اپنے آپ کو پاک کرنے کی غرض اشنان کرنا چاہئے۔ جس قعرِ مذلت میں یہ اچھوت گر گئے ہیں" اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کی ایک بڑی تعداد مُردار اور غلیظ چیزیں کھاتی ہیں اور نیز وہ جھوٹا کھانا جو اعلیٰ ذات کے لوگوں کے دسترخوانوں سے بچ رہتا ہے۔ ان کے مکانات جو اعلیٰ ذات کے اشخاص کے مکانات سے جدا ہوتے ہیں، درحقیقت جانوروں کے بھٹ ہیں جو انسانی بود و باش کے

بالکل ناقابل ہوتے ہیں مگر جنوبی ہندوستان میں جن حالات کے ماتحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ خوفناک ہیں

مجھے یاد ہے کہ جب میں مالابار میں ایک غریب اچھوت عورت کے قریب گیا جو اپنی جھونپڑی میں اپنے تین نیم فاقہ زدہ بچوں کو لئے ہوئے پڑی تھی اور جس کی بغل میں ایک سوکھا ساکھا بچہ بھی تھا، وہ کس طرح ایک خوفناک طریقہ سے چلائی حالانکہ میں کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کی وجہ سے وہ مجھے کوئی سرکاری افسر سمجھتی اسے یہ خوفناک خیال دامنگیر تھا کہ کہیں وہ اپنی موجودگی سے مجھے گندا نہ کردے اور یہ کہ پھر میں انتقام کے طور اسے جسمانی اذیت نہ پہونچاؤں، یہ صدمہ میرے لئے اس قدر شدید تھا کہ اس کا خوف زدہ چہرہ کئی دن تک مجھے نظر آتا رہا

میں نے یہ سیدھی سادی کہانی اس غرض سے بیان کی ہے کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ ان غریب آدمیوں پر سے خوف کا کتنا زبردست بوجھ اٹھانا باقی ہے اس سے پیشتر کہ انہیں آزادی حاصل ہو اور انہیں بھن بھائی خیال کیا جاسکے

یہ مسئلہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ اس کا اثر صرف ہندوستان پر ہی پڑتا ہو۔ دنیا کے مختلف حصص میں مثلاً جنوبی افریقہ اور امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں رنگدار اقوام کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ اپنے اندر وہ تمام عناصر رکھتا ہے، جو ہندوستان میں زمانہ سلف میں

چھوت چھات بنالیے ہیں، صرف ہوئے ہیں جبشیوں میں سنگسار ہو جانے کا خوف جہاں کہیں دہشت انگیزی نے اپنا کام کیا ہے اس خوف سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو مالا باری عورت کے چہرہ سے عیاں تھا۔ دونوں صورتوں کی تہہ میں جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ علم النفس کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ بدقسمتی سے جو ہندوستانی جنوبی افریقہ گئے ہیں، وہ مختلف طریقوں سے علیحدہ رکھے جاتے ہیں وہ معاشرتی علیحدگی کے مشابہ ہیں جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں میں پائی جاتی ہے۔ مسٹر گاندھی یہ بتانے سے کبھی نہیں تھکتے کہ یہ سب کچھ چھوت چھات کے گناہ کی جائز سزا ہے۔ انھوں نے موقع بے موقع اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان سوراج حاصل نہیں کرسکتا جب تک اس کے باشندے اس لعنت کو اپنے میں سے دور نہ کر دینگے ذیل کے اقتباسات ان کی ایک تقریر سے ماخوذ ہیں جو خود اچھوتوں کے روبرو کی گئی تھی وہ فرماتے ہیں:۔

"میں چھوت چھات کو ہندو مذہب پر ایک بہت بڑا دھبہ تصور کرتا ہوں یہ خیال محض اس تلخ تجربہ کی بنا پر پیدا نہیں ہوا جو جنوبی افریقہ کی کشمکش میں مجھے حاصل ہوا تھا

اس کی وجہ یہ بھی نہیں ہے کہ میں ایک زمانہ میں دہریہ رہ چکا ہوں اسی طرح یہ خیال کرنا غلطی ہے جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں نے یہ خیالات عیسائیوں کی مذہبی کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔ اس مسئلہ پر میرے خیالات اس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ میں نہ تو بائیبل کا شیدائی

تھا نہ اس سے یا اس کے پیروؤں سے واقف تھا

میری عمر مشکل سے بارہ برس کی ہوگی کہ یہ خیال یکایک میرے دل میں پیدا ہوا، اوکا نامی بھنگی جو ایک اچھوت تھا، ہمارے گھر میں پاخانہ صاف کرنے آیا کرتا تھا۔ میں نے متعدد بار اپنی ماں سے پوچھا کہ اسے چھونا کیوں برا ہے اور یہ کہ مجھے اس کے چھونے سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ اگر کبھی اتفاقیہ طور سے میں اوکا کو چھو لیتا تھا تو مجھے اشنان کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، اور اگرچہ قدرتاً میں اس حکم کی پابندی کرتا تھا تاہم میں مسکرا کر اپنی صدائے احتجاج ضرور بلند کر دیتا تھا کہ مذہب میں چھوت چھات کی اجازت نہیں ہے اور یہ کہ یہ امر ناممکن ہے کہ ایسا ہو۔ میں بڑا فرض شناس اور فرمانبردار لڑکا تھا لیکن اپنے والدین کا احترام کرتے ہوئے بھی میں نے اس مسئلہ پر ان سے بارہا سخت بحثیں کیں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ اوکا سے چھو جانے کو گناہ خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ایسی چیز گناہ نہیں ہو سکتی

اسکول کے زمانہ میں میں اکثر اچھوتوں کو چھو لیا کرتا تھا، اور چونکہ میں اپنے والدین سے یہ واقعہ کبھی نہیں چھپایا کرتا تھا، میری والدہ مجھ سے کہا کرتیں کہ ناپاک چھوت کے بعد پاک و صاف کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ میں کسی مسلمان کو چھو کر اس کے اثر کو زائل کر دوں۔ اس لئے محض اپنی والدہ کے احترام اور لحاظ کی وجہ سے میں نے اکثر اوقات ایسا کیا لیکن میں نے کبھی یہ یقین نہیں کیا کہ ایسا کرنا مذہب کی رو سے ضروری ہے

ہمارے خاندان میں راماینؔ[1] باقاعدہ طور پر پڑھی جاتی تھی۔ ایک برہمن اسے پڑھا کرتا تھا۔ اسے جذام ہو گیا تھا۔ مگر اس کا عقیدہ تھا کہ راماین کی باقاعدہ تلاوت سے وہ چنگا ہو جائیگا اور حقیقتاً وہ اچھا بھی ہو گیا میں خیال کیا کرتا تھا کہ کس طرح سے راماین جس میں یہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے جو آج کل کی اصطلاح میں اچھوت کہلاتا ہے۔ رام کو اپنی کشتی میں گنگا پار اتار دیا، اس بنا پر کسی انسان کے اچھوت ہونے کے تخیل کو برداشت کرسکتی ہے کہ اس کی روح گندی ہوتی ہے؟

یہ حقیقت کہ ہم خدا تعالیٰ کو گندوں کا پاک کرنے والا خیال کرتے ہیں، ظاہر کرتی ہے کہ کسی شخص کو جو ہندو دھرم میں پیدا ہوا ہو ناپاک سمجھنا گناہ ہے۔ یہ کہ ایسا کرنا شیطانی فعل ہے۔ اس وقت سے اب تک میں یہ کہتے ہوئے نہیں تھکا کہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا کہ یہ بات بارہ برس کی عمر میں میرا عقیدہ بن گئی تھی، مگر اتنا ضرور کہونگا کہ اس وقت بھی میں چھوت چھات کو گناہ سمجھا کرتا تھا

میں نے ہمیشہ سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں کٹر قسم کا قدیم الخیال ہندو ہوں۔ یہ بات نہیں کہ میں اپنی کتب مقدسہ سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ میں سنسکرت کا عالم فاضل نہیں ہوں۔ میں نے ویدوں اور

[1] راماین ایک منظوم کتاب ہے جس میں رام کے خدائی اوتار ہونے کا ذکر ہے، تلسی داس نے والمیکی کی قدیم سنسکرت سے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ شمالی ہندوستان کے ہندو اسے بائبل کی طرح مقدس سمجھتے ہیں

اپنشدوں کو ترجمہ کی شکل میں پڑھا ہے۔ جو مطالعہ میں نے کیا ہے اسے قدرتی طور پر فاضلانہ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا مطالعہ ان کتابوں کا بہت گہرا نہیں ہے لیکن میں نے ہندو کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میرا دعویٰ ہے کہ میں نے ان کی روح کو دریافت کر لیا ہے۔ اکیس برس کی عمر تک میں نے دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کر لیا تھا

ایک زمانہ تھا کہ میں ہندو دھرم اور عیسائیت کے درمیان ڈانوا ڈول ہو رہا تھا جب مجھے توازن دماغی حاصل ہو گیا تو میں نے اس وقت محسوس کیا کہ میری نجات صرف ہندو دھرم کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور ہندو مذہب پر میرا ایمان اور زیادہ پختہ اور روشن ہو گیا۔ لیکن اس وقت بھی میرا عقیدہ یہ تھا کہ چھوت چھات میرے لئے نہیں ہے

جب تک ہندو چھوت چھات کو جان بوجھ کر اپنے مذہب کا جزو خیال کرتے رہیں گے، جب تک عام ہندو اپنے بھائیوں کے ایک طبقہ کو چھونا بھی گناہ خیال کریں گے، سوراج ناممکن التحصول رہیگا

لیکن میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا ہوں میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مہربانی کی اسپرٹ جس کا ذکر تلسی داس اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ کرتا ہے جو جین مذہب اور وشنوی مذہب کی سنگ بنیاد ہے، جو بھگوت[1] کی روح ہے

[1] ہندوؤں کی ایک مذہبی کتاب ہے جسے دیہات کے لوگ اس کی فیاضانہ محبت، معافی اور شغف کی وجہ سے بہ نظر محبت دیکھتے ہیں۔ اور جس کا اکثر اوقات گھروں میں پاٹھ کیا جاتا ہے

اور گیتا کی ہر آیت میں مضمر ہے، یہ مہربانی، یہ محبت، یہ نیکی اس ملک کے عام باشندوں کے دلوں میں رفتہ رفتہ جڑ پکڑ رہی ہے

میں قومی دن کو نیلور میں تھا۔ میں وہاں "اچھوتوں" سے ملا اور انکے ساتھ اسی طرح سے دعا مانگی جیسے آج مانگی ہے۔ میں روحانی آزادی حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ میں دوبارہ پیدا ہونے کی آرزو نہیں رکھتا۔ لیکن اگر مجھے دوبارہ پیدا ہونا ہی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اچھوت کی صورت میں پیدا ہوں تاکہ میں ان کی مصائب اور ان کی تکالیف میں اور ان بدسلوکیوں میں جو انکے ساتھ روا رکھی جاتی ہیں شریک رہوں، اس غرض سے کہ میں اپنے آپکو اور انہیں اس تباہ کن حالت سے آزاد کراؤں۔ اس لئے میں نے دعا کی کہ اگر مجھے دوبارہ ہی پیدا ہونا ہے تو پھر مجھے برہمن، چھتری، ویش یا شودر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اچھوت کے روپ میں آنا چاہیے

مجھے بھنگی کے کام سے محبت ہے۔ میرے آشرم میں ایک ۱۸ سالہ برہمن لڑکا بھنگی کا کام کرتا ہے۔ تاکہ وہ آشرم کے بھنگی کو صفائی سکھلائے۔ یہ لڑکا کوئی مصلح نہیں۔ وہ پرانے خیالات کے ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ وہ باقاعدہ گیتا پڑھتا ہے اور باقاعدگی کے ساتھ اپنی پوجا کرتا ہے۔ جب وہ پوجا کے وقت دعائیں پڑھتا ہے اس وقت اس کی نرم اور شیریں ترنم ریزیاں سننے والے کے دل میں محبت پیدا کر دیتی ہیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی ساری ریاضتیں نامکمل رہینگی جبتک کہ وہ کامل بھنگی نہیں بنیگا۔ اسنے محسوس کیا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ آشرم کا بھنگی اپنا کام اچھی طرح سے کرے تو اسے یہ کام خود کرنا چاہیئے اور مثال قائم کرنی چاہیئے

آپ کو محسوس کرنا چاہیئے کہ آپ ہندو سوسائٹی کو پاک کر رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی زندگیوں کو پاک کریں۔ آپ کو صفائی کی عادت ڈالنی چاہیئے تاکہ کوئی شخص آپ پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ آپ میں سے بعض شراب خواری اور جوئے بازی کی عادات میں مبتلا ہیں، ان سے آپ کو اجتناب کرنا چاہیئے

آپ لوگ ہندو ہونے کے دعویدار ہیں۔ آپ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس لئے اگر ہندو آپ پر ظلم کریں تو اس وقت آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ قصور ہندو دھرم کا نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو اس کے پیرو کہلاتے ہیں۔ اپنے تئیں آزاد کرانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھیں۔ آپ کو شراب پینے اور مردار کھانے جیسی خراب عادات کو ترک کر دینا چاہیئے میں سارے ملک کے اچھوتوں سے ملا ہوں اور میں نے غور سے دیکھا ہے کہ اُن میں عظیم الشان طاقتیں پنہاں ہیں جن سے نہ وہ خود نہ باقی ہندو واقف ہیں۔ ان کا ذہن نہایت صاف ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کاتنا اور بننا سیکھ لیں اور اگر اسے بطور پیشہ کے اختیار کر لیں گے تو آپ افلاس کو ہمیشہ اپنے سے دور پائیں گے"

اب آپ کو تھالیوں میں سے جھوٹا کھانا قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے خواہ وہ کتنی ہی صاف کیوں نہ ہوں۔ آپ صرف اناج قبول کر لیا کریں اچھی قسم کا صحت بخش اناج نہ کہ سڑا ہوا اناج، اور وہ بھی صرف اسوقت جبکہ وہ محبت و اخلاق کیساتھ پیش کیا جائے اگر آپ یہ سب کچھ کر گزرینگے جس کی درخواست میں نے آپ سے کی ہے تو آپ اپنی آزادی حاصل کر لیں گے

ہندو فطرتاً گناہگار واقع نہیں ہوئے ہیں، وہ صرف گہری جہالت میں مبتلا ہیں۔ چھوت چھات کا اسی سال خاتمہ ہونا چاہئے۔ دو زبردست خواہشیں جو اب تک مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں اچھوتوں کی آزادی اور گائے کی حفاظت ہیں۔ جب یہ دونوں خواہشیں پوری ہو جائیں گی، سوراج حاصل ہو جائے گا اور اسی میں میری روح کی نجات مضمر ہے۔ خدا آپ کو توفیق دے کہ آپ آخر وقت تک اپنی روح کی نجات کے لئے کوشش کرتے رہیں!"

مجھے ایک اور حیرت انگیز واقعہ بیان کرنے کی اجازت دیجئے۔ "ینگ انڈیا" کے صفحات میں مہاتما گاندھی اپنے صادقانہ اور پرجوش الفاظ میں اڑیسہ جانے کا حال لکھتے ہیں جبکہ میں بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ اڑیسہ ہندوستان کا نہایت تباہ حال اور افلاس زدہ علاقہ ہے۔ وہ ذیل کے الفاظ میں وہاں کے واقعات کو قلمبند فرماتے ہیں:۔

"اڑیسہ کا دورہ جو اتنے عرصہ سے ملتوی ہو رہا تھا، رنج اور ذلت کا تلخ پیالہ بھرنے کے لئے آن پہونچا ہے جبکہ میں دین بندھو[1] اینڈریوز کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا، ایک پاریہ جس کی کمر نصف خمیدہ تھی اور جو صرف ایک میلی سی لنگوٹی پہنے ہوئے تھا، آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آیا۔ اس نے ایک تنکا اٹھایا اور اپنے منہ میں ڈالا اور پھر اپنے منہ کے بل ہاتھ پھیلا کر لیٹ گیا۔ اس نے پھر اپنے آپ کو اٹھایا، ہاتھ جوڑے، کمر کو اور زیادہ خم کیا، تنکا باہر نکالا، پھر سے اپنے بالوں میں اڑس لیا اور قریب تھا کہ چلا جائے یہ نظارہ دیکھتے وقت میری روح سخت عذاب میں تھی۔ جونہی یہ

[1] اسکے لفظی معنی ہیں "دو غریبوں کا دوست"، یہ ایک مذہبی لقب ہے

کہ جب ختم ہوا میں نے ایک ترجمان کو بلایا دوست سے نزدیک آنے کے لئے کہا اور اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں

وہ اچھوت تھا جو چھ میل پرے کسی گاؤں میں رہتا تھا اور چونکہ وہ لکڑیوں کا گٹھڑ بیچنے کے لئے بولگنڈہ آیا ہوا تھا اور میری آمد کا حال سن چکا تھا اس لئے وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے تنکا منہ میں کیوں ڈالا تو اس نے جواب دیا کہ یہ کام میری عزت افزائی کے لئے کیا گیا تھا۔ میں نے مارے شرم کے اپنا سر جھکا لیا۔ اس عزت افزائی کی قیمت میری طاقت برداشت سے باہر تھی۔ میری ہندوانی اسپرٹ کو اس سے سخت ندامت ہوئی میں نے اس سے ایک تحفہ طلب کیا۔ اس نے اپنی کمر میں تیل کے سکے تلاش کرنے شروع کئے مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں میں تم سے اس سے بہتر چیز طلب کرتا ہوں میں نے اسے کہا "میں اسے ضرور دوں گا" اس نے جواب دیا

میں نے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے اور مردار کھاتا ہے کیونکہ وہاں کی رسم ہی یہ تھی

"جو تحفہ میں تم سے طلب کرتا ہوں وہ وعدہ ہے کہ تم آئندہ دنیا کے کسی آدمی کے لئے یہ تنکا منہ میں نہیں ڈالو گے۔ ایسا کرنا انسان کے لئے باعث ذلت ہے۔ یہ کہ تم کبھی شراب نہیں پیو گے کیونکہ وہ انسان کو حیوان کے درجہ تک لے آتی ہے، یہ کہ تم کبھی مردار نہیں کھاؤ گے کیونکہ یہ ہندو دھرم کے خلاف ہے اور کوئی شائستہ آدمی مردار کھانا پسند نہیں کریگا۔"

"لیکن میرے لوگ مجھے برادری سے خارج کر دیں گے اگر میں شراب نہ پیونگا

یا مردار نہ کھاؤں گا، غریب آدمی نے جواب دیا

'تو پھر تمہیں اس اخراج کو برداشت کرنا چاہیئے اور اگر ضرورت پڑے تو گاؤں چھوڑ کر چلے جانا چاہیئے'

حقیر غریب آدمی نے وعدہ کر لیا۔ اگر وہ اس پر قائم رہا تو اس کا ان تین چیزوں کا تحفہ زیادہ قیمتی ہو گا بہ نسبت ان تمام روپوں کے جو میرے اہل ملک مجھے دیتے ہیں

یہ چھوت چھات ہماری سب سے بڑی ذلت ہے اور اس ذلت کا احساس دن بدن اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے"

خود ان کی زندگی میں اس سے زیادہ دردناک صورت حالات واقع نہ ہوئی ہو گی کہ جب بالآخر انھوں نے ایک ننھی سی اچھوت لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے گھر میں لانے کا مصمم ارادہ کر لیا تو اس وقت انہیں مسز گاندھی کی مخالفت سہنی پڑی۔ یہ سارا واقعہ حیرت انگیز صفائی اور سادگی کے ساتھ انکی خود نوشت سوانح عمری میں بیان کیا گیا ہے لیکن وہ اس قدر طویل ہے کہ اس باب میں جوں کا توں درج نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ سے خاوند اور بیوی میں جھگڑا ہوا اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ انھوں نے اس کا اعلان کر دیا کہ وہ اس گھر میں نہیں رہیں گے جب تک کہ ان کی بیوی ننھی اچھوت لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر گھر میں رکھنے کے لئے تیار نہ ہونگی۔ مسز گاندھی اس وقت ان کے بہت سے خیالات سے متفق نہ تھیں لیکن بالآخر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور انھوں نے اظہار رضامندی کر دیا

ایک دوسرے موقع پر قریب ایسا ہی جھگڑا خاوند اور بیوی کے درمیان جنوبی افریقہ میں اپنے گھر میں ایک نوجوان کلرک رکھنے پر ہوا جو اچھوت جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ جھگڑے کی بنا اس سوال سے شروع ہوئی کہ جن برتنوں میں یہ اچھوت کھانا کھاتا تھا اسے دھوئے کون۔ یہ ان نشاذ مواقع میں سے ایک تھا۔ جب مسٹر گاندھی نے اپنی بیوی سے نہایت سختی کے ساتھ اظہار ناراضگی کیا اور اس کا اقرار خود نوشت سوانحعمری میں گہری ندامت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان جھگڑوں سے ہم پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ تعصبات کس سختی کیساتھ اب تک قائم و موجود ہیں

میں مختلف اوقات میں عرصۂ دراز تک جنوبی افریقہ میں رہ چکا ہوں اور مجھ پر انسانی فطرت کی اِن دو خلاف عقل مگر بہ لحاظ تعصب نہایت طاقتور قوتوں کی مشابہت کا بہت زیادہ گہرا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کے احساسات کا اور جنوبی افریقہ میں نسلی تعصب کا

ایک دن ٹراونکور میں خود اچھوتوں نے ایک قاصد کے ذریعہ سے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں ان سے ملنے کے لئے تیار رہوں۔ انھوں نے میرا ذکر "گاندھی کے بھائی" کی حیثیت سے سن رکھا تھا اور اس لئے انھوں نے مجھے پیغام بھیجا تھا۔ میں نے بڑی مسرت کیساتھ ان کے اس دعوت نامہ کو قبول کر لیا اور جب میں دوپہر کے وقت ان کے یہاں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ کوئی تین ہزار آدمی جمع ہیں۔ گاندھی کے بعض نہایت پرجوش پیروؤں کیساتھ جو اس وقت میرے ساتھ تھے، ہم اچھوتوں کی قطاروں میں پھرتے رہے

اور ان سے اظہار دوستی کرتے رہے، اور انہیں اچھے کاموں کی ترغیب دیتے رہے۔ انکے درمیان اس طرح سے آہستہ آہستہ پھرنا ضروری تھا تاکہ انکے دلوں میں سے خوف وہراس کا شائبہ نکل جائے۔ زمینداروں اور دوسرے اشخاص کے ہاتھوں جو بیرحمیاں اور بدسلوکیاں انکے ساتھ روا رکھی گئی تھیں، اس دن انھوں نے وہ سب کہہ سنائیں۔ درحقیقت انکی تشریح تکلیف اور ظلم کی ایک داستان تھی اور مجھے ان کے چہروں کے شکنوں سے انکے بیان کردہ واقعات کی سچائی کی تصدیق ہوگئی۔

اسی مسئلہ پر مہاتما گاندھی کی ایک اور تحریر سے ذیل کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"فی الحقیقت جب ہندو ایک ارادی اور شعوری کوشش کے ذریعہ پالیسی کے طور پر نہیں بلکہ اپنی اندرونی پاکیزگی وصفائی کے خیال سے چھوت چھات کے داغ کو دور کردینگے تو وہ فعل قوم میں ایک نئی طاقت پیدا کردیگا جو نتیجہ ہوگی اس احساس کا کہ ہم نے ایک صحیح بات کی ہے، اور اس طرح سے وہ حصول سوراج میں ممد ومعاون ہوگا۔ ہم آج کمزور ہیں کیونکہ ہم میں سے اتصال واتحاد کی طاقت زائل ہوگئی ہے۔ جب ہم ان پانچ کروڑ اچھوتوں کو اپنا سمجھ لیں گے تو اسوقت ہم معلوم کرلیں گے کہ ایک قوم سے کیا مراد ہے۔ صفائی وپاکیزگی کا وہ ایک فعل غالباً ہندو مسلم سوال کو بھی حل کردیگا، کیونکہ اس میں بھی چھوت چھات کا گھلا دینے والا زہر شعوری یا غیر شعوری طریقہ سے جلوہ گر ہے۔ ہندو مذہب یقیناً بہت ہی معمولی چیز ہو جائے گی اگر

اسے اپنی حفاظت کے لئے اس قسم کی مصنوعی دیوار کی ضرورت رہیگی

اگر چھوت چھات اور ذات پات ایک ہی چیز ہے تو جس قدر جلد ذات پات تباہ ہو جائے اتنا ہی جملہ متعلقہ اشخاص کے لئے بہتر ہو گا۔ موجودہ ذات پات کا جس سے مغرورانہ علیحدگی ٹپکتی ہے، چلا جانا ہی اچھا ہے۔ لاتعداد ذاتیں در ذاتیں اپنے آپ کو ایسی سرعت کیساتھ تباہ و برباد کر رہی ہیں جس کا ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا

یہ ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارے لئے باعث شرم ہے کہ یہ دبی ہوئی اقوام شہروں اور دیہات کے باہر رہ رہی ہیں اور خراب قسم کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ جس طرح سے ہم بجا طور پر برطانوی حکام کو اپنی بے چارگی اور کمی جرأت کا ذمہ دار سمجھتے ہیں بعینہٖ اسی طرح سے ہمیں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا جرم تسلیم کرنا چاہیئے جنھوں نے اچھوتوں کو ان کی موجودہ تباہ حالت تک پہونچا دیا ہے ہماری روحانی ترقی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم ہمالیہ کی بلندیوں سے نیچے اتریں اور انکے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں اور یہ محسوس کریں کہ ہم دونوں ایک ہیں"

سنہ ۱۹۲۱ء کی تحریک عدم تعاون کے دوران میں چھوت چھات کے مسئلہ سے زیادہ اہم اور کوئی مسئلہ نہ تھا جس نے مہاتما گاندھی کے دماغ کو اپنی جانب متوجہ رکھا تھا۔ مغرب میں اس تحریک کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خالصتاً تخریبی سیاسی بغاوت تھی جو نسلی تعصب کا نتیجہ تھی اور جس کا مقصد قائم شدہ نظام حکومت کی بربادی تھا۔ برخلاف اس کے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا

اور جس پر عامۃ الناس نے وسیع پیمانہ پر ہمیشہ لبیک کہا یہ تھی کہ ہندوستان اپنے آپ کو اندرونی طور پر پاک و صاف کرے اور اس قومی گناہ سے توبہ کرے جو اپنے بھائی بہنوں کو اچھوت سمجھنے میں اس سے سرزد ہو رہا ہے وہ کسی نوع نظر انداز نہ کی جانیوالی منطق کو نہ بھلاتے تھے کہ چونکہ ہندوستانیوں نے اپنے بھائی بہنوں کیساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا ہے۔ اس لئے انصاف متقاضی ہے کہ خود ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھا جائے، اور یہ کہ وہ ایسے سلوک کے مستحق ہیں ان ہیجان انگیز اور روح پرور ایام میں ان تقریروں کا ماحصل بہ نسبت اور کسی چیز کے زیادہ تر حضرت یحییٰ کے اذنِ توبہ سے مشابہت رکھتا تھا۔ اگر وہ خود سرگرم اور پرجوش نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ تکرار بے کیف رہتی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ بات زیادہ عیاں ہوتی گئی کہ وہ برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور کمیوں کا تذکرہ کم کرتے اور بار بار اپنی مظالم کی تکرار کرتے جنکے مرتکب خود ان کے اہل ملک ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بہت سے پیرووں نے اس بارے میں ان سے بحث و تمحیص کی لیکن انھوں نے توجہ کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ تحریک کے دوران میں وہ ذرا بھی ادھر ادھر متزلزل نہیں ہوئے بلکہ اس برائی کے خلاف جسکی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں شدت کیساتھ جہاد جاری رکھا۔ وہ فقرہ جسے وہ اپنی ملکی زبان میں بار بار دہرانے کے عادی تھے یہ تھا: "اگر چھوت چھات ہی ہندو مذہب کا جزو ہے تو میں ہندو نہیں ہوں"

ان کی سخت ترین تقریریں صوبہ مدراس میں ہوئی تھیں جہاں زمانہ

ماضی سے چھوت چھات نہایت زوروں پر اور جارحانہ حالت میں رہی ہے ۔ مالا بار، ٹراونکور میں نہ صرف ایسے اچھوت ہیں جنھیں چھوا نہیں جا سکتا بلکہ ایسے اچھوت بھی ہیں جنھیں ناپاک ہوئے بغیر تو دیکھا ہی جا سکتا ہے اور نہ ان تک پہونچا جا سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر نیاڈی اپنے آپکو عام شاہراہ سے دو سو گز کے فاصلہ پر رکھتے ہیں تاکہ انکی نظر بھی گندہ نہ کرنے پائے ۔ وہ زمین پر ایک پھٹا پرانا کپڑے کا ٹکڑا رکھ دیتے ہیں اور خود دور کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں

ہم میں سے وہ لوگ جو عیسائی کلیسا کے ممبر ہیں، اس واقعہ کو شرم اور اندرونی ندامت محسوس کئے بغیر بیان نہیں کر سکتے کہ ٹراونکور میں خود کلیسا انہی خرابیوں کا شکار ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ابتک اپنے مشن میں ناکام رہا ہے ۔ گذشتہ زمانہ میں وہ خود اس برائی میں شریک رہ چکا ہے اور عملاً اس نے چھوت چھات کو برداشت کیا ہے ۔ ہندوستان کے جنوب مغرب میں کلیسا پندرہ سو سال سے اوپر ہوئے شامی عیسائیوں کی طرف سے قائم کیا گیا تھا ۔ رفتہ رفتہ یہ چھوت چھات کا خاموش اجازت دہندہ اور منظوری دہندہ بن گیا ۔ کوٹایم کے دورے کے زمانہ میں (اور یہ وہ جگہ ہے جو عیسائیت کی اس قدیم شکل کا مرکز رہ چکی ہے) مجھے اسوقت کسقدر شرم اور ندامت محسوس ہوئی جبکہ میں نے مقامی عیسائیوں کا ایک مجمع طلب کیا کہ وہ معروضہ اچھوت علاقہ میں پاریوں کیساتھ کھانے میں شریک ہو لیکن میرے عیسائی مذہب کے صرف تین اشخاص میرے ساتھ شامل ہوئے حالانکہ دنیا میں میں ہزاروں کیساتھ مل چکا تھا اور پاریوں کیساتھ کھانا کھانے کی تجویز اچھی طرح شہرت پا چکی تھی ان

تین میں سے ایک شخص جو میرے ساتھ شامل ہوا، مار تھوما سیمینری کا پرنسپل تھا، دوسرا ایک نو عمر رومن کیتھولک پادری تھا اور تیسرا شامی عیسائی کلیسا کا پُرجوش خدمتگزار تھا، اور ساتھ ہی مہاتما گاندھی کا بھی پیرو تھا۔ میرے ساتھ دو اور اشخاص تھے جو ہندو تھے

حالات اب بہتر ہو گئے ہیں۔ آلوائی کا یونین کالج جہاں شاہی کلیسا کے ممبران لبرل قسم کی اعلیٰ تعلیم دینے میں مصروف رہتے ہیں اور دوسرے عیسائی ادارے نہایت سرعت کیساتھ نوجوان نسل میں سے اس شرم اور ذلت کو دور کر رہے ہیں یہی بات بہت سے شریفانہ ہندو اداروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے لیکن مالاباری ساحل کے قریب کے مقامات میں ہندوؤں اور عیسائیوں میں یہ برائی یکساں طور پر نہایت خوفناک حالت میں اب بھی موجود ہے اور آج بھی ایسے نظارے دیکھنے میں آ سکتے ہیں جو انسانی دلوں میں دہشت پیدا کر دیں گے

مہاتما گاندھی کی مدراس کی تقریروں میں اسی دہشت کی گونج موجود ہے جس کی جانب میں اپنے تبصرہ میں ہندوؤں اور عیسائیوں کے طرزِ عمل کے بارے میں اشارہ کر چکا ہوں۔ وہ رقمطراز ہیں :-

"ہندوستان میں کہیں بھی اچھوت کیساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ نہیں ہوتا جیسا صوبہ مدراس میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اسکا سایہ تک برہمنوں کو ناپاک کر دیتا ہے اسے برہمنوں کی سڑکوں پر سے گذرنے کی اجازت نہیں ہے۔ غیر برہمن بھی اس سے کسی قسم کا بہتر سلوک نہیں کرتے۔ ان دونوں پاٹوں میں غریب پنچم (اور یہ وہ نام ہے جس سے وہ ان علاقوں میں موسوم ہے) پس کر رہ گیا ہے۔ باوجود اس کے مدراس اپنے بڑے بڑے شاندار مندروں اور مذہبی شغف کیلئے مشہور رہے۔ وہاں کے لوگوں کی

پیشانیوں پر قشقہ کے بڑے بڑے نشانات ہوتے ہیں، اور وہ اپنی لمبی زلفوں اور ننگے صاف جسموں کی وجہ سے بالکل رشی معلوم ہوتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ان ظاہری علامات کی تکمیل ہی میں صرف ہو جاتا ہے

باوجود اس ابلیسانہ سلوک کے جو ہندوستان کے اس حصہ میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے، مجھے جنوبی باشندوں پر بہت بھروسہ ہے۔ میں نے اسلئے انکے تمام بڑے بڑے جلسوں میں غیر مبہم الفاظ میں کہدیا ہے کہ جبتک یہ لعنت ہم میں سے نہ جائیگی، سوراج حاصل نہ ہو سکیگا۔ میں نے اسلئے کہدیا ہے کہ تقریباً تمام دنیا میں ہمارے ساتھ کوڑھیوں کا سا جو سلوک کیا جاتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی قوم کے پانچویں حصہ کیساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ تحریکِ عدم تعاون تبدیلیِ دل کی دعوت دیتی ہے نہ صرف انگریزوں کو بلکہ ہمیں بھی۔ بلاشبہ میں یہ تبدیلی اپنے آدمیوں میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اسکے بعد انگریزوں میں وہ تبدیلی خود بخود پیدا ہو جائیگی۔ جو قوم زمانہ دراز کی لعنت کو ایک سال کے اندر دور کر سکتی ہے۔ جو شراب کی عادت کو اس طرح سے دور کر سکتی ہے جس طرح سے ہم اپنے کپڑوں کو اتار کر پھینکدیتے ہیں، جو اپنی قدیم صنعت کی طرف پھر رجوع ہو سکتی ہے اور اپنے خالی اوقات میں ساٹھ کروڑ کی مالیت کا کپڑا تیار کر سکتی ہے اس کی بہت جلد کایا پلٹ جائیگی اس کی تبدیلی کا دنیا بھر پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اگر یہ بات پایۂ تکمیل کو پہونچ جائےگا جیسا کہ میرا خیال ہے کہ وہ پہونچے گی تو وہ ہر ہنسنے والے کے لئے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کا حتمی ثبوت ہو گا۔ اور اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی اس

طریقہ سے کایا پلٹ گئی تو اس وقت دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان کے سوراج قائم کرنے کے حق کو نہیں چھین سکے گی

ان تاریک بادلوں کے باوجود جو ہندوستان کے مطلع پر مجتمع ہو رہے ہیں، میں یہ پیشگوئی کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جونہی ہندوستان اچھوتوں کیساتھ اپنے سلوک سے تائب ہو جائیگا اور غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کرلیگا اسیوقت یہی انگریز حکام جن کا دل بظاہر سخت ہوگیا ہے، ہندوستان کا آزاد اور بہادر قوم کی حیثیت سے پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔ یہ تبدیلی کسی پیچیدہ قسم کے میکنیکل عمل سے حاصل نہیں ہوسکتی بشرطیکہ خدا کا فضل وکرم ہمارے شامل رہا۔ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہم سے ہر ایک کے دل میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر رہا ہے"

مگر وہ جنوبی ہندوستان میں ایک ہی حملہ سے مطمئن نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے بار بار حملے کئے۔ وہ خود جنوبی افریقہ میں تمام ہندوستانی جماعت کیساتھ جس میں اکثر اعلیٰ ذات کے ہندو تھے عیسائیوں کے طرز عمل سے سخت تکلیف اٹھا چکے تھے۔ اگرچہ ہندوستان میں وہ شاذونادر ہی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاہم میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ میں انکی باتوں کو بھول جاؤں جو خود میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں مشاہدہ کی ہیں

مثلاً میں کس طرح سے دہشت اور پریشانی کا وہ صدمہ فراموش کرسکتا ہوں جو مجھے ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ جنوبی افریقہ پہونچنے پر ہوا؟ آرک ڈیکن گودی پر مجھ سے نہایت محبت آمیز طریقہ سے ملے اور مجھ سے گرجا میں وعظ کہنے کی درخواست کی یہ کرسمس کے بعد کا پہلا اتوار تھا اور میں نے تمام بنی نوع انسان کے ساتھ صلح وآشتی

کے عیسائی موضوع پر وعظ کہا۔ مجھے اس کی اصلا خبر نہیں ہوئی کہ دوران وعظ میں کوئی واقعہ رونما ہو چکا ہے لیکن مسٹر گاندھی نے میرے دوست اور رفیق مسٹر ڈبلیو، ڈبلیو پیئرسن مانچسٹری سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود میری تقریر سننا پسند کرینگے۔ چنانچہ مسٹر پیئرسن انہیں گرجا کے دروازے تک لے بھی گئے تھے اور انہیں اندر جانے سے روک دیا گیا تھا حالانکہ نہایت اخلاق کیساتھ وہ تمام حالات بیان کردئے گئے جن کے ماتحت درخواست کی گئی تھی اور ان سب کو معلوم تھا کہ جس شخص کو اندر جانے سے روکا جارہا ہے وہ کون ہے۔ اس طرح سے مسٹر گاندھی جنوبی افریقہ میں یورپین عیسائی مجمع کی نظر میں ایک بار یہ قرار دئے گئے۔ اسی لئے میں دوبارہ تشریح کئے دیتا ہوں کہ میں نے "ہماری اور انکی ذلت" کے عنوان کو اسی خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے، کیونکہ ہم مغرب کے رہنے والوں کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ اس ذلت میں عیسائی اور ہندو دونوں شریک ہیں

آخر میں میں اس شریفانہ جد وجہد کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ٹراونکور کے مقام وائیکوم میں مسٹر گاندھی کی زیر ہدایت جاری کی گئی تھی جبکہ وہ بمبئی کے قریب جوہو جیسے دور دراز مقام میں صاحب فراش تھے وہ چھوت چھات کے خلاف جہاد میں ایک فیصلہ کن موقع پیش کررہی تھی۔ میں وائیکوم کی جد وجہد میں بذات خود موجود تھا اور اسلئے میں ایک شاہد کی حیثیت سے اسکا حال لکھ سکتا ہوں

وائیکوم ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسکے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا مندر ہے گاؤں کا بڑا راستہ جو آمد ورفت کی اہم جگہ ہے مندر کے دونوں طرف سے ہو کر جاتا ہے جو مرکز کو عین اسی موقع پر تقسیم کردیتا ہے۔ ملک کے اس نشیبی گاؤں کی آبادی میں بہت سے

اچھوت بھی رہتے ہیں لیکن چونکہ برہمنوں کے مکانات مندر کے قرب و جوار میں واقع ہیں اس لئے اچھوتوں کو ہمیشہ سے مندر کے پہلو کے قریب سے برہمنوں کے علاقہ میں سے ہو کر شاہراہ پر جانے کی ممانعت رہی ہے اس وجہ سے مجبوراً وہ لمبا راستہ کاٹ کر وہاں پہونچتے ہیں۔ ایک نوجوان شامی عیسائی جارج جوزلیف نامی جو مسٹر گاندھی کا پیرو بھی تھا اور باعتبار پیشہ بیرسٹر تھا سب سے پہلے اس غیر انسانی ممانعت کے خلاف مقاومت مجہول پیش کرنیکا ارادہ کیا وہ اپنے ساتھ ممنوعہ راستہ پر سے ایک اچھوت کو بھی لے گیا۔ ان دونوں کو سڑک گندا کرنے کے الزام میں خوب زدو کوب کیا گیا۔ اس کے بعد پولیس نے مداخلت کی. جب جارج جوزلیف نے ایک پارٹی کی معیت میں دوبارہ کوشش کی تو ریاست کی پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا

اس کے بعد فوراً ہی تحریک کی اسکیم کے مطابق ساری جماعت نے جو اپنے لیڈر کے ساتھ تھی اسی طریقہ سے مقاومت مجہول اختیار کیا۔ اور بالآخر وہ بھی گرفتار ہو گئی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ریاست کے قید خانے مزید بار کو برداشت کرنے کے ناقابل ہو گئے۔ پھر اس تحریک کا دوسرا دور شروع ہوا۔ پولیس کو ہدایات کی گئیں کہ وہ سڑک پر رسیوں سے حلقہ بنالے اور صرف اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو گذرنے دے اور اچھوتوں کو روک لے۔ اس پر مقاومت پیش کرنے والے اشخاص حلقہ کے باہر کھڑے ہو کر اچھوتوں کی معیت میں روزانہ دعائیں مانگا کرتے۔ جس کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ اس تمام عرصہ میں برہمنوں اور ریاست کے حکام کے اخلاقی

ضمیر سے مختلف طریقوں سے اپیل کی گئی تمام جدوجہد کے دوران میں تشدد کا ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا بلکہ ہر کام گہرے مذہبی جذبہ کے ماتحت عمل میں آتا رہا

نازک مرحلہ اس وقت شروع ہوا جبکہ ملک کا یہ حصہ موسم برسات میں زیرآب آگیا۔ سڑک پر اتنا پانی جمع تھا کہ مقاومت مجہول کرنے والوں کی کمریں اس میں ڈوب جاتی تھیں۔ ریاست کی طرف سے فوجی پولیس کو سڑک کے آرپار کشتیاں رکھنے کا حکم مل گیا تھا۔ تاکہ گارد پہ ہونے کی حالت میں وہ ان میں کھڑے رہ سکیں۔ مقاومت مجہول کرنے والوں کی حالت دن بدن زیادہ قابلِ رحم ہوتی گئی لیکن انھوں نے ان تمام تکلیفوں کو بہادری سے برداشت کیا اور ایک منٹ کے لئے بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ انجام کار کئی مہینوں تک مشقتیں برداشت کرنے کے بعد ریاست نے برہمنوں کی رضامندی سے سڑک کو اچھوتوں کے لئے کھول دیا۔ وائیکوم کا معرکہ سر کر لیا گیا۔ نہ صرف اس ایک سڑک کے لئے بلکہ دوسرے مقامات پر برہمنوں کے مرکزی مقامات میں بھی۔ اس کے بعد سے اسی قسم کے مقاومت مجہول کے بہت سے معرکوں نے اس طریقہ کار کے موثر ہونے کے ثبوت بہم پہونچائے ہیں یعنی یہ کہ اپنی باری سے تلخی و بدمزگی کی تازہ خرابیوں کو پیدا کئے بغیر ایک خرابی کا تدارک کیا جا سکتا ہے[1]

[1] دیکھو ضمیمہ ۶

خیالات

مہاتما گاندھی

جس میں ان کی تحریرات کے منتخبات بھی شامل ہیں

مصنفہ

سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز

حصہ ۲

نقش اول

تعداد اشاعت ۱۰۰۰

فہرست مضامین

حصۂ دوم

تاریخی ماحول

ابواب		صفحہ
۱۰ — "اعلان معتقدات، سنہ ۱۹۰۹ء"	...	۲۴۹
۱۱ — جنوبی افریقہ میں مقاومت مجہول	...	۲۵۸
۱۲ — "ٹالسٹائی فارم"	...	۲۷۷
۱۳ — ہندوستان میں ستیاگرہ	...	۲۹۸
۱۴ — "ہر انگریز کے نام"	...	۳۱۴
۱۵ — "سنتری اعظم"	...	۳۴۳
۱۶ — فسادات بمبئی	...	۳۷۸
۱۷ — مقدمہ اور قید	...	۳۹۷
۱۸ — دہلی کا برت	...	۴۱۴
۱۹ — ہندوستان کی تحریک نسواں	...	۴۴۰
۲۰ — گاندھی کے ساتھ ایک صبح	...	۴۵۵
۲۱ — خاتمہ	...	۴۷۷
ضمیمہ جات	...	۴۸۱

بلبلِ ہند

مسز سروجنی نائیڈو

کے نام

حصّہ دوم

تاریخی ماحول

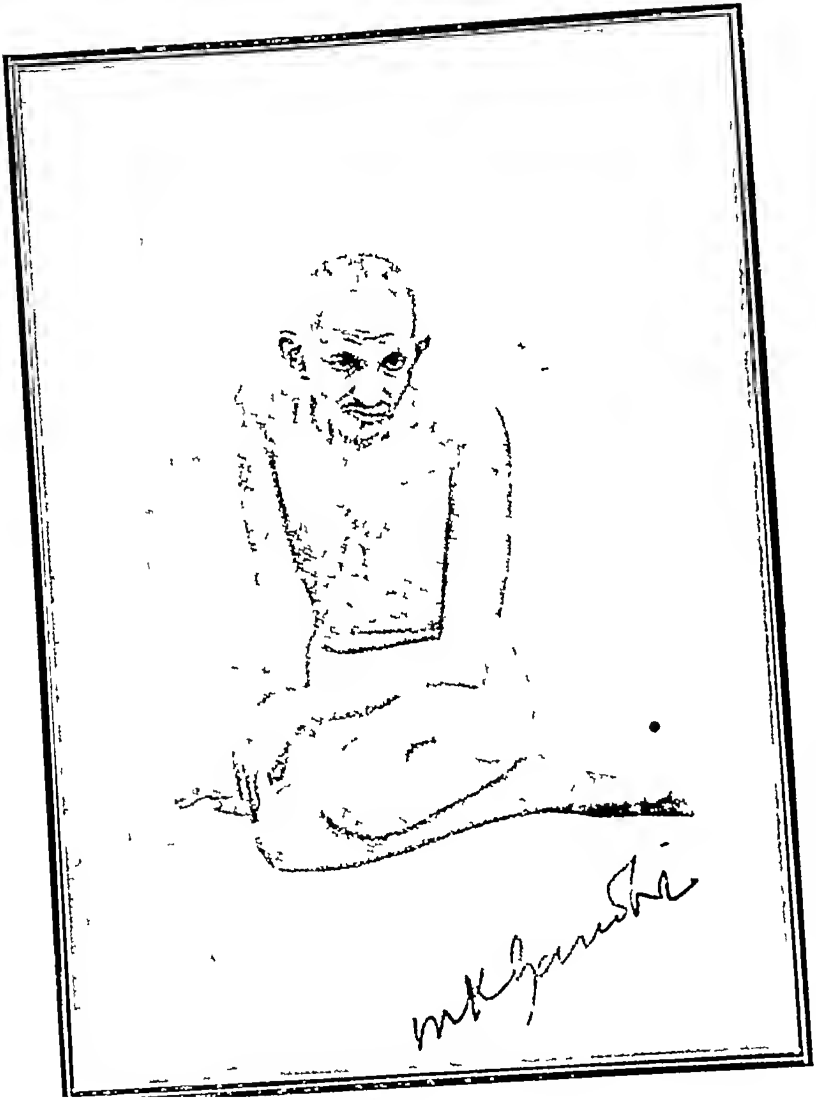

باب دہم

"اعلانِ معتقدات ۱۹۰۹ء"

مضامینِ مہاتما گاندھی کی ایک جلد میں جسے میرے دوست آنریبل جی، اے نیٹسن (مدراس) نے شائع کیا ہے جس کا کئی سال ہوئے دیباچہ لکھنے کی فرمائش بھی انھوں نے مجھ سے کی تھی، غیر معمولی دلچسپی کی ایک تحریر درج ہے۔ اس تحریر کا عنوان ہے "اعلانِ معتقدات، ۱۹۰۹ء" اور وہ مسٹر گاندھی کی زندگی کے اس دور کے خیالات پر حاوی ہے جبکہ ٹالسٹائی کا رنگ ان پر بہت گہرا چڑھا ہوا تھا۔ اُس زمانہ میں ٹالسٹائی کے ساتھ خط وکتابت بہت زوروں پر تھی اور وہ ٹالسٹائی کی اجازت سے دنیا میں اس خط کی تشہیر کرچکے تھے جسے ٹالسٹائی نے "ایک ہندو نامہ نگار" کے نام بھیجا تھا۔ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ یہ اجازت اس لئے طلب کی تھی کہ ٹالسٹائی کے مذہبی خیالات برسوں تک خود ان کی ذاتی مذہبی مشکلات کے دوران میں ان کے لئے شمع ہدایات بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے ٹالسٹائی کے پیروی کی حیثیت سے جوہنسبرگ کے قریب لالی کے مقام میں یورپیوں اور ہندوستانیوں کیلئے جو زراعتی بستی قائم کی تھی، اس کا نام بھی انھوں نے "ٹالسٹائی فارم" رکھا تھا۔[1]

---

[1] دیکھو باب یازدہم

اُن کے بارے میں جو بیان خود انھوں نے دیا ہے، اسے آگے چل کر پیش کیا گیا ہے[1]

جہاں "اعلان معتقدات" بہ حیثیت تحریر کے ان کے گذشتہ بیس سال قبل کے خیالات کا آئینہ دار ہے وہاں یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اس کے بعد سے وہ خاموش ہو گئے ہیں۔ ان کی شخصیت فطرتاً اس قدر طاقتور واقع ہوئی ہے کہ اس کی اُن کی ذات سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ٹالسٹائی کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اُن کے پروگرام کے اقتصادی پہلو نے ایک مخصوص ہیئتِ ترکیبی اختیار کر لی تھی جس میں استقلال کی علامات صاف ظاہر تھیں۔ اہنسا اور کھدر کے دقیق مسائل پر وہ اپنی رائے قائم کر چکے تھے

ان اہم مسائل کے متعلق ان کے طرز عمل میں غالباً سب سے عظیم الشان تبدیلی سنہ ۱۹۲۰ء میں رونما ہوئی جبکہ وہ بادلِ ناخواستہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ فی الحال انہیں برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے نزدیک وہ تشدد کی روح کا مظہر بننی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس معاملہ میں بھی انھوں نے ہمیشہ اس جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے جو کامل اور آخری انقطاعِ تعلقات کی حامی رہی ہے اور ہمیشہ یہی رائے رکھی کہ اب بھی انگریزوں کے دلوں میں تبدیلی ممکن ہے انسانی زندگی میں مشینری (کلوں) کو جو درجہ حاصل ہونا چاہیئے،

[1] دیکھو باب دوازدہم

اس کے بارے میں مجھے ان کی حال کی بعض تقریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۹ء میں جو تحریر انھوں نے قلم بند کی تھی، اس کی بعض مندرجہ باتوں میں وہ کچھ کچھ ترمیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں دس سال قبل دہلی میں طبیہ کالج اور طبیہ اسپتال کا افتتاح کرتے وقت انھوں نے صراحت کر دی تھی کہ جدید مغربی طب کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے ساتھ انہیں ہمدردی ہے۔ اس کی مزید شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں سیسون ہاسپٹل میں کرنل میڈک[1] کے ہاتھوں زائدۃ الآور کے مرض میں آپریشن کرانے پر پوری پوری رضامندی دیدی تھی۔ اُس وقت میں ان کے ہمراہ تھا اور تعریف اور شکریہ کے جو الفاظ انھوں نے اپنی نرس اور اپنے ڈاکٹر کی قابلیت اور محبت آمیز مہربانی کے بارے میں استعمال کئے تھے وہ درحقیقت ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے

لہٰذا جہاں ۱۹۰۹ء کے اس "اعلان معتقدات" کے ہر لفظ کے متعلق یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اُن کے ۱۹۲۶ء کے معتقدات پر بھی پورے طور پر چسپاں ہوتا ہے، وہاں اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ بیس سال قبل اُن کا بنیادی تخیل کیا تھا جو عملاً اُن کی حال کی ساری تحریکات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح سے وہ تحریر سوانح حیات قلمبند کرنے والے شخص کے لئے ایک بہت اہم تاریخی دستاویز کا کام دیتی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مسٹر گاندھی نے ۱۹۰۹ء کے "اعلان معتقدات" میں جو کچھ باتیں اِسقدر

---

[1] Col Maddock.

اختصار اور سادگی سے بیان کی ہیں وہ زیادہ مبسوط اور مفصل طریقہ سے اُن کے رسالہ "انڈین ہوم رول" میں ملیں گی جو تقریباً اسی زمانہ میں تحریر کیا گیا تھا۔ وہ ابھی تک اس کتاب کو شائع ہونے دیتے ہیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کی زندگی کے تحیلی دور میں جب وہ جنوبی افریقہ کی مہم میں مصروف تھے، ان کے خیالات اور محسوسات کیا تھے

"جدید تہذیب" کے خلاف ان کی بغاوت ۱۹۰۹ء میں غالباً اپنے شباب پر تھی۔ وہ جہاں تک عملاً ممکن ہو سکتا تھا، کاونٹ ٹالسٹائی کی تقلید کرنے پر تیار تھے۔ یہ بیان کرنا بھی درست ہے کہ جب سے انھوں نے "اعلانِ معتقدات" تحریر کیا ہے اس وقت سے لے کر اب تک ہمارے جدید طریقوں کے بارے میں ان کی بنیادی مخالفت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، نہ انھوں نے خود اپنے ذاتی عادات واطوار میں کوئی ترمیم کی ہے اور نہ انہیں دورِ جدید کے مطابق کرنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اب تک وہ دل وجان سے اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ دیہاتی تہذیب ہی بنی نوعِ انسان کے لئے واحد مطمحِ نظر ہے اور وہ اپنے معتقدین سے ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ وہ زمین سے بالکل چمٹے رہیں اور اس طرح سے اپنی روزی کمانے کے لئے محنت کریں

جب عدمِ تعاون کی تحریک کے دوران میں ان کی زندگی کا نازک ترین مرحلہ آیا اور انہیں سماعتِ مقدمہ کے لئے جج کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت انھوں نے بتایا کہ وہ باعتبار پیشہ "کسان اور جلاہے" ہیں۔ اس

طرح سے اور اپنی روزمرہ کی پوشاک اور روزمرہ کی ہاتھ پاؤں کی محنت سے وہ ابھی اس خیال پر قائم ہیں کہ کسان کی زندگی بنی نوع انسان کے لئے نہایت ہی خوشگوار پیشہ ہے۔ وہ ابھی تک شہری زندگی کو اسکی مکینیکل ترکیبوں اور رہنے سہنے کے غیر قدرتی طریقوں کو مخرب اخلاق خیال کرتے ہیں

اُن تمام واقعات پر جو سنہ ۱۹۰۹ء سے لے کر اب تک گذر چکے ہیں نظر ڈالتے ہوئے اُن کے وہ الفاظ جو انھوں نے جرمنی اور انگلستان کے بارے میں اپنے "اعلانِ معتقدات" میں تحریر کئے ہیں یعنی یہ کہ وہ "موت کے ہال میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں"، واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ بہت غور طلب ہیں اور ہمیں اپنے دل سے یہ عمیق سوال پوچھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آیا ہم اہلِ یورپ آج بھی "موت کے ہال ہی میں زندگی بسر کر رہے ہیں"؟

ان کا سنہ ۱۹۰۹ کا "اعلانِ معتقدات" حسب ذیل ہے:-

"(۱) مشرق و مغرب کے درمیان کوئی ایسی روک حائل نہیں جسے عبور نہ کیا جا سکتا ہو

(۲) مغربی یا یورپین تہذیب درحقیقت کوئی تہذیب نہیں ہے لیکن تہذیب کی ایک جدید شکل ہے جو خالصتاً مادی ہے

(۳) یورپ کے باشندوں میں اس سے قبل کہ وہ جدید تہذیب سے آشنا ہوئے اور مشرق کے باشندوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں

(۴) برطانوی باشندے ہندوستان پر حکومت نہیں کر رہے ہیں بلکہ جدید تہذیب اپنی ریل، تار، ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ ہندوستان پر حکمران ہے

(۵) بمبئی، کلکتہ اور دوسرے بڑے بڑے شہر درحقیقت ہند جدید کے لئے حقیقی معنوں میں طاعون کے مرکز ہیں

(۶) اگر برطانوی حکومت کی جگہ پر کل کو ہندوستانی حکومت جدید طریقوں پر قائم ہو جائے تو اس صورت میں ہندوستان کی حالت کچھ بہتر نہیں ہو جائے گی، سوائے اس کے کہ وہ اُس روپے کا کچھ حصہ اپنے قبضہ میں رکھ سکیگا جو آج انگلستان کو چلا جاتا ہے

(۷) مشرق و مغرب درحقیقت صرف اس وقت مل سکتے ہیں جبکہ مغرب تہذیب جدید کو کلیتاً خیرباد کہدے، بظاہر وہ اس وقت بھی مل سکتے ہیں جبکہ مشرق بھی تہذیب جدید کو اختیار کرلے لیکن وہ ملنا اس عارضی صلح کی مانند ہوگا جو تلوار کے زور سے قائم رکھی جائے بعینہٖ جس طرح سے آج جرمنی اور انگلستان کی حالت ہے۔ یہ دونوں قومیں "موت کے ہال" میں زندگی بسر کر رہی ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے کو ہڑپ نہ کر سکیں

(۸) یہ محض گستاخی ہوگی اگر کوئی شخص یا اشخاص کی کوئی جماعت ساری دنیا کی اصلاح کرنا شروع کردے یا اس پر غور کرنے لگے۔ اعلیٰ درجہ کی مصنوعی اور تیز رفتار ذرائع رسل و رسائل کی امداد

سے بھی ایسا کرنے کی کوشش کرنا درحقیقت ایک ناممکن کام کرنے کی کوشش کرنا ہے

(۹) عام اصول کی حیثیت سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مادّی آرام و آسایش کی زیادتی کسی نوع اخلاقی نشو و نما کا باعث نہیں ہو سکتی

(۱۰) علم طب جادو کا مجموعی نچوڑ ہے عطائی پن اجتماعی طبّی علم سے لاکھ درجہ بہتر ہے

(۱۱) اسپتال وہ ذرائع ہیں جنھیں شیطان اپنے مقصد کے لئے اس لئے استعمال کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ اپنی سلطنت پر قبضہ رکھے۔ وہ بدی، مصیبت، ذلّت اور حقیقی غلامی کو ابدیت بخشتے ہیں۔ مجھ سے چوک ہو گئی تھی جبکہ میں نے خیال کیا تھا کہ مجھے طبّی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ میرے لئے یہ گناہ کی بات ہے کہ میں ان تمام نفرت انگیز کارروائیوں میں ذرا سا بھی حصہ لوں جو اسپتالوں میں کی جا رہی ہیں [1] اگر امراضِ مقاربتی کے لئے یا امراضِ سل و دق کے لئے بھی کوئی اسپتال نہ ہوتے تو آج ہم میں سل و دق کم ہوتی اور امراضِ خبیثہ میں بھی بہت کمی ہوتی

(۱۲) ہندوستان کی نجات اس میں ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں جو باتیں اس نے سیکھی ہیں انہیں فراموش کر دے۔ ریلیں، تار، اسپتال، قانون دان، ڈاکٹر اور اسی قبیل کی اور چیزیں سب کی سب غائب

[1] وہ دراصل زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں

ہوجانی چاہئیں، اور مام ہنا د اعلیٰ طبقوں کو شعورًا، مذہبًا اور ارادتًا کسان کی سی سادہ زندگی بسر کرنی چاہیئے یہ جانتے ہوئے کہ صرف یہی زندگی سچی مسرت دیسکتی ہے

(۱۳) ہندوستان کو مشین کا بنا ہوا کپڑا استعمال ہنیں کرنا چاہیئے خواہ وہ یورپ کی ملوں کا ہو خواہ ہندوستان کی ملوں کا

(۱۴) انگلستان اس کام میں ہندوستان کی امداد کرسکتا ہے اور پھر کہیں وہ ہندوستان پر اپنا قبضہ رکھنے میں حق بجانب ہوگا۔ انگلستان میں آج بہت سے اشخاص ایسے ہیں جو اس قسم کا خیال رکھتے ہیں

(۱۵) قدیم زمانہ کے رشی صحیح معنوں میں عقلمند تھے اسلئے کہ انھوں نے لوگوں کے مادی حالات کو محدود کرکے سوسائیٹی کو باقاعدہ بنا دیا تھا، پانچہزار برس پہلے کا بھدا ہل آج بھی کسان کے ہاتھ میں ہے اسی میں نجات مضمر ہے۔ ایسے حالات کے ماتحت لوگ بڑی عمر تک زندہ رہتے ہیں بہ مقابلہ امن کی حالت کے، اس سے کہیں زیادہ عمر تک جو اہل یورپ کو جدید جد وجہد اختیار کرنے کے بعد میسر آئی ہے، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہر روشن خیال شخص، اور یقینًا ہر ایک انگریز بشرطیکہ وہ پسند کرے اس حقیقت کو معلوم کرسکتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرسکتا ہے

یہ مقاومت مجہول ہی کی سچی روح ہے جس نے مجھے مذکورہ بالا قریب قریب مخصوص نتائج پہونچنے میں مدد دی ہے۔ مقاومت

مجہول یا عامل ہونے کی حیثیت سے میں اس امر سے بالکل غیر متعلق ہوں کہ اتنی عظیم الشان اصلاح (کیا میں اُسے یہ نام دے سکتا ہوں؟) ایسے لوگوں میں پیدا کیجا سکتی ہے جو موجودہ مجنونانہ تگ و دو میں مگن ہیں اگر مجھے اسکی سچائی کا احساس ہے تو مجھے اسکی پیروی کرنے میں مسرت محسوس ہونی چاہیے اور اسلئے مجھے انتظار نہیں کرنا چاہیے اسوقت کا کہ سب لوگ ابتدا کر سکیں

ہم میں سے سبکو جو ہم خیال ہوں، ضروری کارروائی کرنیکی ابتدا کرنی پڑیگی اور باقی آدمی بشرطیکہ ہم سچائی پر ہوئے لازماً ہماری پیروی کرینگے۔ نظریہ موجود ہے، ہمارا طریق عمل حتی الامکان بتائیگا کہ اسے عملی جامہ کیسے پہنایا جا سکتا ہے تگ و دو کے درمیان رہتے ہوئے ممکن ہے کہ ہم اپنے تئیں اسکے داغ سے بالکلیہ پاک و صاف رکھ سکیں۔ ہر دفعہ جب میں ریل گاڑی میں سوار ہوتا ہوں یا موٹر بس میں بیٹھتا ہوں، میں واقف رہتا ہوں کہ میں سچائی کے احساس کے ساتھ تشدد کر رہا ہوں

میں اس بنا پر منطقی نتیجہ سے خائف نہیں ہوں جس زمانہ میں تیز رو گاڑیاں موجود نہ تھیں، اسوقت اساتذہ اور واعظین پیدل چلا کرتے تھے اور اپنی صحت کی بحالی کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی خاطر تمام خطرات کا مقابلہ کرتے تھے، اس وقت بنارس اور جاترا کے دوسرے مقامات مقدس شہر کہلاتے تھے، حالانکہ آج وہ نفرت کے مرکز ہیں"

باب یازدہم

جنوبی افریقہ میں مقاومتِ مجہول

جنوبی افریقہ کی تاریخ میں جو واحد چیز مہاتما گاندھی کے نام کو اس قدر ممتاز و نمایاں کرتی ہے وہ اُن کی تحریکِ مقاومتِ مجہول ہے۔ اس عجیب و غریب ہتھیار کو انھوں نے اپنی خداداد قابلیت کی بدولت سب سے پہلے ایجاد کیا اور اسے ٹھیک ٹھاک کر کے قابلِ استعمال بنایا اور پھر بعد میں انھوں نے اخلاقی جنگ آزمائی کے لئے حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ اُس کا استعمال کیا۔ جنوبی افریقہ میں اپنے ہم ملکیوں کے لئے جو طول طویل جد و جہد انھوں نے جاری رکھی جس میں جنرل اسمٹس[1] ان کے مقابل تھے، اُس میں انھوں نے سوائے اس ہتھیار کے اور کوئی حربہ استعمال نہیں کیا۔ جس وقت انھوں نے تحریک کا آغاز کیا اس وقت ہندوستان کا نام عامۃ الناس کی نظروں میں اس قدر گرا ہوا تھا کہ خود ان کو اور ان کے تمام ساتھیوں کو جنرل بوتھا[2] جیسے تعلیم یافتہ اشخاص قلی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ تیئیس سال کی مدت میں انھوں نے ہندوستان کے نام کو ایسی اخلاقی بلندی پر پہونچا دیا کہ جب وہ جنوبی افریقہ سے رخصت ہوئے ہیں تو یورپین اشخاص نے فیاضانہ طریقہ

[1] Gen. Smuts. [2] Gen. Botha.

سے الوداع کہی اور ان کے لئے اور ان کے ساتھیوں کے لئے اپنے دلی احترام کا اظہار کیا

مسٹر گاندھی سے پہلے بھی بہت سے لوگ مقاومتِ مجہول میں شریک رہ چکے تھے، لیکن جن اشخاص نے یہ کارروائی کی تھی ان کا طریقہ کچھ اسقدر علیحدگی کا پہلو لئے ہوئے تھا کہ اس کے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہو سکے۔ انھوں نے صرف واتی طور پر اپنا اثر ڈالا تھا لیکن مسٹر گاندھی کی تحریک کا راز یہ تھا، سب سے پہلے انھوں نے اجتماعی اخلاقی قوت کو منظم کیا اور بالآخر وہ جنوبی افریقہ میں سخت ضابطہ کے بعد قوم کو ایسے مستحکم طریقہ سے متحد کرنے کے قابل ہوگئے کہ وہ ضمیر کی خاطر بہ حیثیت جماعت کے زیادہ سے زیادہ تکالیف برداشت کرنے کے لئے آمادہ و تیار ہو گئی۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہو گا کہ عیسائی کلیسا کی ابتدائی تاریخ کے بعد سے مقاومتِ مجہول کی ایسی موثر کارروائیاں جن کی رہبری مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تھی آج تک منظم شکل میں دیکھنے میں نہیں آئیں

لوگ اب اس مقاومتِ مجہول کی لاثانی اہمیت اور طاقت کے قائل ہو چکے ہیں اور گاندھی کا نام اس تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے عوام کی نظروں میں بلند ہو رہا ہے۔ پروفیسر گلبرٹ مرے[1] نے ایک پُر زور مضمون میں جس کا عنوان "روح کی زندگی تھا" اور جو پہلے پہل "ہبرٹ جرنل"[2] میں شائع ہوا تھا، عالمگیر اہمیت رکھنے والی زبردست ہستی کی حیثیت سے

---

[1] Gilbert Murray [2] Hibbert Journal

اُن کا ذکر کیا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد سے شایستہ اور متمدن دنیا کے ہر حصّہ میں ان کا نام تقریباً ہر گھر میں مشہور ہو چکا ہے اور ہر برّ اعظم کی مظلوم اقوام انہیں اپنے حقوق کا محافظ سمجھنے لگ گئی ہیں

لٰہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خود مہاتما گاندھی کے منہ سے ان بنیادی جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جو اس لاثانی اخلاقی تحریک کو ایسی حیرت افزا روحانی قوت کے ساتھ چلانے کے محرک ہوئے ہیں۔ ریورینڈ جے، جے، ڈوک[1] نے جو جوہنسبرگ میں بیپٹسٹ فرقہ کے پادری تھے، اور مہاتما گاندھی کے نہایت گہرے دوستوں میں تھے ایک چھوٹی سی اور مقابلتاً غیر معروف کتاب میں ان کی تشریح کردی تھی، اس کتاب میں وہ گفتگو تمام و کمال محفوظ ہے جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مقاومتِ مجہول یا روحی طاقت خود مہاتما گاندھی کے لئے کس طریقہ سے ایک زندہ الہام بن گئی۔ مسٹر ڈوک رقمطراز ہیں:-

ایک دن میں نے مسٹر گاندھی سے پوچھا کہ آپ نے مقاومت مجہول کا بنیادی خیال کہاں سے اخذ کیا ہے

انھوں نے فرمایا: "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا اسوقت میں نے ایک گجراتی نظم زبانی یاد کی تھی اور جس کا ایک شعر میرے دل میں کھُب گیا تھا۔ مجھے وہ شعر یاد تو نہیں رہا لیکن مفہوم قریب قریب حسب ذیل تھا:

"اگر کوئی آدمی تمہیں پانی پلائے اور اس کے معاوضہ میں تم بھی اُسے پانی

[1] Rev J. J. Doke.

پلادو تو یہ کچھ بھی نہیں

"حقیقی خوبصورتی یہ ہے کہ تم برائی کا بدلہ نیکی سے دو"

"بچپن میں بھی اس شعر کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا تھا اور میں نے اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد میں نے پہاڑی والے وعظ کا مطالعہ کیا"

میں نے کہا کہ "یقیناً بھگوت گیتا کا مطالعہ آپ نے پہلے کیا ہوگا؟"

انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں۔ بلا شبہ میں نے سنسکرت میں بھگوت گیتا کو اچھی طرح سے پڑھ لیا تھا لیکن میں نے اس باب میں اس کی تعلیمات کا خصوصیت کے ساتھ کوئی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ درحقیقت عہدِ جدید ہی نے مجھے مقاومتِ مجہول کی حقانیت اور اہمیت کا درس دیا تھا

"جب میں نے پہاڑی والے وعظ میں ایسے فقرات پڑھے کہ 'اُس کا مقابلہ مت کرو جو برا ہے، لیکن جو کوئی شخص تیرے سیدھے گال پر طمانچہ مارے تو تو بایاں گال بھی اس کی طرف کردے' اور 'اپنے دشمنوں سے محبت کر، اُن لوگوں کے لئے دعا کر جو تجھکو ستاتے ہیں تاکہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے بن سکو'، تو مجھے بیحد مسرت ہوئی اور میری رائے کی تصدیق ایسی جگہ سے ہوگئی، جس کی مجھے مطلق توقع نہ تھی۔ بھگوت گیتا نے اس رائے کو اور زیادہ استحکام بخش دیا اور ٹالسٹائی کی کتاب 'خدا کی بادشاہت خود تمہارے اندر ہے' نے اسے ایک مستقل صورت دیدی

"مجھے خود مقاومتِ مجہول کا نام پسند نہیں ہے۔ اس سے میرا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اُس سے صرف طریقہ کا اظہار ہوتا ہے اور اس نظام کی طرف

جس کا وہ جنذ ہے، ذرا بھی اشارہ نہیں کرتا۔ حقیقی خوبصورتی (اور یہی میرا مقصد
ہے) یہ ہے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے
باوجود اس کے میں اس نام کا استعمال کرتا ہوں کیونکہ یہ اب مشہور ہو گیا
ہے اور آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور نیز اس وجہ سے کہ میرے اکثر ہم وطن
بآسانی اُسے سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے خیال میں وہ خیالات جو
متذکرہ بالا گجراتی گیت میں اور پہاڑی والے وعظ میں ادا کئے گئے ہیں، ایک
زمانہ میں سازی زندگی میں انقلاب پیدا کرنیوالے ثابت ہوں گے

"مقاومت مجہول دو دھاری تلوار ہے؛ اُسے ہر طرح سے استعمال
کیا جا سکتا ہے: وہ اُس کے استعمال کرنے والے پر بھی برکت نازل کرتی ہے،
اور اس پر بھی جس کے خلاف اسے استعمال کیا گیا ہے، بغیر اس کے کہ خون کا
ایک قطرہ بھی گرے۔ مقاومت مجہول کی تلوار کے لئے میان کی ضرورت نہیں
ہے اور اسے کسی شخص کے پاس سے بہ جبر چھینا بھی نہیں جا سکتا

"چند سال پیشتر جب میں نے ہندوستان کی پبلک زندگی میں عملی دلچسپی لینی
شروع کی اس سے مجھے یہی طریق عمل بہترین معلوم ہوا کہ جب بالآخر معرض وضا
بے اثر ثابت ہوں تو اس وقت اسی کو اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن اس زمانہ
ہماری ہندوستانی جماعت کی غیر منظم حالت میں اسے عملی جامہ پہنانے
کی کوشش مجھے بیکار نظر آئی

"مگر جوہانسبرگ میں جبکہ ایشیاٹک رجسٹریشن ایکٹ کا نفاذ ہوا،
ہندوستانی جماعت ایسے گہرے طریقہ سے متاثر ہوئی اور مشترکہ مقصد کے

لئے وہ اس قدر جوش کے ساتھ متحد ہوئی کہ موزوں و مناسب موقع پر قانون کو بھی توڑنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ کوئی نہ کوئی کارروائی اختیار کرنے پر مصر تھی، اور نو آبادی کے لئے یہ بات بہترین معلوم ہوئی (اور صحیح طریقۂ عمل بھی یہی تھا) کہ وہ مقاومتِ مجہول کے علاوہ اور کوئی خطرناک اقدام نہ کر بیٹھے۔ پارلیمنٹ میں ان کی کوئی آواز نہ تھی اور وہاں انہیں کسی دادرسی کی توقع نہ تھی۔ کوئی شخص بھی اُن کی شکایات سننے پر آمادہ دتیار نہ تھا۔ عیسائی کلیسا بھی بالکل غافل تھے

"اس لئے میں نے مصائب کے اس راستہ کی تجویز پیش کی اور بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد اسے اختیار کر لیا گیا۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں اولڈ امپائر تھیٹر میں ہندوستانیوں کا بہت بڑا اجتماع ہوا جبکہ اصلی صورتِ حالات سے انہیں مقابلہ کرنا پڑ گیا۔ اس وقت عمیق جذبات کے ماتحت اور ہمارے ممتاز اشخاص میں سے ایک صاحب کی تجویز پر انھوں نے حلف اٹھایا اور وعدہ کیا کہ وہ مقاومتِ مجہول پر عمل پیرا رہیں گے

"جیسا میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں، مقاومتِ مجہول غلط فہمی پیدا کرنے والا نام ہے لیکن اس کا استعمال اس لئے کرلیا گیا تھا کہ وہ شہرت پاچکا تھا۔ حقیقی مفہوم 'روحی طاقت' کے استعمال سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کا استعمال اس وقت سے ہو رہا ہے جب سے بنی نوعِ انسان کا آغاز ہوا

"حضرت عیسیٰ، دانیال، سقراط مقاومتِ مجہول یا روحی قوت کے

بہترین علمبردار تھے۔ ان تمام ہادیوں نے اپنی روحوں کے مقابلہ میں اپنے جسموں کی ذرّہ برابر بھی پروا نہیں کی

"ٹالسٹائی زمانۂ حال کے بہترین اور سب سے زبردست شخص تھے جنھوں نے اس اصول کی تبلیغ کی۔ انھوں نے نہ صرف اس کی تشریح کی بلکہ اس کی مطابقت میں اپنی ساری عمر گذاری۔ قبل اس کے کہ یورپ اس سے روشناس ہوا ہو۔ ہندوستان میں اس اصول کو نہ صرف یہ کہ لوگ سمجھتے تھے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے۔ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ روحی طاقت جسمانی طاقت سے بدرجہا اعلیٰ ہے۔ اگر لوگ مظالم کی دادرسی کے لئے صرف روحی قوت کا استعمال شروع کردیں تو موجودہ مصائب میں سے اکثر کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی قوت کے استعمال میں ناکامی کا بالکل اندیشہ نہیں ہے

"برائی کا مقابلہ نہ کرو" کے معنی یہ ہیں کہ برائی کی روک تھام برائی کے ذریعہ نہ کرنی چاہئے بلکہ نیکی کے ذریعہ۔ بالفاظ دیگر مادی طاقت کا مقابلہ مادی طاقت سے کرنے کی بجائے روحی قوت سے کرنا چاہئے۔ یہی خیال ہندوستان کے فلسفہ میں اس طرح سے ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر زندہ چیز کو تکلیف سے آزادی دو۔ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ مقاومت مجہول کا یہ مفہوم مادی طاقت سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ کہ مؤخر الذکر کے مقابلہ میں اس میں کہیں زیادہ جرأت کی ضرورت پڑتی ہے

"اس طاقت کے کامیاب استعمال کے لئے واحد شرط یہ ہے کہ جسم سے

لک روح کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اسے مستقل اور اصلی چیز سمجھا جائے اور تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ذہنی طور پر تصور نہ کر لیا جائے بلکہ اسے زندہ اعتقاد کی حیثیت عطا کی جائے

"ٹرانسوال کی جنگ ہندوستان کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہم ان آدمیوں کے مرتبہ کو بلند کرنے کے کام میں مصروف ہیں جو دنیا کے ہر حصہ میں اپنا کام فخر و مباہات کے ساتھ انجام دیکھیں گے۔ ہم نے اس جنگ میں ذیل کے مفروضات پر شرکت کی ہے۔

"(الف) مقاومت مجہول ہمیشہ مادی طاقت سے زیادہ افضل چیز رہی ہے

'(ب) یورپینوں اور ہندوستانیوں کے بین کوئی پیدائشی تفریق موجود نہیں ہے

"(ج) خواہ ہندوستان میں برطانوی حکام کے خیالات کچھ ہی ہوں، تمام برطانوی قوم کے دل میں یہ دیکھنے کی خواہش موجود ہے کہ ہندوستان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ برطانوی باشندوں اور ہندوستانی باشندوں کے باہمی تعلق کو قطع کرنا ایک بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اگر ہمارے ساتھ آزاد باشندوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے مقامات میں بھی، تو اس صورت میں باشندگان برطانیہ اور باشندگان ہندوستان کا تعلق نہ صرف دونوں کے لئے فائدہ بخش ہوگا بلکہ تمام دنیا کے لئے مذہبی اعتبار سے بے انتہا فائدہ کی چیز ہوگی۔ اور اس طرح معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے بھی بہتیری راہیں میں ہر قوم دوسری قوم کی تکمیل کا ذریعہ ہے

بہتری حاصل کرنے کی غرض سے جو طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں وہ خالص اور

سادہ ہیں۔ تشدد کو خواہ وہ کسی شکل یا صورت میں ہو، یکقلم خارج رکھا گیا ہے مستقل اصلاحات کے حصول کا واحد سچا اور موثر ذریعہ یہی ہے کہ انسان خود تکالیف برداشت کرے۔ ستیاگرہ کرنے والوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ نفرت کا مقابلہ اور اس کی تسخیر محبت کے ذریعہ کریں۔ وہ وحشیانہ یا مادی طاقت کا مقابلہ روحی طاقت کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کسی ارضی بادشاہ یا کسی ارضی نظام کی وفاداری خدا اور اس کے نظام کی وفاداری کے ماتحت ہے

"وہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کے نظام کی اپنے ضمیر کے ذریعہ تشریح کرنے میں ممکن ہے کہ وہ غلطی پر ہوں۔ اگر وہ غلطی پر ہیں تو صرف وہی تکالیف بھوگیں گے اور کائنات کا مسلمہ نظام جوں کا توں قائم رہے گا

"اس عمل میں ۲۵۰۰ ہندوستانیوں نے یا مقیم ہندوستانی آبادی کے نصف حصہ نے یا ٹرانسوال کی مجموعی ہندوستانی آبادی کے پانچویں حصہ نے خطرناک قید و بند کی مصائب برداشت کی ہیں۔ ان میں بعض بار بار جیل خانہ جا چکے ہیں۔ کئی ایک خاندان بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں"

جس وقت ریورینڈ جے ڈوک کے ساتھ یہ گفتگو ہو رہی تھی، ٹھیک اسی وقت کاونٹ ٹالسٹائی (روس) کے پاس سے مسٹر گاندھی کو ایک خط ملا جس میں انہیں اُن کی عجیب و غریب جدوجہد میں ڈھارس بندھائی گئی تھی اور روحانی تنہائی کے اوقات میں انہیں خوش رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ یہ خط اس قدر اہم ہے کہ میں اس میں اختصار نہیں کرونگا اور میں خصوصیت کے ساتھ درخواست کروں گا کہ جو لوگ مسٹر گاندھی کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ نہایت

غور کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں، اس لئے کہ وہ اس زمانہ میں اپنے تئیں ٹالسٹائی کا شاگرد کہتے تھے اور حرفاً حرفاً ان کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ٹالسٹائی کی وہ چٹھی حسب ذیل ہے :-

مجھے آپ کا اخبار ملا اور ستیا گرہیوں کی متعلقہ تمام خبروں کو پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، اور میں نے محسوس کیا کہ جو خیالات ان کے پڑھنے پر میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں انہیں آپ تک پہونچا دوں

جتنی زیادہ عمر میری ہوتی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اب جب کہ میں نہایت واضح طور پر موت کا قرب محسوس کرتا ہوں، میں لوگوں سے کہدینا چاہتا ہوں کہ جو تحریک "ستیا گرہ" کے نام سے مشہور ہے اور جو میرے نزدیک نہایت اہمیت رکھتی ہے اس کے بارے میں میرے واضح خیالات کیا ہیں۔ وہ دراصل اس کے سوائے اور کچھ معنی نہیں رکھتی کہ وہ محبّت کی تعلیم ہے جسے غلط تفسیروں سے خراب نہیں کیا گیا۔ وہ محبت جو نام ہے انسانی روحوں کے اتحاد کی ایک کوشش کا اور اس سے حاصل کردہ جد وجہد کا، انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین اور واحد قانون ہے اور اپنی روح کی گہرائی میں ہر فرد بشر (جیسا کہ ہم نہایت بدیہی طور پر بچوں میں دیکھتے ہیں) اسے محسوس کرتا ہے اور جانتا ہے۔ وہ اس وقت تک سے جانتا ہے جب تک کہ دنیا کی غلط تعلیمات میں وہ پھنس نہیں جاتا۔ اسی قانون کی تلقین سب نے کی ہے۔ دنیا کے ہندوستانی، چینی، عبرانی، یونانی اور رومی حکمانے کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عیسیٰ نے اس قانون کی تشریح نہایت وضاحت کے ساتھ کر دی تھی جبکہ انھوں نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ "محبّت ہی پر تمام قانون اور پیغمبروں کی بنیاد قائم ہے"

لیکن یہ بھانپ کر کہ کہیں یہ محبت کا قانون خرابیاں۔ پیدا کر دے انھوں نے فی الشور اس خرابی کے خطرہ کا اظہار بھی کر دیا تھا جو دنیاوی مفاد میں رہنے والے اشخاص کے لئے اس قدر نئی بات ہے۔ یعنی وہ خطرہ جو ان مفاد کی مدافعت کو قوت کے استعمال کے ذریعہ حق بجانب ٹھہرائے یا جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے "ضربات کا جواب ضربات سے دینا اور غصب شدہ چیزوں کو قوت کے ذریعہ واپس لینا" وغیرہ وہ جانتے تھے جیسا کہ ہر سمجھدار شخص کو جاننا چاہیے کہ زندگی کے بنیادی قانون کی حیثیت سے قوت کا قانون محبت کے نقیض ہے، یہ کہ جونہی تشدد کی اجازت دے دی جائے گی خواہ وہ کسی شکل میں ہو، وہ گویا محبت کے قانون کی ناقابلیت کا اقرار ہوگا اور اس کے ذریعہ قانون محبت کی تکذیب ہو جائے گی۔ ساری عیسائی تہذیب جو بظاہر اس قدر چمکدار ہے اسی بدیہی اور عجیب غلط فہمی اور تضاد پر جو کبھی تو شعوری ہوتا ہے اور کبھی غیر شعوری بنی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب محبت میں قوت دخیل ہو گئی تو گویا محبت مفقود ہو گئی۔ اس وقت پھر محبت قانونِ زندگی نہ رہے گی اور چونکہ قانون محبت نہ ہوگا اس لئے سوائے تشدد کے اور کوئی قانون باقی نہ رہے گا یعنی نہایت طاقتور اشخاص کی حکومت۔ یہ سچ ہے کہ تمام ازمنہ کے باشندوں نے اپنی زندگیوں کو مرتب کرنے میں تشدد کا استعمال کیا ہے

عیسائی اقوام اور باقی تمام دوسری اقوام کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ عیسائی دنیا میں قانون محبت کو صاف اور بدیہی طور پر ظاہر کر دیا گیا تھا حالانکہ کسی دوسری مذہبی تعلیم میں اس کا اس طریقہ سے اظہار نہیں کیا گیا، اور یہ کہ عیسائی دنیا کے لوگ اس قانون کو سنجیدگی کے ساتھ تسلیم بھی کر لیتے اگرچہ

انھوں نے تشدد کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور تشدد ہی پر اپنی زندگیوں کی تعمیر کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عیسائی اقوام کی تمام زندگی ایک مسلسل تضاد ہے اس چیز میں جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں اور اُن اصولوں میں جن پر وہ اپنی زندگیوں کو تعمیر کرتے ہیں یہ تضاد محبت کے مابین جسے قانون زندگی کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے اور تشدد کے مابین موجود ہے جسے تسلیم کرلیا جاتا ہے اور جس کی تعریف کی جاتی ہے، بلکہ زندگی کی مختلف منازل میں اسے ضرورت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً حکمرانوں، عدالتوں اور فوجوں کی طاقت۔ عیسائی دنیا کے باشندوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس تضاد کو بھی نشو ونما ہوتی گئی اور حال ہی میں وہ اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے

اب بظاہر مسئلہ کی شکل یہ ہے: یا تو یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ہم سرے سے کسی عیسائی تعلیم کو تسلیم نہیں کرتے اور زیادہ طاقتور کے اصول کے مطابق اپنی زندگیوں کو مرتب کریں گے، یا یہ کہ ہمارے تمام لازمی ٹیکس، عدالت اور پولیس کے انتظامات لیکن زیادہ تر ہماری افواج کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے

اس سال موسم بہار میں لڑکیوں کے ایک اسکول واقع ماسکو میں مذہبی کتب کے امتحان کے موقع پر موجود ہ ٹیچر اور بشپ نے لڑکیوں سے احکام خداوندی کے بارے میں سوالات کیے، بالخصوص چھٹے حکم کے بارے میں کہ "تو کسی کو قتل نہ کیجیو"۔ صحیح جواب کے بعد بشپ نے بالعموم دوسرا سوال کیا کہ آیا خدائی قانون کے مطابق قتل تمام حالات میں ممنوع ہے اور بد بخت نو عمر لڑکیوں کو سابقہ تعلیم کی رو سے یہی جواب دینے کی تلقین کی گئی تھی کہ "ہمیشہ نہیں"۔ یہ کہ جنگ میں مجرموں کو پھانسی پر چڑھانے میں قتل کی اجازت ہے۔ اس کے باوجود جب ان بد قسمت لڑکیوں میں

سے ایک سے (جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں، وہ کوئی اختراع نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جسے ایک عینی شاہد نے مجھ سے بیان کیا ہے) اس کے پہلے امتحان کے بعد یہ بات دریافت کی گئی کہ آیا قتل ہمیشہ گناہ خیال کیا جاتا ہے، تو وہ جوش میں آگئی اور شرم و حیا کے ساتھ مگر استقلال کے ساتھ اس نے جواب دیا کہ "ہمیشہ" اور بشپ کی تمام لفظی ہیر پھیر کے باوجود اس نے حقیقی یقین کے ساتھ یہ بات کہی کہ عہد عتیق میں قتل کا قطعاً ممنوع ہے اور یہ کہ عیسیٰ نے نہ صرف قتل کو ممنوع قرار دیا ہے بلکہ ہر اس ظلم کو بھی جو ایک بھائی دوسرے کے خلاف کرے۔ اپنی تقریر کی شان و شوکت کے باوجود بشپ خاموش ہو گیا اور جیت لڑکی کی رہی

یہ سچ ہے کہ ہم اپنے اخبارات میں ہوائی پرواز کی ترقی کا، پیچیدہ سیاسی تعلقات کا، مختلف کلبوں اور کنونشنوں کا، مختلف قسم کے یونینوں کا، فن کی نام نہاد ترقیوں کا ذکر کر سکتے ہیں اور جو کچھ نوعمر لڑکی نے کہا اس کے بارے میں خاموش رہ سکتے ہیں لیکن خاموشی سے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسے دنیائے عیسائیت کا ہر فرد خواہ کمی کے ساتھ خواہ زیادتی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور ہمیشہ محسوس کرتا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، انارکزم، سیلویشن آرمی، روز افزوں جرم، بیکاری، امرا کی خوفناک اور مجنونانہ عیاشی اور غربا کی تکالیف، خودکشیوں کی خوفناک زیادتی تعداد، یہ سب اس اندرونی تضاد کی علامات ہیں جسے حل کرنا چاہئے اور بغیر حل کئے بالکل نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور اسے حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قانون محبت کو تسلیم کیا جائے اور تشدد سے انکار کر دیا جائے

اس لئے ٹرانسوال میں آپ کی جدوجہد جیسا کہ دنیا کے اس حصے سے ہم اسے دیکھ سکتے ہیں، نہایت ہی ضروری کام ہے، جو کام اس وقت دنیا میں انجام دیا جا رہا ہے اس میں وہ سب سے زیادہ ضروری ہے جس میں نہ صرف عیسائی اقوام بلکہ دنیا کی تمام اقوام چار دنا چار حصہ لیں گی

یہ امر آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ معمر روسی پیغمبر اور رشی کے الفاظ نے مہاتما گاندھی کو ان کے کاموں میں کہاں تک تقویت پہونچائی۔ ٹرانسوال میں مقاومتِ مجہول کے اختتام کے بعد (جس کی جانب ٹالسٹائی نے اشارہ کیا ہے) انھوں نے نیٹال میں بھی مقاومتِ مجہول کا مظاہرہ کیا تھا جنوبی افریقہ سے اپنی روانگی سے کچھ ہی دن پہلے انھوں نے نیٹال میں مقاومتِ مجہول کے ساتھیوں اور مدد کرنے والوں کو ہمت افزائی کے طور پر ذیل کے الفاظ میں مخاطب کیا تھا:۔

(میں بہت جلد فینکس سے دور جانے والا ہوں اگر یہ اپنے وطن میں نہیں پہونچوں گا، اور اس لئے میں اپنے دلی خیالات پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہوں:۔

گذشتہ آٹھ سال سے ہندوستانی جماعت جس قسم کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے اس پر مقاومتِ مجہول کی اصطلاح صادق نہیں آتی انگریزی میں اس کے مترادف لفظ کے معنی روحی قوت کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹالسٹائی نے بھی اس کا نام روحی قوت یا محبت کی قوت رکھا تھا۔ اگر اس کے انتہائی حدود تک لے جایا جائے تو یہ طاقت مالی یا اور کسی قسم کی مادی امداد سے مستغنی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روحی طاقت میں تشدد کو بالکل دخل نہیں اور اسے صرف

وہی لوگ عملی جامہ پہنا سکتے ہیں جو کلیتاً تشدد کو خیرباد کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جسے افراد اور جماعتیں یکساں طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ سیاسی یا خانگی امور میں بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس کا عالمگیر استعمال ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ ایک مستقل اور ناقابل تسخیر چیز ہے۔ اسے مرد، عورتیں اور بچے بھی یکساں طور پر استعمال کر سکتے ہیں

اُن اشخاص کے لئے جو اپنے تئیں اس قوت کے استعمال کے لئے کمزور خیال کرتے ہوں، وہ ناممکن چیز ہے۔ صرف وہی لوگ جو اس امر کا احساس رکھتے ہیں کہ انسان میں ایک چیز ایسی ہے جو اس کی اندرونی حیوانی قوت سے بالاتر ہے اور یہ کہ موخرالذکر ہمیشہ اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے موثر طریقہ سے مقاومتِ مجہول پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ یہ طاقت تشدد کے لئے وہی حکم رکھتی ہے جو روشنی تاریکی کے لئے رکھتی ہے

سیاسیات میں اس کا استعمال اس ناقابلِ تردید حقیقت پر مبنی ہے کہ باشندوں کی حکومت صرف اسوقت تک ممکن ہے جب تک کہ وہ رضامند ہیں خواہ شعوری طریقہ سے خواہ غیر شعوری طریقہ سے کہ اُن پر حکومت کی جا سکتی ہے۔

ٹرانسوال میں ہم ۱۹۰۷ء والے ایشیاٹک ایکٹ کے ماتحت رہنا نہیں چاہتے تھے اور اُسے اس زبردست قوت کے آگے جھکنا پڑا۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے: (اول) یا تو تشدد استعمال کریں جب کبھی ہم سے کہا جائے کہ ایکٹ مذکور کی پابندی کرو۔ یا (دوم) ایکٹ کے ماتحت جو سزائیں مقرر

ہیں ان کو برداشت کریں اور اس طرح سے اپنی اندرونی خفیہ روحانی طاقت کا مظاہرہ کریں اتنی مدت تک جو حکمرانوں یا قانون بنانے والوں کے دلوں میں احساس ہمدردی پیدا کردے۔ جس بات کے لئے ہم نے کوشش شروع کی تھی، اس کی تکمیل میں ہم نے بہت زیادہ مدت لے لی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہماری تحریک مقاومت مجہول مکمل نمونہ پر مبنی نہ تھی۔ تمام ستیاگرہی قوت کی پوری قدر وقیمت کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہمارے پاس ایسے آدمی ہیں جو دلی عقیدہ کی بنا پر تشدد سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہوں

ہم لیکایک ایسے آدمیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتے لیکن مقاومت مجہول کی جتنی زیادہ ہم میں روح ہوگی اتنے ہی زیادہ ہم بہتر آدمی بن جائیں گے۔ لہٰذا اس کا استعمال ناقابل تردید چیز ہے اور وہ ایسی طاقت ہے جو اگر عالمگیر بن جائے، معاشرتی خیالات میں انقلاب برپا کردے گی مایوسیوں کو دور کردیگی، اور اُس جنگی روح کا خاتمہ کردے گی جس کے اثرات کے ماتحت آج مغربی اقوام اپنی زندگی بسر کررہی ہیں اور اتنی کچلی جاچکی ہیں کہ قریب قریب موت کے منہ کے قریب پہونچ چکی ہیں اور جو مشرقی اقوام پر بھی مسلط ہونیکی دھمکی دیرہی ہے

اگر گذشتہ جدوجہد نے صرف چند ہندوستانی ایسے پیدا کردئے جو قریب قریب مکمل ستیاگرہی بن سکیں تو نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنی بہترین خدمت کرسکیں گے بلکہ وہ وسیع طور پر تمام بنی نوع انسان کی بھی خدمت انجام دیسکیں گے

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مقاومت مجہول شریف ترین اور بہترین

قسم کی تعلیم ہے۔ یہ بچوں کی معمولی تعلیم کے بعد شروع نہیں ہونی چاہیئے، بلکہ وہ اُس سے قبل شروع ہو جانی چاہیئے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جائیگا کہ ایک بچہ کو اس سے قبل کہ وہ حروف تہجی شروع کرے اور دنیوی علم حاصل کرے، یہ جاننا چاہیئے کہ روح کیا ہے، سچائی کیا ہے، محبت کیا ہے اور روح کی خفیہ طاقتیں کیا ہیں۔ حقیقی تعلیم کا ایک لازمی جزو یہ ہونا چاہیئے کہ بچہ سیکھے کہ زندگی کی کشمکش میں نفرت کو محبت سے، جھوٹ کو سچ سے، تشدد کو تکلیف برداشت کرنے سے بآسانی فتح کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ مجھے اس حقیقت کی سچائی کا احساس تھا اسی لئے میں نے ٹالسٹائی فارم میں اور بعدہٗ فینکس میں بچوں کو انہی اصولوں پر تربیت دینے کی کوشش کی، اور میرے ہندوستان جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بہ حیثیت ستیا گرہی کے اپنی خامیوں سے اور زیادہ آگاہ ہو جاؤں جیسا کہ میں کچھ کچھ آگاہ ہو چکا ہوں اور اس کے بعد اپنے آپ کو انسان کامل بنانے کی سعی کروں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ ہندوستان ہی میں رہ کر یہ بات ممکن ہے کہ انسان انتہائے کمال تک پہونچ سکے"

بہت سے آنے والے اقتباسات جو اس باب میں درج کئے گئے ہیں، وہ انڈین اوپنین" کے "گولڈن نمبر" میں مل سکتے ہیں جو تحریک ستیا گرہ کے اختتام پر فینکس میں سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا اور جس کی ایڈیٹری مسٹر ایچ، ایس، ایل، پولاک کے ہاتھ میں تھی۔ وہ سنہ ۱۹۰۳ء میں انگلستان سے آئے تھے اور جوہنسبرگ میں گاندھی سے ایک سال بعد پہونچے تھے اور اس

طرح وہ رفتہ رفتہ اُن کے خیالات کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ مسٹر پولک نے ہندوستانی مفاد کے لئے دل و جان سے کوشش کی اور انسانیت کے لئے انھوں نے اور ان کی اہلیہ نے جو جوش ظاہر کیا ہے، اس میں اب تک کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ وقتاً فوقتاً فینکس آشرم میں رہے اور اس جگہ کے ڈسپلن میں شریک ہوئے۔ انھوں نے دو مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا اس غرض سے کہ حکومت اور باشندگانِ ملک سے ان کی تکالیف کی داستان بیان کریں جن کے ماتحت جنوبی افریقہ کے ہندوستانی زندگی بسر کرتے تھے اور انہیں تحریکِ ستیاگرہ سے واقف کرائیں جو اُن کے انسداد کے لئے جاری کی گئی تھی۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے بانی اور صدر مسٹر جی، کے، گوکھلے (مرحوم) کی رہنمائی میں انھوں نے سمندر پار کے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لئے جس کی ایک علامت معاہدہ والی مزدوری کے سلسلہ میں ترکِ وطن کے نظام کی تنسیخ تھی، تمام قوم کی ہمدردیوں کو بیدار کرنے میں امداد دی تھی۔[1]

مسٹر پولک ۱۹۱۳ء میں مسٹر گاندھی کے ساتھ قید خانہ گئے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تحریکِ ستیاگرہ اپنی آخری منزل میں سے گذر رہی تھی۔ اگرچہ انھوں نے تحریک کے گاندھی آمٹس ایگریمنٹ مورخہ ۱۹۱۴ء پر منتج ہو جانے کے بعد اپنے بال بچوں سمیت انگلستان جانے کا ارادہ کر لیا تھا، تاہم وہ مسٹر گاندھی کی درخواست پر ان کی مراجعت ہند کے بعد دو سال سے زیادہ مدت تک جنوبی افریقہ میں قیام پذیر رہے تاکہ ہندوستانی جماعت کی طرف سے یہ

[1] باب سیزدہم

دیکھیں کہ معاہدہ پر کس طرح سے عملدرآمد ہوتا ہے اور اس طرح سے انھوں نے نہایت مشکل اور قیمتی خدمت انجام دی

خود ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی مابعد کی زندگی میں وہ تمام خیالات جو یہاں پر درج کئے گئے ہیں، ان کے تمام اعمال کی تہ میں متحرک اور جلوہ کناں نظر آتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کی کشمکش میں ان کا دماغ مصائب کا عادی ہو چکا ہے یہاں تک کہ انھوں نے بالآخر ہر انسانی معاملہ بہادرانہ نقطۂ نظر ڈالنے کی عادت حاصل کر لی اور اسی کا اثر تھا کہ انھوں نے ہمیشہ بہادرانہ طرز عمل اختیار کیا۔ ایک گجراتی نظم کے دو بیت انہیں ہمیشہ مرغوب رہے اور انہیں وہ اکثر اوقات صبح اور شام کی دعاؤں کے موقعوں پر گایا کرتے تھے؛

خدا کے راستہ پر صرف بہادر روحیں ہی گامزن رہ سکتی ہیں؛
بزدل ہمیشہ اس سے اجتناب کرتے رہتے ہیں

باب دوازدہم

"ٹالسٹائی فارم"

اُن روحانی قوتوں کو عملی طور پر سمجھنے کے لئے جو جنوبی افریقہ کی تحریک ستیاگرہ کی تہ میں کارفرما تھیں، اُن دونوں آشرموں کی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے جو مختلف اوقات میں قائم کئے گئے تھے جبکہ مہاتما گاندھی اُس ملک میں موجود تھے۔ اول الذکر کا نام فینکس تھا اور ڈربن سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، دوسرے کا نام ٹالسٹائی فارم تھا جو جوہنسبرگ کے قریب ٹولی کے مقام میں واقع تھا۔ محنت و جفاکشی اور بے خوفی میں ڈسپلن پیدا کرنے والے اِن دو مرکزوں نے جنوبی افریقہ کی مختلف ستیاگرہ کے دوران میں روز افزوں اہمیت حاصل کرلی تھی

مابعد کی ہندوستان والی تحریک عدمِ تعاون کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ اُس کے لئے ایسے وسیع پیمانہ پر تیاری نہیں کی گئی تھی جو اُس کے نہایت وسیع حلقۂ اثر یعنی تمام ہندوستان کی وسعت کے عین مطابق ہوتی۔ ہندوستانی اُس اخلاقی ضابطہ کے عادی نہ تھے جس کا مطالبہ گاندھی کر رہے تھے سابرمتی کا آشرم جسے انھوں نے جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آنے پر قائم کیا تھا، اُس تحریک کے وسیع رقبہ کے ہر حصہ

کے لئے لیڈر بہم پہونچانے سے قاصر رہا۔ مناسب لیڈری کی یہ کوتاہی ہی کسی اور چیز کے مقابلہ میں زیادہ تر تشدد کے اُن مظاہرات کی ذمہ دار بنی جو بمبئی میں اور چوری چورا میں وقوع پذیر ہوئے جن کا ذکر آگے چلکر کیا گیا ہے

ہمارے پاس خود مسٹر گاندھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نہایت ہی دلچسپ بیان موجود ہے جس میں لولی کے مقام میں اپنا آشرم جس کا نام ٹالسٹائی فارم تھا، اپنے ایک معتقد مسٹر ایچ کیلن بیچ (معمار) کی معیت میں قایم کرنے کی کوشش کا حال درج ہے۔ جو حال آگے درج ہے، وہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ وہ ظاہر کرتا ہے کہ مسٹر گاندھی اہمسا یعنی عدم تشدد کے اصول میں کہاں تک جانے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ ٹالسٹائی فارم میں انھوں نے سانپوں کو جو انسانی آبادی میں رہا کرتے تھے، مار ڈالنے کی اجازت دیدی تھی

اس منطقی کمزوری کی جو اُن کے قول اور فعل میں پائی جاتی ہے اور جسے انھوں نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور "ینگ انڈیا" کے کالموں میں اس کی جانب بار بار اشارہ کیا گیا ہے، پورے طور پر کبھی بھی تشریح نہیں کیگئی لیکن اُس نے انہیں کسی اور چیز کے مقابلہ میں زیادہ پریشان رکھا ہے جیسا کے اس کتاب میں اہمسا والے باب سے ظاہر ہو گیا ہوگا[1]

ٹالسٹائی فارم کی تاسیس کے بارے میں خود ان کے بیان سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مذہبی ڈسپلن اور اخلاقی ٹریننگ کے

[1] دیکھو باب ہفتم

لئے ایک آشرم بنایا جائے تاکہ وہاں سے وہ تحریک ستیاگرہ جاری رکھنے
کے قابل ہوسکیں

اُن کا بیان درج ذیل ہے:۔

"ستیاگرہ یا روحی قوت کے بارے میں میرے خیالات اب پختہ ہو چکے
تھے اور میں نے اُن کی ہمہ گیری اور اُن کی اچھائی کو اچھی طرح سے جان
لیا تھا۔ کتاب "انڈین ہوم رول" اس لئے تحریر کی گئی تھی کہ ستیاگرہ کی
شان و شوکت کو ثابت کیا جائے اور وہ کتاب اُس کی تاثیر کے بارے میں
میرے اعتقاد کا آئینہ ہے۔ میں اپنی طرف کے لڑنے والوں کی تعدادی طاقت
کے بارے میں بالکل بے پروا تھا
لیکن مالی پہلو کے متعلق مجھے بالضرور تشویش تھی۔ بلاشبہ یہ امر مشکل
تھا کہ ایک طول و طویل تحریک کو بغیر سرمایہ کے جاری رکھا جائے۔ اُس
وقت مجھے اتنا احساس نہ تھا جتنا آج ہے کہ تحریک بغیر سرمایہ کے بھی
چلائی جا سکتی ہے، کہ یہ روپیہ ایک ایماندارانہ جنگ کو بسا اوقات خراب
کر دیتا ہے، نیز کہ خدا تعالیٰ ستیاگرہی کو اُس کی حقیقی ضروریات سے
زیادہ اور کچھ نہیں دیتا۔ لیکن مجھے خدا پر وشواس تھا جس نے نہ صرف
یہ کہ اُس وقت بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ مجھے مایوسی کے گڑھے میں
سے نکال لیا۔ اس لئے کہ جب میں نے کیپ ٹاؤن میں قدم رکھا تو مجھے
انگلستان سے ایک تجری تار ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ سر رتن جی جمشید جی
ٹاٹا نے ستیاگرہ کے سرمایہ میں چار ہزار پونڈ عطا کئے ہیں۔ یہ رقم ہماری فوری

ضروریات کے لئے کافی تھی اور اس لئے ہم نے اپنا قدم آگے بڑھا دیا لیکن یہ رقم یا بڑی سے بڑی رقم بھی بطورِ خود ستیاگرہ کی کسی جنگ کو چلانے میں معاون نہیں ہو سکتی۔ یعنی ایسی جنگ کو جو سچائی کی خاطر لڑی جائے اور جو پاکیزگیٔ نفس اور اعتمادِ خودی پر مشتمل ہو۔ ستیاگرہ کی جنگ کا لڑنا ناممکن ہے تا وقتیکہ سیرت کی شکل میں سرمایہ موجود نہ ہو۔ جس طرح سے ایک شاندار محل مکینوں کے نہ ہونے کی وجہ سے کھنڈر معلوم ہوتا ہے ٹھیک یہی کیفیت اُس آدمی کی ہوتی ہے جو سیرت سے معرا ہوتا ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تحریک کتنے عرصہ تک چلے گی۔ ایک طرف یونین جنرل تھے جو یہ تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ زمین کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہیں دینگے اور دوسری طرف ستیاگرہیوں کی مختصر سی جماعت تھی جو موت یا فتح حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ یہ لڑائی چیونٹیوں اور ہاتھی کی لڑائی جیسی معلوم ہوتی تھی اور جو اپنے ایک ہی پاؤں کے نیچے ہزارہا کو کچل سکتا تھا جنگ کے معنی یہ تھے کہ یا تو انہیں قید کر دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ لیکن اس اثنا میں اُن کے بال بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ اس مشکل کا صرف ایک ہی حل تھا یعنی یہ کہ تمام خاندان کو ایک ہی مقام پر رکھا جائے اور انہیں امداد باہمی کرنے والی جماعت کا افراد سمجھا جائے۔ اس طرح سے دھوکہ دہی کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے گی اور نہ کسی کے ساتھ بے انصافی عمل میں آسکے گی۔ عام سرمایہ کی بھی بچت ہو گی اور ستیاگرہیوں کے خاندان کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی کی جدید

مگر سادہ زندگی بسر کرنے کی ٹریننگ (تعلیم و تربیت) مل جائے گی اور مختلف صوبوں کے رہنے والوں اور مختلف مذہب کے پیروؤں کو ایکساتھ رہنے کا موقع مل جائیگا

لیکن اس نوعیت کی بستی کے لئے کونسا مقام موزوں ہوسکتا تھا؟ شہر میں رہنا مچھر پر ناک بھوں چڑھانے اور اونٹ کے نگل جانیکے مترادف ہوتا۔ مکان کا کرایہ ہی اتنا ہوتا جتنا کہ سب کی خوراک کا بل ۔ اور دوسرے یہ کہ شہر کی گوناگوں پریشانیوں میں سادہ زندگی بسر کرنا آسان نہ تھا۔ لہٰذا یہ بات بدیہی تھی کہ پسند کردہ جگہ نہ تو شہر سے بہت زیادہ دور ہو، اور نہ بہت زیادہ نزدیک

لہٰذا مطلوبہ جگہ ٹرانسوال ہی میں ہونی چاہیئے اور اسے جوہنسبرگ سے بہت زیادہ قریب نہ ہونا چاہیئے۔ مسٹر کیلن بیچ؎ نے ۱۱۰۰ ایکڑ کا ایک فارم خریدا تھا اور مجھے انھوں نے بغیر کرایہ یا بغیر کسی بار کے اس کے استعمال کی اجازت دیدی تھی۔ اس فارم میں تقریباً ایک ہزار میوہ دار درخت تھے اور پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا مکان بھی تھا جس میں تقریباً نصف درجن آدمی رہ سکتے تھے۔ پانی کی بہم رسانی دو کنوؤں اور ایک چشمہ کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن لولی فارم سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھا اور جوہنسبرگ تقریباً اکیس میل۔ ہم نے اسی فارم میں مکانات بنانے کا فیصلہ کرلیا اور ستیاگرہیوں کے بال بچوں

؎ Kallenbach

کو وہیں مقیم ہو جانے کی دعوت دیدی

مقیم ہونے والے اشخاص گجرات، جنوبی ہندوستان اور شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے اور ان میں ہندو، مسلمان پارسی اور عیسائی سب تھے۔ اُن میں سے تقریباً چالیس آدمی نوجوان تھے، دو یا تین بوڑھے تھے، پانچ عورتیں اور بیس تیس بچے تھے جن میں چار یا پانچ لڑکیاں تھیں

عیسائی اور دوسری عورتیں گوشت کھانے والی تھیں۔ مسٹر کیلن بیچ اور میں نے مناسب خیال کیا کہ گوشت کو فارم سے خارج رکھیں۔ لیکن ہم کس طرح سے اُن لوگوں سے جو اس بارے میں کوئی شبہات نہ رکھتے تھے اور جو اپنی عسرت کے دنوں میں یہاں آگئے تھے، یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ عارضی طور پر گوشت ترک کر دیں؟ میں نے ان حالات میں اپنے فرض کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں دیر نہیں کی۔ اگر عیسائی اور مسلمان گائے کے گوشت کا بھی مطالبہ کریں تو ان کے لئے اُسے بھی ہم پہونچا دینا چاہئے۔ فارم میں انہیں داخل ہونے کی اجازت نہ دینے کا مسئلہ خارج از بحث تھا

لیکن جہاں محبت ہوتی ہے وہاں خدا بھی موجود ہوتا ہے۔ مسلمان دوستوں نے مجھے اجازت دیدی تھی کہ خالصتاً سبزی ترکاری کا باورچی خانہ قائم کر دیا جائے۔ اب مجھے عیسائی بہنوں سے پوچھنا باقی تھا جن کے بھائی یا خاوند جیلخانہ میں تھے۔ اُن عیسائیوں کے ساتھ جو اب جیل خانہ میں تھے، میرے گہرے روابط تھے اور وہ ایسے ہی مواقع پر

سبزی خوری پر اظہار پسندیدگی کر چکے تھے۔ لیکن میرے لئے ان کی غیر حاضری میں ان کے بال بچوں کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات رکھنے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ میں نے بہنوں کے روبرو مکان کی قلت گنجائش اور مالی مشکلات کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس معاملہ میں اپنے دلی محسوسات کا بھی ذکر کر دیا۔ بہنوں نے مہربانی آمیز طریقہ سے گوشت کھانے سے انکار کر دیا اور کھانے پینے کا محکمہ ان کی سپردگی میں دیدیا گیا۔ ایک دوسرے آدمی کی معیت میں مجھے ان کی امداد کے لئے مقرر کیا گیا۔ میری موجودگی سے چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیاں واقع نہ ہو سکیں کھانا سادہ ترین قسم کا ہوتا تھا۔ کھانے کے اوقات اور ان کی تعداد بھی مقرر تھی۔ طے پا گیا تھا کہ باورچیخانہ ایک ہی رہے اور سب ایک ساتھ ایک قطار میں بیٹھ کر کھانا کھایا کریں۔ ہر ایک کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنے کھانے پینے کے برتنوں کو خود صاف کیا کرے۔ ستیا گرہی ٹالسٹائی فارم پر عرصۂ دراز تک رہے لیکن نہ تو مردوں نے اور نہ عورتوں نے کبھی گوشت کی فرمائش کی۔ شراب نوشی، سگریٹ نوشی وغیرہ وغیرہ بلاشبہ ممنوعات میں داخل تھی

ننھے اور نوعمر بچوں کے لئے اسکول کی ضرورت تھی۔ یہ سب سے مشکل کام تھا اور اس معاملہ میں ہمیں اخیر وقت تک کبھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ درس و تدریس کا بار زیادہ تر مسٹر کیلن بیچ پر ہی پڑا۔ اسکول صرف ایک مرتبہ سہ پہر ہی کو رکھا جا سکتا تھا جبکہ ہم دونوں صبح کی مشقت سے پورے طور پر تھک جاتے تھے اور یہی حالت ہمارے شاگردوں

کی ہوتی تھی۔ بسا اوقات استاد وشاگرد اونگھا کرتے تھے۔ ہم آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارا کرتے تھے اور بچوں کے ساتھ کھیل کود کے اُن کو اور اپنے آپ کو ہشیار کیا کرتے تھے، لیکن بعض یہ بھی بیکار ثابت ہوتا تھا۔ جسم کو فوراً آرام کی ضرورت تھی اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ چیز تو ہماری بہت سی مشکلات میں سے ایک تھی، اس لئے کہ اس طرح اونگھنے کے باوجود بھی جماعتیں منعقد کی جاتی تھیں

لیکن یہ تعلیم و تعلم کا تجربہ بیکار ثابت نہیں ہوا۔ لڑکوں کو تعصب کی متعدی بیماری سے بچا لیا گیا اور انہیں تعلیم دی گئی کہ وہ ایک دوسرے کے مذاہب اور رسوم کو کشادہ دلی کے برداشت کیا کریں۔ انہیں یہ بات حاصل ہوگئی کہ وہ سگے بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ انھوں نے باہمی خدمت، اخلاق اور محنت و مشقت کا سبق حاصل کیا۔ اور ٹالسٹائی فارم کے رہنے والے بچوں کی مابعد کی جد و جہد کے بارے میں مجھے جو کچھ واقفیت ہے، اس سے مجھے یہ یقین ہوگیا کہ جو تعلیم انھوں نے وہاں پائی تھی وہ بیکار نہیں گئی۔ اگرچہ وہ نامکمل تھی تاہم وہ خیال پرور اور مذہبی تجربہ تھا، اور ٹالسٹائی فارم کی گذری ہوئی دلچسپیوں کی جو یاد اب دماغ میں رہ گئی ہے وہ باقی چیزوں کی یاد کے مقابلہ میں کچھ کم دلچسپ نہیں

رمضان کے روزے آن پہونچے۔ ہم میں نو عمر مسلمان بھی تھے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں ان کو روزہ رکھنے کی بالضرور ترغیب دینی چاہیئے ہم نے اُن کے لئے شام کے کھانے کے انتظامات کر دیئے۔ کھانوں میں بلاشبہ

گوشت نہیں ہوتا تھا اور نہ کسی نے اسے طلب کیا مسلمان دوستوں کا ساتھ دینے کی غرض سے ہم سے باقی اشخاص نے بھی صرف ایک وقت یعنی شام کا کھانا کھانے پر اکتفا کی۔ معمول کے موافق ہم غروب آفتاب سے پیشتر ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ اس صورت میں فرق صرف اتنا تھا کہ جب باقی لوگ کھانا ختم کر لیتے تھے، اس وقت مسلمان لڑکے کھانا کھانا شروع کرتے تھے یہ لڑکے اس قدر خوش اخلاق تھے کہ انھوں نے کسی کو ذرہ برابر تکلیف نہیں دی اور اس واقعہ کا کہ غیر مسلم بچوں نے بھی روزہ رکھنے کے معاملہ میں انہی کا ساتھ دیا، بہت اچھا اثر پڑا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہندو اور مسلمان لڑکوں میں کبھی مذہب کی بنا پر جھگڑا ہوا ہو۔ برخلاف اس کے مجھے معلوم ہے کہ اگرچہ سب پختہ عقائد کے تھے تاہم وہ ایک دوسرے کے ساتھ احترام سے پیش آتے تھے اور اپنے اپنے مذہبی شعار کی تعمیل میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے

ابھی ہم فارم ہی میں رہ رہے تھے کہ گوکھلے جنوبی افریقہ میں آپہنچے۔ اس موقع پر ایک واقعہ بیان کروں گا جو اپنے اندر تلخی و شیرینی دونوں رکھتا ہے

فارم میں ایک بھی چارپائی نہ تھی لیکن گوکھلے کے لئے ہم نے ایک مستعار لے لی۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں وہ پوری تنہائی کے ساتھ رہ سکیں بیٹھنے کے لئے بھی ہمارے پاس سوائے اسکول کے بنچوں کے اور کوئی چیز نہ تھی ایسی حالت میں بھی ہم یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ گوکھلے کو ڈاکی

خراب صحت کے باوجود فارم میں نہ لائیں؟ اور دوسرے یہ کہ وہ خود بھی پڑ آئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟

میں نے حماقت سے یہ خیال کر لیا کہ گوکھلے ایک رات کی بے آرامی برداشت کر لیں گے اور اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل کا سفر پیدل طے کر لینگے میں نے اُن سے پہلے سے پوچھ لیا تھا اور انھوں نے بغیر فکر کیئے ہر بات پر اظہار رضامندی کر دیا تھا، اور اس کے لیئے میں اُن کی سادہ مزاجی کا اور جو اعتماد انھوں نے مجھ پر ظاہر کیا، اس کا شکر گذار ہوں۔ بدقسمتی سے اُس دن بارش بھی ہو گئی تھی اور میں وقت کے وقت کوئی خاص انتظام بھی نہیں کر سکا میں نے اپنے آپ کو آج تک معاف نہیں کیا اُس زحمت کے لیئے جو میں نے اس دن گوکھلے کو اپنی جاہلانہ محبّت کی وجہ سے دی یہ تکلیف ان کے لیئے برداشت سے کہیں زیادہ تھی اور انہیں سردی ہو گئی ہم انہیں باورچی خانہ اور کھانے کے ہال میں نہیں لے جا سکتے تھے انہیں مسٹر کیلن بیچ کے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ ان کا کھانا باورچی خانہ سے اُن کے کمرے تک آتے آتے ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ اس لیئے میں نے خاص طور پر شوربا تیار کروایا اور کوتوال نے ان کے لیئے خاص روٹی تیار کی لیکن گرما گرم انہیں پہونچائی نہیں جا سکیں۔ بہرحال جتنا کچھ ہم سے بنا ہم نے اُن کی خدمت کی

گوکھلے نے ہم سے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن میں نے اُن کے چہرہ سے معلوم کر لیا کہ میں نے کیا حماقت کی جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم سب زمین

پڑے ہوئے ہیں تو انھوں نے چار پائی کو ہٹا دیا جو اُن کے لئے لائی گئی تھی۔ اور اپنا بچھونا بھی فرش ہی پر کر لیا۔ میری وہ تمام رات تو یہ ہی میں گذری

جس طرح ٹالسٹائی فارم کے واقعات نامکمل رہتے اگر گو کھلے کی آمد کا حال نہ بیان کیا جاتا اسی طرح وہ نامکمل رہیں گے اگر مسٹر کیلن بیچ کی سیرت اور طرزِ عمل کے متعلق کچھ نہ لکھا گیا۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ وہ ٹالسٹائی فارم میں اس طریقہ سے رہے کہ گویا وہ ہم میں سے ایک ہیں۔ گو کھلے معمولی باتوں سے متاثر ہونے والے آدمیوں میں نہ تھے لیکن کیلن بیچ کی زندگی میں انقلابانہ تبدیلی سے وہ بھی بیحد متاثر ہوئے کیلن بیچ کی پرورش انتہائی آرام اور آسائش میں ہوئی تھی اور انہیں خبر بھی نہ تھی کہ فاقہ کشی کسے کہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ آرام و آسایش اُن کا مذہب بنا ہوا تھا۔ وہ تمام لذائذ زندگی سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے اور انھوں نے اپنے آرام کے لئے کبھی ایسی چیز حاصل کرنے میں تامل نہیں کیا جسے روپیہ خرید سکتا ہو

ایسے آدمی کے لئے ٹالسٹائی فارم میں رہنا اور زندگی بسر کرنا اور ہندوستانی مکینوں کے ساتھ یگانگت پیدا کر لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ خوشگوار تعجب کی بات تھی۔ بعض یورپین کیلن بیچ کو بیوقوف یا دیوانہ کہتے تھے اور باقی اُن کے ایثار کی وجہ سے اُن کا احترام کرتے تھے۔ کیلن بیچ کو اس ترکِ لذائذ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی درحقیقت وہ اُس میں ایسی لذت محسوس کرتے تھے جو زندگی کی مسرتوں

میں انہیں آج تک نہیں ملی تھی۔ ساری زندگی کی مسرت کا ذکر کرتے کرتے وہ خوشی سے مست ہو جاتے تھے اور اُن کے سننے والے کچھ دیر کے لئے تو مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے ایسی محبت کے ساتھ ملا کرتے تھے کہ وہ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اُن سے جدا ہو جاتے تو وہ اپنی زندگیوں میں خلا محسوس کرتے تھے

میں اور مسٹر کیلن بیچ دونوں مذہب پر لبا اوقات گفتگو کیا کرتے تھے جو بالعموم عدم تشدد، محبت، سچائی جیسے بنیادی اصولوں پر مرکوز رہا کرتی تھی۔ جب میں نے کہا کہ سانپوں اور اسی قسم کے دوسرے جانوروں کو مارنا گناہ ہے تو دوسرے یورپینوں کی طرح مسٹر کیلن بیچ کو بھی حیرت ہوئی۔ لیکن آخر کار انھوں نے بطور مجرد تصور کے اُس اصول کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔ ابتدائے گفتگو ہی میں انھوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ نہایت مناسب ہے کہ ہر وہ اصول جس کا کوئی شخص ذہنی طور پر قائل ہو، عمل میں بھی لایا جائے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بغیر مزید غور و فکر کے اپنی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات پیدا کرنے کے قابل ہو گئے۔ مسٹر کیلن بیچ نے سوچا کہ اب اگر سانپوں کو مار ڈالنا ایک نامناسب فعل ہے تو پھر ہمیں ان کے ساتھ دوستی کر لینی چاہیئے۔ اس غرض سے انھوں نے سانپوں پر بہت سی کتابیں اکٹھا کر لیں تاکہ وہ ان رینگنے والے کیڑوں کی مختلف اقسام سے واقف ہو جائیں۔ وہاں انھوں نے پڑھا کہ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور یہ کہ بعض سانپ کھیتوں میں درحقیقت کھیتوں کی رکھوالی کیا کرتے ہیں۔ انھوں

نے ہم سب کو سانپ کی مختلف اقسام سکھائیں اور آخرِ کار انھوں نے ایک بہت بڑے افعی کو پالنے کی کوشش کی جو فارم میں مل گیا تھا

مسٹر کیلن بیچ اسے پنجرہ میں ہر روز اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے میں آہستگی کے ساتھ اُن سے بحث کرتا۔ میں نے کہا کہ اگرچہ یہ سب کچھ آپ کر رہے ہیں، تاہم یہ بالکل ممکن ہے کہ سانپ کو آپ کی دوستی کی کیفیت معلوم نہ ہو بالخصوص جبکہ آپ کی مہربانی خوف سے ملی ہوئی ہے۔ نہ تو آپ میں اور نہ مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ اس کے ساتھ کھیل سکیں بشرطیکہ وہ آزاد ہو اور اس لئے جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اُس نوعیت کی جرأت پیدا کریں۔ لہٰذا اگرچہ دوستی کا جذبہ موجود ہے تاہم اس طرح سانپ پالنے میں محبت جلوہ گر نہیں ہے۔ ہمارا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہئے جو سانپ پر بھی ظاہر ہو جائے۔ ہم ہر روز یہ بات دیکھتے ہیں کہ تمام جانور ایک دم پکڑ لیتے ہیں خواہ دوسرا فریق اُن سے محبت کرے یا اُن سے خوف کھائے علاوہ ازیں آپ اس سانپ کو زہریلا نہیں سمجھتے مگر اس کے باوجود آپ نے اسے قید کر رکھا ہے تاکہ آپ اس کے طریقوں اور اس کی عادات سے واقف ہو جائیں یہ ایک قسم کی عیاشی ہے جس کے لئے حقیقی دوستی کی صورت میں کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے'

میرے استدلال کا مسٹر کیلن بیچ پر اثر ہوا لیکن وہ اس سے اتنے متاثر نہیں ہوئے کہ سانپ کو قید سے رہائی دیدیتے۔ میں نے اُن پر زور نہیں ڈالا مجھے خود سانپ کی زندگی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور بچے تو بید

خوشی محسوس کرتے تھے۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ سانپ کو پریشان کرے جو بہر حال بچنے کے تمام ذرائع پر غور کرتا رہتا تھا۔ خواہ پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو خواہ سانپ نے دروازہ کھول لیا ہو، دو دن کے اندر اندر مسٹر کلین بیچ نے ایک صبح پنجرے کو خالی پایا جب وہ حسب عادت اپنے دوست سے ملنے کے لیے گئے۔ مسٹر کیلن بیچ کو اس سے بہت مسرت ہوئی اور ساتھ ہی مجھے بھی

ان تجارب کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم سانپوں سے اب اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا ہم دوسری صورتوں میں ڈرتے۔ لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ کہ فارم میں ہر شخص سانپوں سے خوف نہیں کھاتا تھا یا یہ کہ سانپوں کو مارنے کے کلی حکم امتناعی جاری ہو گیا تھا۔ یہ یقین کرنا کہ کسی مخصوص طرز عمل میں تشدد یا گناہ پنہاں ہے، الگ بات ہے اور اس عقیدہ کے مطابق عمل کرنے کی طاقت رکھنا بالکل الگ بات ہے۔ ایک شخص جو سانپوں سے خوف کھاتا ہے اور جو اپنی زندگی دینے پر تیار نہیں ہے، وہ بالضرور بوقت ضرورت سانپوں کو قتل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک دن مسٹر کیلن بیچ کے اپنے کمرے میں ایسے مقام میں سانپ دیکھا گیا جہاں سے اسے بھگانا یا پکڑنا ناممکن معلوم ہوا۔ ایک طالب علم نے اسے دیکھ لیا اور مجھے بلا کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ وہ اسے مارنے کے لئے میری اجازت کا طالب تھا۔ وہ بغیر ایسی اجازت کے اُسے مار سکتا تھا لیکن مکین میری اجازت کے بغیر ایسی حرکت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ میرا فرض ہے کہ میں طالب علم کو سانپ

مار ڈالنے کی اجازت دیدوں۔ ان سطور کو لکھتے وقت بھی میرے دل میں خیال نہیں آتا کہ میں نے اجازت دینے میں کسی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنے ہاتھ سے سانپ کو پکڑ لوں یا خطرہ کو کسی اور طریقہ سے مکینوں سے دور کردوں۔ اور مجھ میں اب تک ایسی جرأت پیدا نہیں ہوئی

ایسے خطرناک تجربے صرف ایسی کشمکش میں جہاں تزکیۂ نفس ہی حقیقی مقصد ہو، گنجایش رکھ سکتے ہیں۔ ٹالسٹائی فارم روحانی پاکیزگی اور آخری منزل کے لئے تپسیا کا بہترین مقام ثابت ہوا۔ مجھے ابھی تک سخت شبہات ہیں کہ آیا کشمکش آٹھ سال تک جاری رکھی جا سکتی تھی، آیا ہمیں زیادہ بڑی رقوم مل سکتی تھیں اور آیا وہ ہزارہا آدمی جنھوں نے تحریک کے آخری حصہ میں شرکت کی تھی، اس میں اپنا حصہ لے سکتے تھے اگر ٹالسٹائی فارم موجود نہ ہوتا۔ اسے کبھی شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود اس نے عامۃ الناس کی ہمدردی کو اپنی طرف کھینچا۔ ہندوستانیوں نے دیکھ لیا کہ ٹالسٹائی فارم کے رہنے والے کام کر رہے ہیں جسے کرنے کے لئے وہ خود تیار نہ تھے اور جسے وہ صرف مصائب ہی کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ پبلک کا اعتماد تحریک کے لئے زبردست سرمایہ بنا جبکہ ۱۹۱۳ء میں اسے از سرنو منظم کیا گیا"

فینکس کے آشرم کے متعلق جسے آج بھی "انڈین اوپینین" کی ہفتہ وار اشاعت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ایسے شخص کیلئے جو ملک میں دنیا سے الگ زندگی گذارنا چاہتا ہے، خاموش مقام کے طور پر

کام میں لایا جا رہا ہے، مجھے حال ہی میں ذاتی تجربات ہوئے ہیں اُن سب مقامات میں جنکی جنوبی افریقہ میں میں نے سیر کی ہے، وہی مقام ایسا تھا جو ہندوستانکے شانتی نکیتن کی سب سے زیادہ مجھے یاد دلاتا تھا، وہاں ویسی ہی خاموش فضا ہے اور اس کا پس منظر بھی روحانی ہی ہے۔ ٹھیک جس طرح سے شانتی نکیتن رابندرا ناتھ ٹیگور کے والد مہارشی کیلئے پوجا کرنے کی جگہ تھی اور خود شاعر کیلئے بھی، بعینہٖ اُسیطرح فینکس ایسے زمانہ میں مہاتما گاندھی کی روحانی کوششوں کا منظر پیش کر چکا ہے جبکہ جنوبی افریقہ میں آپ اپنی سخت ترین تحریکوں اور مایوسیوں سے دوچار ہو رہے تھے۔ دوسرے لمحات کے مقابلہ میں جو زمانہ میں نے اُن کے ساتھ فینکس والے آشرم میں گذارا ہے وہ بجائے خود بہت ہی قیمتی ثابت ہوا ہے

انکی تحریرات سے جو اقتباس آگے چل کر پیش کیا گیا ہے۔ اُسکی مدد سے ہم جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ کی تحریکوں میں سے سب سے بڑی تحریک کے حالات سے واقف ہو جاتے ہیں جو نیٹال کے شکر کے کھیتوں میں معاہدہ والی ہندوستانی مزدوروں کی طرف سے جاری کی گئی تھی۔ وہ اُس نازک موقع سے علاقہ رکھتا ہے جبکہ وہ اپنے آپکو اور اپنے تمام ذرائع کو میدان جنگ کے محاذ میں جھونکدینا چاہتے تھے۔ اس آخری تحریک کے متعلق اس سے قبل کہ وہ ہندوستان آئے ہیں اپنے ذاتی علم سے بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اسلئے کہ مسٹر گوکھلے نے جو اسکے دوران ہندوستان میں بہت علیل ہو گئے تھے۔ مجھ سے فرمایا تھا کہ میں مسٹر ڈبلیو، ڈبلیو پیرسن کی معیت میں وہاں جاؤں اور اُس میں حصہ لوں۔ اس بنا پر میں اس اسپرٹ کو دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا جسمیں اسے چلایا جا رہا تھا جب ہم پہنچے اُسوقت مسٹر گاندھی مسٹر کیلن بیچ مسٹر پولک اور باقی جملہ لیڈران گرفتار ہو چکے تھے۔ اور بہت سی ہندوستانی خواتین سمیت جیل خانہ ڈالدئے گئے تھے۔ تین اشخاص جن کا میں نے خاص طور پر نام لیا ہے مابعد میں رہا کر دئے

گئے تھے تاکہ وہ نامہ و پیام کو آگے بڑھائیں۔ مجھے اپنی تمام زندگی میں کبھی اُس سے زیادہ شریف مردوں اور عورتوں کی جماعت نہیں ملی جو میں نے وہاں دیکھی اور جو ہر قسم کی تکلیف کو خوشی اور مسرت کے ساتھ برداشت کر رہی تھی۔ مجھے خصوصیت کے ساتھ اُن ہندوستانی عورتوں کا نظارہ یاد ہے جو قیدخانہ میں گئی تھیں اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کر رہی تھیں جس چیز نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا، وہ شرافت تھی جس کے ساتھ قیدی ہر چیز کو برداشت کرتے تھے اور وہ محبت تھی جس کے ساتھ وہ اپنے قیدخانوں کے وارڈوں کا ذکر کرتے تھے۔ اُس حیرت افزا تجربہ کے بعد میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں تحریکِ ستیاگرہ کی روحانی طاقت کے بارے میں شک کروں، جو اخلاقی سیرت کی نشوونما کا بہترین ذریعہ ہے۔ تاریخ ماضی میں جس واحد مثال کا میں خیال کر سکا ہوں (اور وہ بہت ہی قریبی مثال ہے)، وہ ابتدائی عیسائیوں کی خوشی اور مسرت تھی جبکہ وہ سچائی کی خاطر صدمات برداشت کیا کرتے تھے

مسٹر گاندھی رقمطراز ہیں:۔

"ہم نے اب وہ کارروائی کرنے کا ارادہ کر لیا جسے ہم نے اخیر وقت کیلئے محفوظ کر رکھا تھا اور جو عندالوقت پورے طور پر ہماری توقعات کے مطابق تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں کسی نازک موقع پر فنکیس کے تمام باشندوں کو قربان کر دوں۔ یہ میری طرف سے سچائی کے خدا کے حضور میں آخری پیشکش بنتے۔ الاتھا فنیکس کی نوآبادی کے مکین زیادہ تر میرے رفقائے کار

اور رشتہ دار تھے۔ خیال یہ تھا کہ سوائے چند ایک کے باقی سب کو جیلخانہ
بھیجدیا جائے جن کی 'انڈین اوپینین' چلانے کے سلسلہ میں ضرورت
تھی اور سولہ برس سے کم عمر بچوں کو ابھی نہ بھیجا جائے۔ میرے لئے حالات
متعلقہ میں یہی انتہائی قربانی ہو سکتی تھی

میں فنیکس گیا اور اپنے ارادوں کے بارے میں وہاں کے مکینوں سے
بات چیت کی۔ سب سے پہلے میں نے وہاں کی مقیم بہنوں سے بات چیت
کی۔ میں جانتا تھا کہ عورتوں کو جیل خانہ بھیجنا سخت خطرے سے مملو ہے۔
فینکس کی اکثر بہنیں گجراتی بولتی تھیں۔ انہیں ٹرانسوال کی بہنوں کی
سی تربیت اور تجربہ حاصل نہ تھا۔ مزید برآں انہیں سے اکثر میری رشتہ دار
تھیں اور گمان یہ تھا کہ شاید وہ صرف میرے تعلقات کی وجہ سے جیلخانہ
پسند کریں گی۔ اگر بعد کو وہ عین آزمائش کے موقع پر پیچھے ہٹ گئیں
یا جیل کی مصائب کو برداشت نہ کر سکیں تو ممکن ہے کہ اُن سے معافی
منگوالی جائے، اس طرح سے وہ نہ صرف مجھے زبردست صدمہ بلکہ وہ
تحریک کو بھی سخت دھچکہ پہونچائیں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی بیوی
سے اس امر کا ذکر نہ کروں گا، اس لئے کہ وہ میری پیش کردہ تجویز پر کبھی
وہ ہیں، نہیں کہیں گی، اور اگر انھوں نے 'ہاں' کر دیا تو مجھے معلوم نہ تھا
کہ اُن کی پسندیدگی کی کیا قدر و قیمت لگانی چاہیے، اور نیز اس لئے کہ میں
واقف تھا کہ اس جیسے سنجیدہ مسئلہ میں خاوند کو سارا مسئلہ بیوی کے اختیارِ
تمیزی پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ جو کارروائی مناسب سمجھیں اسے اپنے

دل سے انجام دیں اور یہ کہ اگر وہ کبھی نہیں کریں تو اس بات پر کسی قسم کا ملال نہیں کرنا چاہئے

میں نے دوسری بہنوں سے بھی ذکر کیا جنھوں نے فوراً میری تجویز سے اتفاق رائے کیا اور جیل جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ جیل خانہ میں اپنی پوری میعادِ قید بھگتیں گی خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی نکلے میری بیوی نے میری گفتگو سن لی جو ان بہنوں کے ساتھ ہو رہی تھی اور مجھے مخاطب کرکے کہا:۔

' مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھ سے اِس کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔ مجھ میں ایسا کونسا نقص ہے جو میرے جیل جانے کی راہ میں مانع ہو سکتا ہے؟ میں بھی اسی راستہ پر گامزن ہونا چاہتی ہوں جسکے لئے آپ دوسروں کو دعوت دے رہے ہیں'

میں نے جواب دیا کہ 'میں کبھی آپکو تکلیف نہیں دلسکتا۔ آپ پر بھروسہ نہ کرنیکا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے بیحد مسرت ہوگی اگر آپ جیل جائیں گی' لیکن ایسا نہ ہو کہ اُس میں میری تحریک کو دخل ہو۔ اس نوع کے معاملات میں ہر شخص کو اپنی طاقت اور دلیری کا اندازہ کرکے فیصلہ کرنا چاہئے۔ اگر میں آپ سے کہتا تو ممکن ہے کہ آپ میری خواہشات کی تکمیل کی خاطر جیل چلی جائیں، اور اسکے بعد اگر آپ عدالت میں کانپنے لگیں یا جیل کی مصائب سے خوفزدہ ہوگئیں تو اگرچہ میں اعتراض تو نہیں کرونگا لیکن اسوقت میری حالت کیا ہوگی؟ اُسوقت میں آپکو اپنے یہاں کیسے رکھ سکونگا یا دنیا کے سامنے کیا منہ دکھاؤنگا۔ اسی قسم کے خطرات ہیں جو جیلخانہ جانے کے بارے میں آپ سے درخواست کرنے کی راہ میں مانع آ رہے ہیں'

انھوں نے جواب دیا کہ "اچھا! اگر میں جیل کی مصائب کو برداشت نہ کرسکی یا میں نے معافی مانگ کر رہائی حاصل کرلی، اسوقت آپ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھئیگا اگر آپ مصائب برداشت کرسکتے ہیں اور اسی طرح میرے لڑکے بھی، تو میں کیوں نہیں برداشت کرسکتی۔ میں ضرور اس تحریک میں حصہ لونگی"

میں نے کہا کہ "تو پھر میں آپکو اس تحریک میں شریک کئے لیتا ہوں آپ میرے حالات سے واقف ہیں اور آپ میرے مزاج سے بھی آگاہ ہیں۔ اب معاملہ پر دوبارہ غور کرلیجئے بشرطیکہ آپ ایسا کرنا پسند کریں، اور اگر پورے غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچیں کہ تحریک میں آپکو شامل نہونا چاہیے تو آپ علیحدہ ہو جانے کی مجاز ہونگی۔ اور آپ اتنا سمجھ لیں کہ اب بھی فیصلہ میں تبدیلی کرلینا کوئی شرم کی بات نہیں ہے"

انھوں نے جوابدیا کہ "مجھے اب کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے"

میں نے دوسرے مکینوں سے بھی یہی کہا کہ اُن میں سے ہر ایک کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت دوسروں کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ بار بار اور مختلف طریقوں سے میں نے یہ بات اُنکے سامنے پیش کی کہ کسی شخص کو ہٹنا نہیں چاہیئے خواہ کشمکش قلیل مدت تک جاری رہے خواہ طویل مدت تک، خواہ فینکس کی نوآبادی اچھی حالت میں رہے خواہ تباہ ہو جائے اور خواہ شریک ہونے والے مرد یا شریک ہونے والی عورت کی صحت جیل میں خراب یا اچھی رہے۔ سب نے جواب دیا کہ "ہم تیار ہیں"

اِن الفاظ کو چھپی ہوئی کتاب میں پڑھنا اور بات ہے اور اِن خواتین کو

دیکھنا اور بات ہے جیسا کہ میں نے فی الحقیقت مشاہدہ کیا جبکہ وہ قید خانہ سے لوٹیں ایسی حالت میں کہ ان میں سے اکثر کی صحت قید خانہ کے شدائد سے بالکل خراب ہو چکی تھی مسز گاندھی نے سب سے زیادہ تکلیف اٹھائی اور جب میں نے انہیں اُن کی رہائی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے ان کی بگڑی ہوئی صورت کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ دوبارہ کبھی نہیں ہنسیں گی

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہیں کمزور اور نحیف الجثہ اور شریف خواتین کی (جو فینکس کے آشرم میں ٹریننگ پا چکی تھیں اور جنھیں وہاں سے وہ مذہبی عقیدتمندی اور خلوص آمیز جوش ملا تھا جس نے پیچھے قدم ہٹائے بغیر انہیں ایسی مصائب میں سے گذرنے کے قابل بنا دیا) ہمادری ہی کا نتیجہ تھا جس نے کسی اور چیز کے مقابلہ میں نیٹال کی اس آخری اور سب سے بڑی تحریکِ ستیاگرہ کو کامیابی تک پہونچایا[1]

---

[1] اس تحریک میں تقریباً چار ہزار ہندوستانیوں نے قید خانہ میں جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ اُن یورپینوں میں جو مسٹر گاندھی کے ساتھ تھے مسٹر کیلن بیچ اور مسٹر پولک نے ٹرانسوال کے جیل خانہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کیں اور وہ دونوں ہندوستانی قیدیوں کی معیت میں ہر ذلت و رسوائی میں شریک رہے

باب سیزدہم

ہندوستان میں ستیاگرہ

جونہی جنوبی افریقہ کی تحریک ختم ہوئی مسٹر گاندھی ساؤتھمپٹن روانہ ہوگئے اس اس ارادہ سے کہ انگلستان میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ جائیں گے لیکن جس دن وہ انگلستان کی سرزمین داخل ہوئے، جرمنی کیخلاف اعلانِ جنگ ہوچکا تھا۔ انھوں نے اپنی روایتی پھرتی سے فی الفور ایک رائے قائم کرلی اور اسی دن تا اختتامِ جنگ بغیر کسی شرط کے اپنی خدمات کو پیش کردیا تاکہ محاذِ جنگ پر رہ کر وہ ایمبولینس کا کام کریں۔ جنگ بوئر میں وہ اس کام میں نمایاں کامیابی حاصل کرچکے تھے جبکہ وہ ایس پیون کوپ کے معرکہ سے گولہ باری کی حالت میں لارڈ رابرٹس[1] کے اکلوتے بیٹے کو اٹھاکر لائے تھے اور اس خدمت جلیلہ کے اعتراف میں انکا جنگی مراسلات میں ذکر کیا گیا تھا[2]

اُن کا پیشکش منظور ہوا۔ انہیں ایک ہندوستانی فوج کے ٹکڑے کے ساتھ ذمہ دار جگہ دیدی گئی لیکن فرض منصبی کی ادائگی میں سردی لگ جانے سے انہیں پلورسی (ذات الصدر) کا عارضہ ہوگیا اور اُن کی جان خطرے میں

---

[1] Lord Roberts. [2] دیکھو ضمیمہ ہفتم

پڑ گئی جب وہ رُو بصحت ہو گئے تو ڈاکٹروں نے انہیں شمالی یورپ کے سرد مقامات چھوڑ دینے کا حکم دیا اور ہندوستان کی دھوپ اور گرمی میں رہنے کا مشورہ دیا

اپنی آمد کے کچھ ہی دن بعد مدراس میں ایک عام ڈنر کے موقع پر اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ "سلطنتِ برطانیہ" کا جام صحت تجویز کریں۔ انھوں نے خوشی سے اس بات کو قبول کر لیا۔ آنریبل مسٹر کوربیٹ[1] اٹرنی جنرل، مدراس نے اُن کا تعارف ان الفاظ میں کیا کہ "انھوں نے سلطنت برطانیہ کے استحکام کے لئے خلوص اور تندہی کے ساتھ محنت شاقہ کی ہے" مسٹر گاندھی نے حسب ذیل تقریر کی:۔

"ہندوستان میں تین مہینے تک دورہ کرنے کے دوران میں، نیز جنوبی افریقہ میں مجھ سے کثرت کے ساتھ یہ سوال کیا گیا ہے کہ تہذیبِ جدید کا مخالف ہوتے اور ایک مسلمہ محبِ وطن ہونے کی حیثیت سے میں کس طرح سے سلطنتِ برطانیہ کا جس کا ہندوستان اتنا بڑا حصہ ہے، وفادار رہ سکتا ہوں، اور کس طرح سے یہ امر میرے عقیدہ کے عین مطابق ہے کہ ہندوستان اور انگلستان باہمی استفادہ کے لئے مل کر کام کر سکتے ہیں۔ آج شام کو اس اہم اور عظیم الشان جلسہ میں مجھے سلطنت برطانیہ کے ساتھ ازسرنو اظہار وفاداری کرنے سے بے حد مسرت ہوتی ہے اور میری وفاداری بہت ہی خود غرضانہ اسباب پر مبنی ہے۔ ستیاگرہی ہونے کی حیثیت سے میں نے معلوم کیا ہے کہ ستیاگرہی کو خواہ وہ اپنے آپ کو

[1] Corbett

کسی قسم کے حالات کے ماتحت پائے، ایسے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ ستیاگرہ کے عقیدہ کا قائل ہے اور میں نے دریافت کیا ہے کہ سلطنتِ برطانیہ چند مطامحِ نظر رکھتی ہے جن کیساتھ مجھے محبت ہے اور ان مطامحِ نظر میں سے ایک یہ ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کی رعایا کا ہر فرد اپنی قوتوں اور عزت کے اظہار کے لیئے زیادہ سے زیادہ آزادانہ گنجایش رکھتا ہے اور نیز اس بات کے لیئے جسے وہ اپنے ضمیر کا حق خیال کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات جس قدر سلطنتِ برطانیہ پر چسپاں ہوتی ہے اتنی دنیا کی کسی اور سلطنت پر چسپاں نہیں ہوتی۔ (نعرۂ مسرت) میں محسوس کرتا ہوں جیسا کہ آپ غالباً جانتے ہیں کہ میں کسی حکومت کا عاشق نہیں ہوں اور میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہدی ہے کہ وہی حکومت سب سے اچھی ہے جو کم سے کم حکومت کرتی ہے اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کے ماتحت رہ کر میرے لیئے یہ ممکن ہے کہ مجھ پر کم سے کم حکومت کی جائے۔ سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ میری وفاداری کا باعث یہی جذبہ ہے (نعرۂ مسرت)"

بہت سے مختلف مواقع پر مسٹر گاندھی نے کھلم کھلا اپنے آپکو "سلطنتِ برطانیہ کا عاشق" ظاہر کیا ہے اس لیئے کہ وہ ایک قومی مساوات پر قائم ہے اور نجی حقوقِ ضمیر کے استعمال کے لیئے پوری آزادی دیتی ہے

جنگ کے ابتدائی تین سالوں میں انھوں نے عراق عرب میں ایمبولینس کا باقاعدہ کام کرنے کی غرض سے حکومتِ ہند کو بار بار اپنی خدمات پیش کیں اور وہاں ہندوستانی رضاکاروں کی ایک چیدہ جماعت لیجانیکا ارادہ

ظاہر کیا لیکن وائسرائے نے گہرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ ہندوستان میں آپ کی موجودگی محاذِ جنگ میں کسی امداد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم ہے یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اس زمانہ میں انہیں سلطنت کے تمفاد کے لئے بہبودِ خلائق کی نمایاں خدمت کے لئے قیصرِ ہند کا سنہری تمغہ عطا کیا گیا تھا دورانِ جنگ میں وائسرائے اہم امور میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور انھوں نے اپنی ذات سے حکومت کو پوری پوری امداد دی تھی خصوصیت کے ساتھ اُن کی صاف اور بے لاگ تقریریں جو انھوں نے خفیہ انقلاب انگیزوں کی سازشوں کے خلاف کیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی کے قتل پر منتج ہوا کرتی ہیں، بہت قیمتی خیال کی گئیں۔ عدمِ تشدد پر کامل عقیدہ رکھنے والے شخص کی حیثیت سے تشدد کی ایسی صورتوں کے خلاف مذمت کے جو الفاظ انھوں نے ادا کئے تھے اُن کا بہت اثر ہوا اس لئے کہ خود انکی حب الوطنی در ملکی خدمت کے خلاف کسی کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہ تھی

لیکن ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جس میں کروڑہا باشندے بستے ہیں وہ خرابیاں جو اعلیٰ مرکزی اور ملازم شاہی انتظام سلطنت سے متعلق ہیں بہت جلد ظاہر ہو گئیں۔ مہاتما گاندھی سیاسیات میں مقدس ہستی کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ عجیب و غریب اجتماع ہے۔ وہ کبھی ناانصافی یا ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے

اول اول انھوں نے ان خرابیوں کو محض مقامی خیال کیا۔ وہ اپنے نیز حربہ ستیاگرہ کے ذریعہ انہیں درست کرنے پر تیار تھے۔ اس طور پر وہ یقین رکھتے تھے کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کی جس کے وہ بہت عملی رکن تھے، بہت

بڑی خدمت عامہ بجا لائیں گے۔ اِن تمام تحریکوں میں انھوں نے ایسی
مسرت افزا نیکدلی اور دوستانہ صفائی سے کام لیا کہ اُن کے مخالفین بہت
جلد ان کے دوست بن گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایمانداری سے کام
لیتے تھے اور کبھی بھی انھوں نے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک سے زیادہ
موقع پر سرکاری حکام نے اُن کی سچائی اور صداقت سے متاثر ہو کر اُن
کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا۔ اس طرح سے بعض اہم خرابیوں کی اصلاح کسی
قسم کی بددلی پیدا ہوئے بغیر عمل میں آگئی۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ انھوں
نے جس طرح برطانوی حکام کو ستیاگرہ کی دھمکی تھی بعینہٖ اسی طرح سے
انھوں نے ہندوستانی مالکانِ مل کو دی تھی۔ انھوں نے کبھی قومی منافرت
سے اپیل نہیں کیا

جنگ کے اختتام کے قریب انھوں نے اپنے جوش اور سرگرمی سے
عالم میں برطانوی سلطنت کی جانب سے ایک اور قدم اٹھایا جس نے اُنکے
بہترین دوستوں تک کو حیرانی میں ڈال دیا۔ کیونکہ وہ دیہاتیوں میں رنگروٹ
بہم پہونچانے کے لئے چلے گئے تھے تاکہ اہنیں ترکوں اور جرمنوں کے خلاف
میدانِ جنگ میں جانے اور لڑنے کے لئے بھرتی کرائیں۔ انھوں نے یہ کہہ
کر اپنے اس فعل کی حمایت کی کہ بزدل کی طرح پیچھے ہٹنے سے یہ کہیں بہتر ہے
کہ جنگ کی جائے، یہ کہ محض بزدلی کی وجہ سے دیہاتی جنگ سے باز رہتے
ہیں نہ کہ کسی اخلاقی اصول کی وجہ سے۔ انھوں نے کہا کہ اخلاقی جرأت
جسمانی دلیری سے کہیں بڑھ کر ہے ؛ لیکن بزدلی کے مقابلہ میں جسمانی جرأت

ہی قابلِ ترجیح چیز ہے

بھرتی کرانے کی یہ مہم تقریباً اُن کی جان لیوا ثابت ہوئی اس لئے کہ اُن پر پیچش کا بری طرح حملہ ہوا اور حالتِ بیماری میں ایک وقت ایسا بھی آن پہونچا تھا کہ وہ تقریباً موت کے منہ میں جا چکے تھے

دورانِ جنگ میں ہندوستان کی اِس تمام اصولی اور سچی خدمت کی روشنی میں ہندوستانی حکومت کے سارے نظام کے خلاف جو بغاوت انھوں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں کی وہ اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ انگریزوں کے نام جو خطوط انھوں نے تحریر کئے تھے اور جو آگے چل کر درج کئے گئے ہیں[۱] اُن میں تفصیل کے ساتھ انھوں نے ان تمام امور کی توضیح فرما دی ہے۔ اِس مقام پر صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ تحریکِ عدمِ تعاون کے شباب میں بھی انھوں نے ذاتی طور پر اپنی سی انتہائی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کیساتھ اچھے تعلقات قائم رہیں اور یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف برطانوی نظامِ حکومت کے خلاف۔ وہ اس وقت بھی متمنی تھے کہ جب وہ نظام بدل جائے گا تو وہ پہلے کی طرح اشتراکِ عمل کر سکیں گے۔ میں خود اس امر کی شہادت دینے کے لئے تیار ہوں کہ اُن کے دل میں انگریزوں کے خلاف ذرّہ برابر جذبۂ منافرت کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔ برخلاف اس کے جنوبی افریقہ میں انگریزوں اور ولندیزیوں کے تجربہ نے اُن کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ جو شدید جنگ ان کے نظام کی

[۱] دیکھو باب چہاردہم

بدترین خرابی کے خلاف وہ برپا کر رہے ہیں اُس میں وہ لوگ اُنکی قلبی صفائی نیک دلی اور نیز اُن کی بشاشت کی قدر کریں گے۔ چنانچہ جب انھوں نے اُن کی حکومت کو "شیطانی" کہا اُس وقت بہت سے انگریز ہنس پڑے اور اس لفظ نے اُن کے خلاف ایک مذاق کی حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن وہ اپنی مذمت میں نہایت سنجیدہ تھے۔ انھوں نے محض بات چیت پر اکتفا نہیں کیا: انھوں نے عمل کر کے دکھایا۔

ہمارے پاس ایک مختصر شکل میں مہاتما گاندھی کا ایک دلچسپ بیان موجود ہے جس میں مقاومتِ مجہول کی کئی ایک مختلف کشمکشوں کا حال درج ہے جو بالآخر آل انڈیا تحریکِ عدم تعاون کا باعث ہوئی۔ اس بیان کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ ان کے خیالات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ میں نے اُن مقامات میں جہاں مسٹر گاندھی کے اپنے الفاظ مفہوم کو پورے طور پر ظاہر نہیں کرتے، خطوط وحدانی میں بعض تشریحات اپنے الفاظ میں درج کر دی ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ ہر کشمکش کا مقصود کیا تھا۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"بھائی موتی لال کی وجہ تھی جو دھوان کے اچھے درزی تھے اور پبلک کاموں کا بہت ذوق رکھتے تھے کہ میں نے پہلے پہل مسئلہ ویرم گام سے دلچسپی لینی شروع کی۔ میں انگلستان سے ابھی ابھی واپس آیا تھا اور سنہ ۱۹۱۵ء میں کاٹھیاواڑ جا رہا تھا۔ میں تیسرے درجہ میں سفر کر رہا تھا۔ دھوان اسٹیشن پر موتی لال اپنی چھوٹی سی جماعت لے کر میرے پاس آئے۔ انھوں نے

ویرم گام کے باشندوں کی بعض مصائب کا حال بیان کیا اور کہا۔
'اس مصیبت (یعنی برطانوی ہندوستان اور ریاستہائے کاٹھیاواڑ کے درمیان پرمٹ کی جدید بندشوں کے قیام) کا تدارک کرنے کی غرض سے کچھ کوشش کیجئے۔ اس طرح سے آپ کاٹھیاواڑ کی جو آپ کا مولد بھی ہے، بہت بڑی خدمت انجام دیں گے'
ان کی آنکھوں سے رحم اور عزم دونوں بات کا اظہار ہوتا تھا
'کیا آپ جیل جانے کے لئے تیار ہیں؟' میں نے پوچھا
'ہم پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار ہیں' انہوں نے جلدی سے جواب دیا
'میرے لئے جیل کافی ہے' میں نے کہا۔ 'لیکن ایسا تو نہیں کہ آپ مجھے تن تنہا چھوڑ دیں'

'اس بات کا جواب تو زمانہ مستقبل دیگا' موتی لال نے کہا
میں راجکوٹ پہونچا، تفصیلی معلومات حاصل کی اور حکومت کے ساتھ خط وکتابت شروع کر دی۔ مختلف مقامات پر جو تقریریں میں نے کیں ان میں یہ اشارہ کر دیا کہ بشرط ضرورت لوگوں کو ستیاگرہ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ یہ تقریریں حکومت کی توجہ میں لائی گئیں۔ اس طریقہ سے انہوں نے حکومت کی خدمت کی اور غیر دانستہ طور پر عامۃ الناس کی بھی۔ بالآخر میں نے اس موضوع پر لارڈ چیمسفورڈ سے گفتگو کی انہوں پرمٹ کی بندشوں کو دور کرنے کا وعدہ کر لیا اور انہوں نے وعدہ ایفائی کی۔ میں جانتا ہوں کہ دوسروں نے بھی اس سلسلہ میں کوشش کی تھی۔

لیکن میری پختہ رائے یہ ہے کہ مقاومت مجہول کا فوری امکان مطلوبہ داد رسی حاصل کرنے میں بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوا

اس کے بعد پابند معاہدہ مزدوری کے خلاف جد و جہد کی گئی (تاکہ برطانوی نوآبادیوں کے لئے ہندوستانی پابند معاہدہ مزدوروں کی بھرتی رد کی جائے۔) پابندِ معاہدہ مزدوری کی تنسیخ کے لئے بڑی بڑی کوششیں کی گئیں۔ پبلک میں کافی ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ ممبئی کے جلسہ میں ۳۱ مئی ۱۹۱۷ء کی تاریخ اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ اس دن کے بعد سے پابندِ معاہدہ مزدوروں کا جانا بند ہو جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے خواتین کے ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ میں یہاں پر نہایت نیک اور خدا ترس بہن مسز جائیجی پیٹیٹ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے ہی اس وفد کو ترتیب دیا تھا۔ اس موقع پر بھی صرف ستیاگرہ یا مقاومتِ مجہول کی تیاری کی وجہ سے کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ لیکن یہ فرق یاد رکھنا ضروری ہے یعنی یہ کہ اس معاملہ میں پبلک کے ایجیٹیشن کی بھی ضرورت تھی۔ پابند معاہدہ مزدوری کا انسداد ویرم گام کی پرمٹ کی بندشوں کی تنسیخ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے بہت سی غلطیاں کی تھیں جن کی ابتدا راولٹ ایکٹ کے نفاذ سے ہوئی۔ باوجود اس کے میرا خیال ہے کہ وہ دانشمند حاکم تھے لیکن کون وائسرائے ایسا ہے جو سول سروس کے مستقل افسران کے اثر و رسوخ کا عرصۂ دراز تک مقابلہ کر سکتا ہے؟

بلحاظ ترتیب تیسری جدوجہد چمپارن کی کشمکش تھی (جو اس غرض سے جاری کی گئی تھی کہ نیل کی کاشت کی متعلقہ بعض خرابیوں کا تدارک کر دیا جائے۔) اس مقام پر باقاعدہ ستیاگرہ کی گئی محض اُس کی تیاری کافی ثابت نہیں ہوئی اس لئے کہ مخصوص مفاد مقابلہ اور مخالفت میں صف آرا ہو گئے تھے۔ اہالیان چمپارن نے اپنی امن پسندی کا جو ثبوت دیا وہ اس قابل ہے کہ اسے معرض تحریر میں لایا جائے۔ میں خیال، قول اور فعل میں لیڈروں کے مکمل عدم تشدد کی شہادت دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ دراز کی خرابی چھ مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہو گئی

چوتھی کشمکش احمد آباد کے ملوں کے مزدوروں اور مالکانِ مل کے درمیان برپا ہوئی۔ گجرات اس کی تاریخ سے پوری طرح واقف ہے۔ مزدور کس قدر امن پسند تھے! جہاں تک لیڈروں کا تعلق ہے میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ پھر بھی میری یہ رائے ہے کہ اس معاملہ میں جو فتح نصیب ہوئی، وہ بالکل خالص نہ تھی اس لئے کہ جو برت مجھے رکھنا پڑا[1] تاکہ میں مزدوروں کے عزم و استقلال میں استحکام پیدا کروں، اُس کا بالواسطہ مالکانِ مل پر بھی اثر پڑا۔ روزہ کا اُن پر اثر بالضرور پڑنا چاہیے تھا اس لئے کہ میرے اُن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ تاہم واقعہ کا اخلاقی پہلو بدیہی ہے

---

[1] جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ملوں کے مزدور اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہے اور اپنا مقصد حاصل کئے بغیر کام پر واپس جانے کی تیاری کر رہے ہیں تو مسٹر گاندھی نے اعلان کر دیا کہ وہ اُسوقت تک برت رکھیں گے جب تک کہ ہڑتال کا مقصد پورا نہ ہو جائیگا

پانچویں کیرا کی کشمکش تھی (اور یہ متعلق تھی اس امر سے کہ حکومت نے لگان اراضی حالت قحط میں بھی ضرورت سے زیادہ لگا دیا تھا) میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس موقع پر ستیا گرہ کے تمام مقامی لیڈروں نے خالص صداقت اور سچائی کی پابندی کی تھی یا نہیں۔ بہر حال امن تو قائم رہا تھا۔ لیکن زراعت پیشہ لوگوں کا عدم تشدد ملوں کے مزدوروں کی طرح محض سطحی تھا۔ اس لئے ہم اس کشمکش میں سے عزت سنبھالے ہوئے باہر نکل آئے۔ بہر حال باشندوں میں بہت کچھ بیداری پیدا ہو گئی لیکن کیرا نے عدم تشدد کے سبق کو پوری طرح نہیں سمجھا تھا اور نہ ملوں کے مزدوروں نے صلح، آشتی اور امن کا صحیح مفہوم سمجھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو مصائب برداشت کرنی پڑیں

چھٹی کشمکش راؤلٹ ایکٹ سے متعلق تھی۔ (اِس ایکٹ کی رو سے بے گناہ اشخاص کو بغیر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے قید خانہ میں رکھا جا سکتا تھا) اس موقع پر ہماری فطری کمزوریاں نمایاں ہو گئیں لیکن ابتدائی بنیاد اچھی طرح اور صحیح طریقہ سے رکھدی گئی تھی۔ ہم نے اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کو تسلیم کر لیا۔ مجھے بھی اپنی ہمالیہ برابر غلطی[1] کا اقرار کرنا پڑا۔ مجھے نہ صرف خود برت رکھنا پڑا بلکہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی دعوت دینی پڑی۔ راؤلٹ ایکٹ پر کبھی بھی عملدرآمد نہیں ہوا اس وقت بھی جبکہ اس کا نفاذ عمل میں آگیا تھا اور بالآخر وہ سیاہ قانون منسوخ ہو گیا۔ اس جد و جہد

[1] اُن کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ انہیں علم نہ تھا کہ عام لوگ تشدد اختیار کرینگے اگر انہیں ان ہی کی حالت پر چھوڑ دیا گیا

نے ہمیں عظیم الشان سبق سکھایا

ساتویں جدوجہد اس غرض سے کی گئی تھی کہ خلافت اور پنجاب کی ناانصافیوں کی داد رسی کی جائے اور سوراج حاصل کیا جائے۔ یہ جدوجہد اب تک قائم ہے۔ اور میرا عقیدہ غیر متزلزل ہے کہ اگر ستیاگرہی آخر وقت تک لڑتے رہیں گے تو کامیابی یقینی ہے

ستیاگرہ کی یہی خوبصورتی ہے۔ وہ خود بخود ہم تک آتی ہے، ہمیں اسکی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑیگا۔ خود اصول میں ایک فطری خوبی پنہاں ہے ایک دھرم یدتھ (وہ جنگ جس کی بنیاد نیک مقاصد پر ہو) جسمیں رازوں کو چھپانے کی ضرورت نہ ہو، جس میں مکر و فریب کی گنجایش نہ ہو اور کذب کا کوئی دخل نہ ہو، بے طلب آتی ہے اور مذہبی شخص اس کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ جس جنگ کی تجاویز پہلے سے تیار کی جائیں وہ کبھی نیک مقاصد رکھنے والی جنگ نہیں کہلائے گی۔ نیک مقاصد کی حفاظت میں جو جنگ کیجائیگی، اس میں خود خدا تعالےٰ مہمات کا خاکہ کھینچتا ہے اور لڑائیوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ نیک مقاصد والی جنگ صرف خدا کے نام سے شروع کی جا سکتی ہے اور صرف اس وقت جبکہ ستیاگرہی اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی بےکسی اب آخری درجہ کو پہونچ چکی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سوائے تاریکی کے اور کچھ نہیں پاتا، اس وقت خدا تعالیٰ اس کی امداد و اعانت فرماتا ہے۔ خدا اس وقت ہماری مدد کرتا ہے جب ہم اپنے آپ کو ان خاک کے ذرّوں سے بھی عاجز سمجھ لیتے ہیں جو ہمارے پاؤں کے تلے

آتے ہیں۔ صرف کمزوروں اور بے لبوں کو ہی خدائی امداد ملتی ہے"

جس شد و مد کے ساتھ انہوں نے "نیکی کی ان لڑائیوں" کو جاری رکھا، اسے سمجھنے کی غرض سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کیرا کی جنگ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ درج کر دیا جائے۔ اُس وقت مسٹر گاندھی نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں صلح ساز اور ثالث کی حیثیت سے کام کروں اور اس لئے اس کے تمام واقعات کا مجھے اچھی طرح سے علم ہے

ہندوستان کے نظام اراضی کے ماتحت حکومت ملک کے ایک بہت بڑے حصہ اراضی کی مالک ہے۔ اسامی دیہات کے باشندے ہوا کرتے ہیں جن کے پاس اراضی کے چھوٹے چھوٹے قطعات ہوتے ہیں جن کا کرایہ وہ حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ یہ کرایہ "لگان اراضی" کہلاتا ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء دیہات والوں کے لئے غیر معمولی طریقہ سے خراب ثابت ہوا اور اس لئے انھوں نے سال آیندہ تک "التوائے لگان" کی درخواست کی اس امید میں کہ شاید اُس وقت فصلوں کی حالت بہتر ہو جائے۔ حکومت نے ایک گاؤں کے لئے تو "پورے التوا" کو منظور کر لیا اور ایک سو تین دیہات کے لیے "نصف التوا" کی منظوری دی، لیکن اسے کافی خیال نہیں کیا گیا، اس لئے انھوں نے ازسرنو تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ ثابت ہو جائے کہ اُن کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ حکومت بمبئی اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہیں ہوئی اور کسانوں کو دھمکی دی گئی کہ اگر وہ لگان ادا نہ کریں گے تو انہیں فی الفور بے دخل کر دیا جائیگا۔ مسٹر گاندھی نے کسانوں کو جمع کیا اور مقاومت مجہول کا مندرجہ ذیل عہد لیا گیا:۔

یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے دیہات کی فصلیں روپیہ میں چار آنے (یعنی ۲۵ فیصدی) سے بھی کم ہیں، ہم نے گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ وصولی لگان کو سال آئندہ تک ملتوی رکھے لیکن چونکہ حکومت نے ہمارے مفروضہ کو منظور نہیں فرمایا اس لئے ہم دستخط کنندگان بذریعۂ ہذا نہایت محکم طریقہ سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم پورا یا باقی ماندہ لگان ادا نہیں کریں گے بلکہ حکومت کو اجازت دیدیں گے کہ وہ وصولی لگان کے لئے جو قانونی کارروائیاں مناسب خیال کرے، انہیں عمل میں لائے اور ہم لگان ادا نہ کرنے کے نتائج کو خوشی خوشی برداشت کریں گے۔ ہم اپنی زمینوں کو بھی ضبط ہونے دیں گے لیکن ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی ادا نہیں کریں گے اور اس طرح سے ہم اپنا وقار نہیں کھوئیں گے اور نہ اپنے طرزِ عمل کو غلط ثابت کریں گے۔ اگر حکومت تمام ضلع میں لگان کی دوسری قسط کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کرے تو ہم میں سے وہ لوگ جو ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، سارے کا سارا لگان یا اُس کا باقیماندہ حصہ ادا کردیں گے۔ ہم میں سے جو لوگ روپیہ ادا کرنے کی مقدرت رکھتے ہیں، اُن کے اب تک ادا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ ادا کردیں گے تو خطرہ ہے کہ زیادہ غریب کسان پریشانی میں اپنا اثاثہ نہ بیچ ڈالیں یا ادا کرنے کی غرض سے روپیہ قرض نہ لیں اور پھر بعد کو تکلیف اٹھائیں

ان حالات میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ جو لوگ ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ وہ غربا کی حفاظت کریں

بعد کو بغیر کسی مزید تحقیقات کے ایک سمجھوتہ عمل میں آگیا۔ مگر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہندوستانی اصلاحات کی جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے

۱۹۱۹ء میں رپورٹ پیش کی تھی کہ ہندوستان کے لگان اراضی کے نظام میں اس بارے میں نقص موجود ہے اور بیان کیا تھا کہ لگان اراضی کی تعین پر آئینی طریقہ سے نظرثانی کرنے کی سخت ضرورت ہے لیکن گذشتہ سال تک اس پر کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ مختلف لیجسلیٹو کونسلوں کی طرف سے اس قسم کے مسلسل مطالبات کئے گئے ہیں کہ آئینی نظرثانی کرنے کے طریقۂ کار کو مرتب کرلیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر گاندھی ۱۹۲۸ء میں بار دولی کے مقام میں ایک اور تحریک ستیاگرہ جاری کرنے پر مجبور ہوئے اس مقصد سے کہ اُس ضلع میں لگان اراضی کی تعیین پر نظرثانی کرائیں۔ بار دولی کی یہ جنگ بھی عدم تشدد کے اسلحہ سے لڑی گئی تھی۔ اور جس نتیجہ پر وہ ختم ہوئی وہ یہ تھا کہ نظرثانی منظور کرلی گئی

اُن واقعات کے متعلق تفصیل میں جانے کی اب ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۹ء میں بزمانہ مارشل لا پنجاب میں رونما ہوئے تھے "جنگی ذہنیت" کا ابھی تک غلبہ تھا اور جو باتیں مارشل لا کے زمانہ میں روا رکھی گئیں اُن سے یہ ذہنیت بالکل بے نقاب ہوجاتی ہے۔ مہاتما گاندھی کو ان واقعات کا سب سے زیادہ صدمہ پہونچا۔ اُس سال ماہِ اکتوبر میں میں بھی اُنکے ساتھ پنجاب گیا تھا۔ اپنی طویل بیجیش کے بعد اُن کی صحت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ وہ جسمانی نقاہت کی وجہ سے دن کے بیشتر حصہ میں لیٹے رہنے پر مجبور رہتے۔ اس کے باوجود انہوں نے وہیں رہ کر تحقیقات جاری رکھی اور انہیں بدترین واقعات کا علم ہوا۔ فسادات پنجاب کے متعلق کانگریس

نے جو تحقیقاتی رپورٹ کی تھی اس کے مصنفین میں سے وہ بھی ایک تھے
باوجود اسکے کہ تحقیقاتی رپورٹ کی تنقیحات اُن کیلئے اہانت اور تکلیف کا باعث ہوئیں، انہوں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے دسمبر ۱۹۱۹ء والے اجلاس منعقدہ امرتسر میں یہ سفارش پیش کی کہ اصلاحات کو قبول کرلیا جائے اور انہوں نے آئینی طور پر کام بھی کیا۔ یہ صرف انکی شخصیت کے مقناطیس اور جادو کا اثر تھا کہ ایسے زمانہ میں جبکہ تلخیاں اپنی حد کو پہونچ چکی تھیں، نیشنل کانگریس پُرامن فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوئی

لیکن آخری ضرب ۱۹۲۰ء میں پہونچی جب دارالامرا نے ایک قرارداد کے ذریعہ جنرل ڈائر کے خلاف مذمت کی تجویز منظور کرنے سے انکار کردیا اور ہنٹر کمیشن کی رپورٹ نے بھی سرکاری کارروائی کی مذمت کرنے میں پس وپیش سے کام لیا، جب عین اسی زمانہ میں سیورے کے معاہدہ پر دستخط ہوئے جسنے اس رہی سہی امید کا خاتمہ کردیا کہ جنگ کے اختتام پر ترکی کیساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھا جائیگا۔ اسکے بعد آخرکار انکی مذلتوں کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے اپنی زندگی کا نہایت عظیم الشان فیصلہ کیا کہ وہ اُسوقت تک ہندوستانی برطانوی سلطنت کیساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار کردینگے جبتک کہ ان دونوں مظالم کی دادرسی نہو جائیگی اور سوراج حاصل نہو جائیگا۔ یہ فیصلہ جسمیں انھوں نے اپنا تمام زور صرف کردیا تھا آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ایک خاص جلسہ میں کیا گیا تھا جو ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کے مقام پر منعقد ہوا تھا۔ ریزولیوشن کا ایک حصہ جو انکے اثر ورسوخ کی وجہ سے بالاتفاق منظور کرلیا گیا تھا، یہ تھا کہ جدوجہد خالصتاً عدم تشدد کے اصول پر چلائی جائیگی۔ اس تحریک کو غیر متشدد عدم تعاون کے مجمّدے نام سے یاد کیا گیا تھا

باب چہاردہم

”ہر انگریز کے نام“

کوئی شخص برطانیہ عظمیٰ اور برطانوی سلطنت کے متعلق مہاتما گاندھی کے طرزِ عمل کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ یہ محسوس نہ کر لے کہ ”امرتسر“ ہی وہ ایسا نازک واقعہ تھا جس نے مہاتما جیسے پورے تعاون کو ایک مسلمہ مخالف میں تبدیل کر دیا۔ اس تبدیلی سے پیشتر کے طرزِ عمل کے بارے وہ خود رقمطراز ہیں:۔

”مشکل سے کوئی ایسا شخص نکلے گا جو مجھ سے زیادہ برطانوی نظامِ سلطنت سے اظہارِ وفاداری کرتا ہو۔ مجھے اب معلوم ہوتا ہے کہ اس وفاداری کی تہ میں میری سچائی کی محبت جلوہ گر تھی۔ میرے لئے یہ امر کبھی ممکن نہیں ہوا کہ میں وفاداری کی یا اس غرض سے کسی اور نیکی کی ترغیب و تحریص دوں۔ نیٹال میں جو جلسہ ہوا کرتا تھا اُس میں قومی ترانہ[1] ہمیشہ گایا جاتا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے بھی گانے میں شامل ہونا چاہیئے۔ یہ بات نہیں کہ میں برطانوی حکومت کے نقائص سے ناواقف تھا، بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ بہ حیثیت

---

[1] NATIONAL ANTHEM انگریزوں کا یہ قومی ترانہ درحقیقت ایک دعائیہ نظم ہے جو ہر تقریب کے موقع پر ترنم کیساتھ گائی جاتی ہے۔ یہ نظم ملک الشعراء ٹینی سن کے فکر کا نتیجہ ہے اور انگریزی بولنے والے ممالک میں اسے بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ مترجم

مجموعی وہ قابلِ قبول ہے۔ اُن ایام میں میں یقین کرتا تھا کہ برطانوی حکومت بحیثیت مجموعی محکومین کے لئے فائدہ رساں ہے۔ میں نے اپنی زندگی بھر کبھی اس وفاداری سے فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ میں نے کبھی اس کے ذریعہ ذاتی اغراض حاصل کرنے کی کوئی کوشش کی۔ میں وفاداری کو ایک فرض خیال کرتا تھا اور اس لئے بغیر کسی معاوضہ کے میں اسے ادا کرتا تھا

اسی جذبہ کے ماتحت میں نے اپنے خاندان کے بچوں کو قومی ترانہ یاد کرادیا تھا۔ بعد میں ترانہ کے الفاظ میرے کانوں پر گراں گذرنے لگے۔ جوں جوں اہمسا کے بارے میں میرا تخیل پختہ تر ہوتا گیا ووں ووں میں اپنی تحریر و تقریر کے متعلق زیادہ محتاط اور ہوشیار ہوتا گیا۔ قومی ترانہ کے الفاظ "اس کے دشمنوں کو منتشر کردے اور اُن کے دغابازانہ منصوبوں کو ملیامیٹ کردے" بالخصوص مجھ پر گراں گذرتے تھے۔ ان خیالات میں ڈاکٹر بوتھ[1] میرے ہم خیال تھے اور وہ متفق تھے کہ اہمسا پر عقیدہ رکھنے والے کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ان اشعار کو گائے۔ ہم کیونکر تصور کرسکتے ہیں کہ ہمارے نام نہاد "دشمن دغاباز" ہیں؟ اور چونکہ وہ دشمن ہیں اس لئے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ ضروری طور سے غلطی پر بھی ہوں؟ ہم خدا سے صرف انصاف کے طالب ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بوتھ نے کلیتاً میرے خیالات کی تصدیق کی اور انہوں نے اپنے مجمع کیلئے ایک نیا ترانہ موزوں کرلیا"

---

[1] ڈاکٹر بوتھ (Dr Booth) نیٹال میں گنے کے کھیتوں کے ایک نہایت ہی مہربان طبی افسر تھے جنہیں بعد میں پادری بنادیا گیا۔ وہ کیپ ٹاؤن میں سینٹ برنا باس کے ڈِکن بن گئے تھے اور جنوبی افریقہ کی ہندوستانی جماعت ان سے بیحد محبت کرتی تھی

جنوبی افریقہ میں بیس سال سے زیادہ مدت تک مسٹر گاندھی کیساتھ جو نسلی سلوک روا رکھا گیا وہ سوائے تارک الدنیا کے ہر شخص کے دل میں ایسی تلخی پیدا کر سکتا تھا جو بالآخر بغاوت پر منتج ہوتا۔ اس لئے کہ ہر روز انسانیت سوز مظالم رنگ کی قیود کے ماتحت جس کے ساتھ اُسکی منافرت پیدا کرنے والی روایات بھی وابستہ تھیں برداشت کرنے پڑتے تھے۔

اس کے باوجود جنوبی افریقہ میں جیسا کہ مجھے ذاتی تجربہ کی بنا پر معلوم ہے، انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی ہمت نہیں ہاری اور نہ وہ آخری انصاف سے کبھی مایوس ہوئے۔ جنرل اسمٹس[له] کے ساتھ اُن کی متواتر نوک جھونک رہتی تھی۔ وہ خوشی سے اور ہنستے ہوئے قید خانہ گئے لیکن انہوں نے کبھی برطانوی نظام پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ یہی یقین رکھا کہ اُس کی بنیاد انصاف پر قائم ہے۔ انجام کار انہیں اپنے اس عقیدہ کا صلہ مل گیا، اور وہ اُس کی اخلاقی جنگ میں فتحیاب نکلے۔ ہر قدم پر انہیں اپنے ہم ملکیوں کے لئے معاشرتی اور سیاسی آزادی میں ہلکی ترقی حاصل ہوتی گئی۔ جنوبی افریقہ میں آخری اور سب سے عظیم الشان تحریک مقاومت مجہول کے اختتام پر انہوں نے جوہنسبرگ میں اپنی آخری تقریر میں اپنے نکتۂ خیال کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا:-

"برطانوی دستور کے متعلق جو معلومات مجھے حاصل ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح، اسی نے مجھے برطانوی سلطنت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ آپ اس دستور

له Gen. Smuts

کے پرزے پرزے کر ڈالیے اور میری وفاداری بھی خود بخود پرزے پرزے
ہو جائے گی۔ برخلاف اس کے اسے صحیح سالم حالت میں رہنے دیجئے اور پھر
آپ مجھے اس خدمت پر بلا کسی شرائط کے مامور پائیں گے۔ ہمارے سامنے
یعنی جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کے سامنے ہمیشہ یہ پسند رہی ہے
کہ ہم یا تو برطانوی سلطنت سے اپنے آپ کو علیحدہ کرلیں یا مقاومت مجہول
کے ذریعہ جد و جہد کریں اس غرض سے کہ برطانوی دستور کے مطابق نظر
قائم و برقرار رہیں۔ قانون کی نظر میں نسلی مساوات کا نظریہ ایک دفعہ
تسلیم کرلئے جانے کے بعد کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اسے اصولاً ہر قیمت
پر قائم و برقرار رکھنا چاہئے، یعنی اس اصول کو کہ تمام قانونی ضوابط میں
جو سلطنت کو ایک ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں کوئی نسلی وجہ نہیں لگایا جائیگا
کوئی نسلی تفریق نہیں روا رکھی جائے گی اور رنگ کی بنا پر کوئی عدم قابلیت
نہیں پیدا کی جائے گی،،

ہندوستان میں بھی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جنوبی افریقہ سے واپسی
کے بعد انہوں نے بہت سی اخلاقی جنگوں کی رہنمائی کی ہے جو اسی نوعیت
کی تھیں جو ٹرانسوال اور نیٹال میں کامیابی کے ساتھ لڑی جا چکی تھیں۔
ہر مہم سچائی اور انصاف کے لئے تازہ فتح پر اور زیادہ باہمی روابط پیدا کرنے
پر منتج ہوتی تھی۔ انہوں نے مدتہائے مدید کے ظلم سے چمپارن کے غریب
دہقانیوں کو نجات دلوائی اور ساتھ ہی انہوں نے معاہدہ والی مزدوری
کے نظام کے خلاف جس کے ماتحت نوآبادیوں میں گنے کے کھیتوں کے لئے

ہندوستانی مزدور بھرتی کئے جاتے تھے، کامیاب جنگ کی۔ انہی اخلاقی ہتھیاروں کے ساتھ انھوں نے اپنے ہم ملکیوں یعنی احمد آباد کے مالکان مل کے خلاف جنگ کی جبکہ وہ ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کر رہے تھے

اس تمام زمانہ میں نہ صرف جنوبی افریقہ میں بلکہ ہندوستان میں بھی میں نے مہاتما گاندھی کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا ہے کہ "اگر اس امر پر میرا پختہ عقیدہ نہ ہوتا کہ برطانوی سلطنت کے اندر نسلی مساوات انسان کا پیدائشی حق ہے تو میں کبھی کا باغی ہو چکا ہوتا"

میرا خیال ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس پوزیشن سے نہیں ہٹے، اگر آج بھی جبکہ وہ حکام وقت کے ہاتھوں ہندوستان میں پھر قید میں ڈال دئے گئے ہیں، انہیں یہ یقین ہو جائے کہ دل کی تبدیلی عمل میں آچکی ہے اور یہ کہ نسلی مساوات کا حصول ایک یقینی چیز ہے تو وہ کبھی بھی "باغی" نہیں رہیں گے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں برطانوی دستور کے اصول علیٰ حالہ قائم ہیں لیکن جو اشخاص انہیں نظم و نسق میں لانے کے ذمہ دار ہیں، انہوں نے بے انصافی سے کام لیا ہے

اگر میں صحیح طور پر اُن کی اُس وقت کی پوزیشن بیان کر سکتا ہوں تو وہ یہ تھی۔ ہندوستان میں برطانوی نظم و نسق پر اُن کا عقیدہ جاتا رہا تھا وہ ایک شیطانی حکومت بن گئی تھی لیکن برطانوی دستور پر انہیں بدستور یقین تھا۔ وہ ابھی تک یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہندوستان نسلی مساوات کی

بنیاد پر برطانوی کامنویلتھ کے اندر رہ سکتا ہے اور یہ کہ ہندوستانی کشمکش کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ نسلی مساوات کے اصول کی فتح ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو اسی نظریہ کا حامی خیال کرتے تھے اور اسی معنی میں وہ اپنے آپ کو برطانوی دستور کا محافظ خیال کرتے رہے۔ اسی سبب سے انہوں نے بار بار یہ بات ظاہر کی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ برطانوی تعلق کو اب بھی قائم و برقرار رکھنا چاہیئے لیکن شرط صرف اتنی ہے کہ کینیڈا، جنوبی افریقہ اور آئرش فری اسٹیٹ کو جو درجہ نوآبادیات دیا گیا ہے، اُس سے خود ہندوستان کو محروم نہ رکھا جائے

لیکن "نوجوان ہندوستان" کے صبر کا پیمانہ تقریباً لبریز ہو چکا تھا اور آخری آل انڈیا نیشنل کانگریس کے موقع پر مسٹر گاندھی نے سمجھوتہ کی قرار داد کو منظور کر لیا تھا جس میں یہ طے پایا تھا کہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء سے مقاومت مجہول کا آغاز کر دیا جائے اگر برطانوی حکومت اس تاریخ سے پہلے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری عطا نہ کر دے

میں نے اُن الفاظ کو بغور پڑھا ہے جو انہوں نے اپنے مقدمہ کے موقع پر اور دوسرے اہم پبلک مواقع پر اس عظیم الشان مسئلہ کے بارے میں استعمال کئے تھے جس پر تمام امور کا انحصار ہے۔ آن کی خوفناک درشتی کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ حقیقتاً ابھی تک اُس پوزیشن سے نہیں ہٹے ہیں جو انھوں نے اپنی ابتدائی تقریروں میں برطانوی دستور کے نظریہ کے متعلق اختیار کی تھی۔ انہوں نے عمل کے خلاف مسلسل بغاوت کی ہے۔ اور "امرتسر" کیخلاف

اُن کی بغاوت" جبکہ انہیں یہ معلوم ہوا کہ برطانوی نظم ونسق میں اپنے افعال کے بارے توبہ کا کافی احساس پیدا نہیں ہوا، اُن کی سب بغاوتوں سے زیادہ طاقتور تھی

"امرتسر" کے بارے میں یہ جذبہ کس قدر زبردست تھا اس کا اندازہ شاعر رابندرا ناتھ ٹیگور کی تحریرات کے ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے ۱۹۲۰ء میں بمقام بمبئی جبکہ وہ جلسۂ احتجاج میں اپنی علالت کی وجہ سے شرکت کرنے سے معذور تھے، انھوں نے مجھے ایک پیغام دیکر بھیجا تھا کہ میں اُن کی طرف سے اُسے سنا دوں۔ اس میں ذیل کی عبارت تھی جسے میں نے قدرے مختصر کر دیا ہے:۔

پنجاب میں قانون کے نام سے ایک بہت زبردست جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ برائی کے یہ خوفناک مظاہرے اپنے پیچھے ایک ورثہ چھوڑ جاتے ہیں اور وہ مطامحِ نظر کی بربادی ہوتی ہے۔ جو کچھ جلیانوالے باغ میں ہوا، وہ خود ایک ایسی ہیبتناک جنگ کا ایک ہیبتناک نتیجہ تھا جس نے چار برس تک خدائی دنیا کو جسمانی اور مادّی آگ اور زہر سے ناپاک کئے رکھا۔ گناہ کی زیادتی نے اُن لوگوں کے دلوں میں سنگدلی پیدا کر دی ہے جو صاحبِ اختیار ہیں اور وہ اندرونی ہمدردی کی بندش یا بیرونی مقابلہ کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ طاقتوروں کی بزدلی جنھوں نے غیر مسلح اور غیر تنبیہ یافتہ دیہاتیوں پر خوف کی مشینیں استعمال کرے ہیں اور انصاف کے نازیبا تماشہ کے پردہ میں اپنے ہم جنسوں کو بے عزتیوں کا نشانہ بنانے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی، محض اس وجہ سے ظہور میں آئی ہے کہ جنگِ عظمیٰ نے انسان کو اس امر کا موقع بہم پہونچا دیا کہ وہ اپنی

اعلیٰ فطرت کی اہانت کرے، سچائی اور عزت کو اپنے پاؤں تلے روندے، تہذیب کی بنیاد کی بربادی اور بیخ کنی اخلاقی زلزلوں کا لامتناہی سلسلہ پیدا کرتی رہے گی اور ہی نوع انساں کو ابھی مزید تکالیف کا شکار ہونا پڑے گا اس امر کا اندازہ کہ ابھی توازن کے از سرِ نو قیام میں طویل مدت لگے گی، اُس انتقام سے کیا جا سکتا ہے جو منحوس طریقہ سے گفتگوئے مصالحت کے افق کو خون آلود کئے ہوئے ہے

لیکن ہمارے لئے فاتح طاقتوں کی ان بدمستیوں میں جو دنیا کو اپنے اپنے مقاصد کے مطابق ٹکڑوں میں تقسیم کر رہی ہیں، کوئی جگہ نہیں ہے جس چیز سے ہمارا سب سے زیادہ تعلق ہے وہ یہ جاننا ہے کہ اخلاقی پستی نہ صرف یہ کہ بیکسوں پر بے عزتیاں روا رکھنے والے کا پیچھا کرتی ہے بلکہ اُن کا بھی جو ان بے عزتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ظالمانہ بے انصافی کی بزدلی جسے اس بات کا احساس ہے کہ اُسے اپنے کئے کی سزا نہیں ملے گی، سخت مکروہ اور گھناؤنی ہے، لیکن خوف اور نامراد غصہ جو وہ کمزوروں کے دماغوں میں پیدا کر دیتی ہے کچھ کم کمینہ نہیں ہے۔ بھائیو، جب مادی طاقت اپنے مغرورانہ عقیدہ کے سامنے خود انسان کی اسپرٹ کو کچلنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے لئے وہی وقت اس امر کے اظہار کا ہوتا ہے کہ اس کی روح ناقابلِ تسخیر ہے ہمیں اپنے دلوں میں انتقام کے ذلیل جذبات رکھنے سے اپنی اخلاقی شکست کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا چاہئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جو لوگ مفتوح ہوئے ہیں وہ نیکی کے میدان میں فاتح قرار دئے جائیں

جب ایک بھائی دوسرے بھائی کا خون بہاتا ہے اور اپنے گناہ پر فخر کرتا ہے اور اسے ایک اعلیٰ درجہ کا کارنامہ قرار دیتا ہے، جب وہ اپنے غصہ کی یادگار کی حیثیت

سے سرزمین ملک پر خون کے دھبوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے: اُس وقت خود خدا شرم سے انہیں سبز گھاس سے اور اپنے بنائے ہوئے پھولوں کی شیریں پاکیزگی سے ڈھک دیتا ہے ہمیں خدا کے ہاتھ سے سبق لینا چاہیئے خواہ درد اور بے عزتی کی چبھن ابھی تازہ ہی ہو۔ اور وہ سبق یہ ہے کہ حملہ کمینہ پن، ظلم اور جھوٹ قعر گمنامی میں گرنے والی چیزیں ہیں اور صرف شریفانہ اور سچی باتوں کو دوام ہے

اسی اخلاقی جد وجہد کے دوران میں جس کی ابتدا اس قسم کے غصہ سے ہوئی تھی اور جس میں تشدد کو خارج رکھنے کی بار بار اپیلیں کی گئی تھیں، مسٹر گاندھی نے والیسرائے کو اپنی مشہور و معروف چٹھی بھیجی تھی جس نے ہندو اور مسلمانوں میں مقاومت مجہول کی تحریک کا آغاز کر دیا تھا جسے "تحریک عدم تعاون" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "پنجاب" کے مظالم میں حال ہی میں ایک جدید بے انصافی یعنی "خلافت" کی ناانصافی کا اضافہ ہو گیا تھا جسے میں نے اختصار کے ساتھ دوسرے باب میں بیان کر دیا ہے[1]

والیسرائے کے نام جو چٹھی بھیجی گئی تھی، وہ حسب ذیل ہے:-

"میں نہایت رنج والم کے ساتھ قیصر ہند گولڈ میڈل واپس کرتا ہوں جو مجھے جناب والا کے پیشرو نے جنوبی افریقہ میں میری اُن انسانی خدمات کے اعتراف میں عطا فرمایا تھا جو ۱۹۰۶ء میں انڈین والنٹیر ایمبولنس کور کے افسر انچارج کی حیثیت سے انجام دی گئی تھیں اور بوئر وار میڈل کو بھی جو جنگ بوئر (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء) کے دوران میں انڈین والنٹیر اسٹریچر بیئرر کور

[1] دیکھو باب دوم

کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے میری خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا، میں عدم تعاون کی اس اسکیم کی مطابقت میں جو تحریک خلافت کے سلسلہ میں آج سے شروع کی گئی ہے، ان تمغوں کو واپس کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ اعزازات میرے لئے قابل قدر رہ چکے ہیں تاہم میرا ضمیر مجھے اُس وقت تک انہیں پہننے کی اجازت نہیں دے سکتا جب تک کہ میرے مسلم ہموطن اُس بے انصافی کا شکار رہیں گے جو ان کے مذہبی محسوسات کے ساتھ روا رکھی گئی ہے۔ جو واقعات گذشتہ مہینہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں، انہوں نے اس رائے کی تصدیق کر دی ہے کہ امپیریل حکومت نے مسئلہ خلافت میں غیر محتاط، بد اخلاقانہ اور غیر منصفانہ طریقہ سے عمل کیا ہے اور اپنی بد اخلاقی کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے اس نے غلطی در غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسی حکومت کے لئے میں نہ کوئی احترام اور نہ محبت محسوس کر سکتا ہوں

مسئلہ پنجاب پر امپیریل گورنمنٹ اور جناب والا کی حکومت کا طرز عمل ایسا رہا ہے جس نے میرے لئے شدید بے اطمینانی کا مزید سبب بہم پہونچا دیا ہے۔ جیسا کہ جناب والا آگاہ ہیں، مجھے کانگریس کے کمشنروں میں سے ایک کمشنر بننے کی عزت نصیب ہو چکی ہے جو پنجاب میں اپریل ۱۹۱۹ء کے فسادات کے وجوہ کی تحقیقات کرنے پر مامور کئے گئے تھے۔ اور یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ سر مائیکل اوڈوائر[1] پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بننے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اور یہ کہ اُن کی پالیسی ہی امرتسر میں مجمع کو مشتعل کرنے کی حقیقی طور

[1] Sir Michael O'Dwyer. لے

پردہ مہ دارتھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ مجمع کے مظالم ناقابل معافی تھے؛ آتشزدگی، پانچ بے گناہ انگریزوں کا قتل اور مس شیرووڈ پر[1] بزدلانہ حملہ نہایت افسوسناک واقعات تھے اور انہیں کسی نوع حق بجانب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن جنرل ڈائر[2]، کرنیل فرینک جانسن[3]، کرنیل اوبراین[4]، مسٹر باسورتھ اسمتھ[5]، رائے شرمی رام سُد، مسٹر ملک خان اور سب دوسرے افسران نے جو تادیبی کارروائیاں کیں وہ لوگوں کے جرم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں اور وہ سخت بے رحمی اور ظلم کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی موجودہ زمانہ میں تقریباً کوئی مثال نہیں ملے گی۔ جناب والا کا سرکاری جرم کے ساتھ نرم سلوک، جناب والا کا سر مائیکل اوڈوائر کو بری کر دینا، مسٹر مانٹیگو[6] کا مراسلہ اور سب سے بڑھ کر پنجاب کے واقعات کے بارے میں شرمناک لاعلمی اور ہاؤس آف لارڈز کی جانب سے ہندوستانیوں کے محسوسات کے ساتھ بے دردانہ بے رُخی، ان سب باتوں نے سلطنت کے مستقبل کے بارے میں میرے دل میں سخت شبہات پیدا کر دئے ہیں، اور انہوں نے موجودہ حکومت کی طرف سے مجھے بالکل بدظن کر دیا ہے اور میرے لئے اس امر کو ناممکن بنا دیا ہے کہ جو وفادارانہ اشتراک عمل میں پورے دل کے ساتھ پہلے پیش کیا کرتا تھا، اُسے آیندہ پیش کر سکوں

میری عاجزانہ رائے میں درخواستوں، وفدوں اور اسی قسم کی کوششوں کے

---

[1] Miss Sherwood. [2] Gen. Dyer. [3] Col Frank Johnson. [5] Bosworth Smith [4] Col O'Brien [6] Montagu.

ذریعہ جد وجہد کرنے کا معمولی طریقہ ایسی گورنمنٹ کے دل میں توبہ کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جو اپنے باشندوں کی بہبودی سے اس قدر غافل رہی ہو جیسا کہ حکومت ہند رہی ہے۔ یورپین ممالک میں ایسے شدید مظالم کی معافی کا جیسا کہ خلافت اور پنجاب ہیں، نتیجہ خونی انقلاب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے قومی نامردی کا مقابلہ کرتے جو اِن ناانصافیوں کا حقیقی مفہوم ہے۔ لہٰذا میں نے عدم تعاون کا علاج تجویز کیا ہے جو اُن اشخاص کو جو ایسا کرنا چاہتے ہیں، حکومت سے اپنے آپ کو بے تعلق بنانے کے قابل بنا دیتا ہے اور جو بشرطیکہ تشدد عمل میں نہ آئے اور منظم طریقہ سے اُسے اختیار کیا جائے، اسے مجبور کر دیگا کہ وہ اپنے طرز عمل کو بدلے اور ناانصافیوں کی تلافی کرے۔ لیکن جہاں میں عدم تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا رہوں گا اُس حد تک کہ لوگ میرا ساتھ دیں گے، میں یہ امید کبھی منقطع نہ کروں گا کہ جناب والا اب بھی انصاف سے کام لیں گے۔ لہٰذا میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ جناب والا سے درخواست کروں گا کہ جناب والا پبلک کے مسلمہ لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب فرمائیں اور اُن کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ایک ایسی راہ نکالیں جو ایک طرف مسلمانوں کو مطمئن کر دے اور دوسری طرف بدقسمت پنجاب کے ساتھ بھی انصاف کر دے،،

جب یہ اپیل جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، بیکار گئی اور حکومت ہند کے ساتھ عدم تعاون پورے طور پہ قائم ہو گیا، اس وقت مسٹر گاندھی نے مختلف مواقع پر ہندوستان کے مقیم انگریزوں کے نام چٹھیاں

لکھیں جس میں تحریک کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی تھی اور وہ وجوہ بیان کئے گئے تھے کہ کیوں وہ ایک ایسے نظام کے ساتھ جیسے وہ برا سمجھتے ہیں، اشتراک عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ اُن کی پہلی چٹھی درج ذیل کی جاتی ہے :۔

"عزیز دوست۔

میں چاہتا ہوں کہ ہر انگریز میری اس اپیل کو دیکھے اور اس پر تفحص کے ساتھ غور کرے

سب سے پہلے مجھے اپنا تعارف کرنے کی اجازت دیجئے میری عاجزانہ رائے میں کسی ہندوستانی نے برطانوی حکومت کے ساتھ اتنا اشتراک عمل نہیں کیا جتنا میں نے انتیس سالہ بیباک زندگی میں مسلسل طور پر اُن حالات میں کیا ہے جو دوسرے آدمی کو یقیناً باغی بنا دیتے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری بات کو یاد کریں کہ میرا اشتراک عمل اُن سزاؤں کے خوف پر جو آپ کے قوانین میں مقرر ہیں یا کسی دوسرے خود غرضانہ خیالات پر مبنی نہ تھا وہ آزادانہ اور رضاکارانہ تعاون تھا اور اس عقیدہ پر مبنی تھا کہ برطانوی حکومت مجموعی لحاظ سے ہندوستان کے لئے مفید ہے۔ میں نے سلطنت کی خاطر چار مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا : جنگ بوئر میں جبکہ میں ایمبولینس کور کا انچارج تھا جس کام کی جنرل بلر[1] کے مراسلات میں تعریف کی گئی ہے، نیٹال کی زولو بغاوت میں جبکہ میں اسی قسم کے کور کا انچارج تھا اور جنگ عظمیٰ کے چھڑ جانے پر جبکہ میں نے ایمبولینس کور قائم کی اور سخت

---

[1] Gen. Buller

ٹریننگ کی وجہ سے میں مرض ذات الصدر میں مبتلا ہو گیا تھا، اور آخر میں اپنے اس وعدہ کی پابندی میں جو میں نے جنگی کانفرنس منعقدہ دہلی میں لارڈ چیمز فورڈ[1] کے ساتھ کیا تھا، میں نے ضلع کیرا میں بھرتی کا کام ایسے زبردست طریقہ سے کیا کہ مجھے پیچش کا عارضہ ہو گیا جو تقریباً مہلک ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے گذشتہ دسمبر میں اعتماد آمیز تعاون کے لئے درخواست کی۔ مجھے پورا پورا الیقین تھا کہ مسٹر لائڈ جارج[2] مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو پورا کریں گے۔ اور یہ کہ پنجاب میں سرکاری حکام کے مظالم کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، جہاں تک اہل پنجاب کا تعلق ہے اُن کی پوری پوری تلافی کر دیجائیگی لیکن مسٹر لائڈ جارج کی غداری اور آپ لوگوں کی طرف سے اس کی تعریف اور مظالم پنجاب پر چشم پوشی نے حکومت کے اچھے ارادوں اور اس کی تائید کرنے والی قوم کے بارے میں میرے اعتقاد کو متزلزل کر دیا ہے

لیکن اگرچہ آپ کے اچھے ارادوں پر میرا اعتقاد زائل ہو گیا ہے میں آپ کی بہادری کا قائل ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ جو باتیں آپ انصاف اور عقل کے لئے نہیں کریں گے انہیں آپ بہادری کی خاطر بالضرور انجام دینگے

ذرا آپ دیکھئے کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، برطانوی سلطنت اس کے لئے کیا مفہوم رکھتی ہے:۔

(۱) ہندوستان کے ذرائع کو برطانیہ عظمیٰ کے فائدہ کیلئے کام میں لانا

(۲) روز افزوں فوجی مصارف اور ایسی سول سروس کا قیام جو تمام

---

[1] Lord Chelmsford.

[2] Lloyd George.

دنیا میں سب سے زیادہ مہنگی ہے

(۳) ہر محکمہ کا اسراف بلالحاظ اسکے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے

(۴) تمام قوم کا غیر مسلح ہونا اور اس طرح سے لوگوں کو نامرد بنانا مبادا ایک مسلح قوم آپ کی تھوڑی سی زندگیوں کو خطرے میں ڈالدے

(۵) منشی ادویہ اور شرابوں کی تجارت جس کا مقصد ایک ایسے نظام سلطنت کا قیام ہے جو بڑے افسروں کو زیادہ سے زیادہ تنخواہ دے

(۶) تشدد کے قوانین کی تدریجی ترقی تاکہ ایک قوم کی تکالیف کے اظہار کے لئے جو بے چینی بڑھ رہی ہے اسے دبایا جا سکے۔

(۷) برطانوی علاقوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک

(۸) ہمارے جذبات و محسوسات سے بے پروائی جو حکومت پنجاب کی تعریف کر کے اور مسلمانوں کے حسیات کو ٹھکرا کر روا رکھی گئی ہے

میں جانتا ہوں کہ اگر ہم لڑ سکتے اور آپ لوگوں کے ہاتھ سے اختیارات چھین سکتے تو پھر آپ کو کوئی وجہ شکایت نہ ہوتی۔ آپ واقف ہیں کہ ہم اس کام کے لئے مجبور محض ہیں، اس لئے کہ آپ نے میدان جنگ میں اور باعزت لڑائی میں ہماری عدم قابلیت کو متیقن کر دیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے میدان جنگ میں بہادری ناممکن ہے۔ لیکن روح کی بہادری ابھی تک ہمارے سامنے کھلی ہوئی ہے"

اُن کی دوسری چٹھی بھی تقریباً اسی طریقہ سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی ہے جسے دوران تحریک میں بار بار دھرایا

گیاہے اور وہ یہ ہے کہ اگر برطانوی نظامِ سلطنت ہندوستان کے خوفناک افلاس کا وفاداری کے ساتھ تدارک کردے اس طرح سے کہ دیہات میں گھریلو مصنوعات کو نشوونما دے اور شراب اور منشی ادویہ کی تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ترک کردے تو وہ اپنی ذات سے ان دو کارروائیوں کو لعادن کے احیائے ثانی کا ذریعہ خیال کرینگے۔ اس کی دوسری چٹھی حسب ذیل ہے :۔

"عزیز دوست ـــــ

میں اپنی صداقت ثابت نہیں کرسکتا اگر آپ اسے خود محسوس نہیں کرسکتے۔ میرے بعض ہندوستانی دوست مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میرا یہ بیان کہ انگریزی نظامِ سلطنت سے نفرت کرتے وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم انگریزوں سے بھی نفرت رکھیں، ایک دھوکہ ہے۔ میں اُن پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے بھائی کی بدمعاشی سے نفرت رکھے اور ساتھ ہی خود اس کے ساتھ کسی قسم کی نفرت نہ رکھے۔ حضرت عیسیٰ (ع) نے اسکرائبز[1] اور فیریسیز[2] کی بدعنوانیوں کی مذمت کی ہے لیکن انھوں نے خود ان سے اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ انھوں نے صرف اپنے لئے یہ قانونِ محبت نہیں بنایا کہ انسان سے محبت رکھی جائے اور اس کی برائی سے نفرت رکھی جائے بلکہ عالمگیر اطلاق کے لئے انھوں نے ان اصولوں کی تلقین کی تھی۔ بلاشبہ یہی تعلیم

[1] Scribes. وہ علمائے یہود جو مذہبی احکام کی تشریح نہایت تنگ نظری کے ساتھ کرتے تھے۔ مترجم۔ [2] Pharisees. یہودیوں کا ایک فرقہ جو مذہب کی ظاہری پابندی اور نمائش پر زور دیتا تھا۔ مترجم

دنیا کی تمام کتب مقدسہ میں موجود ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں انسانی فطرت کا کم و بیش صحیح طریقہ سے مطالعہ کر سکتا ہوں اور ساتھ ہی اپنے محسوسات کو بھی اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ انسان اس نظام سے بالاتر ہے جس کی تشریح وہ کرتا ہے اور اسی طرح سے میں محسوس کرتا ہوں کہ فرد کی حیثیت سے آپ اس نظام سے کہیں برتر ہیں جسے آپ نے بحیثیت جماعت کے وضع کیا ہے۔ دسویں اپریل کی خوفناک تاریخ کو امرتسر میں میرا ہر ہموطن اس مجمع سے بہتر تھا جس کا وہ ایک فرد تھا۔ بحیثیت انسان کے وہ بینک کے بے گناہ منیجروں کو قتل کرنے سے انکار کر دیتا لیکن اس مجمع میں یہ ایسے آدمی اپنے آپ کو بھول گئے۔ اسی تمثیل کی بنا پر دفتر کا انگریز باہر کے انگریز سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کا ایک انگریز انگلستان کے انگریز سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ہندوستان میں وہ ایک ایسے نظام کا فرد ہے جو اس قدر خراب ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ اس لئے میرے لئے ممکن ہے کہ میں نظام کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کروں بغیر اس کے کہ میں آپ کو بھی برا خیال کروں اور بغیر اس کے کہ میں ہر انگریز کی طرف بدنیتی کو منسوب کروں۔ آپ اس نظام کے اتنے ہی غلام ہیں جتنا کہ ہم ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میری نسبت ایسے ہی خیالات رکھیں اور مجھ سے وہ باتیں منسوب نہ کریں جو آپ کو میری تحریرات میں نہیں ملتیں۔ میں آپ کی خدمت میں اپنا سارا خیال پیش کئے دیتا ہوں جب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ میں اس نظام کو درست کرنے یا ختم کر ڈالنے کے لئے تڑپ رہا ہوں جس نے ہندوستان کو آپ

جیسے مٹھی بھر آدمیوں کے ماتحت کر دیا ہے اور جس کی وجہ سے انگریز یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ صرف قلعوں اور توپوں کے سایہ میں ہی اپنے آپ کو محفوظ پا سکتے ہیں اور یہ چیزیں وہ ہیں جو ہندوستان میں ہر شخص کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ آپ کے لئے اور ہمارے لئے ذلت آفرین نظارہ ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی باہمی بے اعتمادی اور خوف پر مبنی ہے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ یہ صورت حالات مردانگی سے معرا ہے۔ جو نظام ایسی صورت حالات کا ضامن ہو وہ لازمی طور پر شیطانی ہے۔ آپ کو ہندوستان میں اس کے باشندوں کے اہم جزو کی حیثیت سے زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ ہمیشہ ایسے غیر ملکیوں کی حیثیت سے جو اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہوئے ہوں۔ ایک انگریز کی جان کے مقابلہ ایک ہزار ہندوستانیوں کی جان لینا تاریک، مایوسی کا فلسفہ ہے لیکن میری بات کا یقین کیجئے کہ آپ میں سے جو لوگ آج سب سے بڑے مانے جاتے ہیں انہوں نے ۱۹۱۹ء میں اس سرزمین میں اُس کی تلقین کی تھی

میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں آپ کو دعوت دوں کہ آپ ایک ایسے نظام کو تباہ کرنے میں میرے ساتھ شامل ہو جائیں جس نے آپ کو اور ہمیں ذلیل و رسوا کر دیا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ابھی ایسا نہیں کر سکتا ہم نے ابھی تک یہ بات ثابت نہیں کی کہ ہم اُس قربانی کے لئے سنجیدگی، ایثار اور انضباط کا کافی طور پر اظہار کر سکتے ہیں

لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ میں اور شراب نوشی کے خلاف جہاد میں ہمارا ساتھ دیں

لنکاشائر کا کپڑا انگریزی مورخوں کے اقوال کے مطابق زبردستی ہندوستان کے گلے منڈھا گیا ہے اور خود اس کی مصنوعات کو جو دنیا بھر میں مشہور تھیں، دیدہ و دانستہ اور ایک نظام کے ساتھ تباہ و برباد کیا گیا ہے۔ اس لئے ہندوستان آج نہ صرف لنکاشائر کے رحم و کرم پر ہے بلکہ جاپان، فرانس اور امریکہ کے بھی رحم و کرم پر ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ ہندوستان کے لئے اس کا کیا نتیجہ نکل چکا ہے۔ ہم محض کپڑے کے لئے ہر سال کم و بیش ساٹھ کروڑ روپیہ اپنے ملک سے باہر بھیجتے ہیں۔ ہم اپنے کپڑوں کے لئے کافی روئی بوتے ہیں۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ہے کہ روئی ہندوستان کے باہر جائے اور پھر اس کا وہاں کپڑا تیار کرایا جائے۔ اور جہازوں میں لاد کر پھر اسے ہمارے پاس بھیج دیا جائے؟ کیا یہ درست ہے کہ ہندوستان کو ایسی بیچارگی میں مبتلا کر دیا جائے؟

ڈیڑھ سو سال پیشتر ہم اپنا کل کپڑا خود تیار کر لیتے تھے۔ ہماری عورتیں اپنی جھونپڑیوں میں باریک سوت تیار کر لیا کرتی تھیں اور اس طرح سے اپنے خاوندوں کی آمدنیوں میں اضافہ کا باعث ہوتی تھیں۔ دیہات کے جلاہے ہی اس سوت کو کپڑے کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے۔ ہمارے جیسے زراعتی ملک میں یہ عمل قومی بچت کا لازمی ذریعہ تھا۔ اس نے ہمیں اس قابل بنا دیا تھا کہ ہم نہایت قدرتی طریقہ سے اپنی فرصت کے اوقات کو کام میں لائیں۔ آج ہماری عورتیں اپنے ہاتھوں کا ہنر بالکل فراموش کر چکی ہیں اور کروڑہا نفوس کی جبریہ بیکاری نے اس ملک کو غریب تر بنا دیا ہے۔ بہت سے جلاہے بھنگی بن گئے ہیں۔ بعض نے کرایہ کے سپاہیوں کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ صاحب فن جلاہوں کی آدھی ددر ختم ہو گئی ہے

اور بانی آدھے زیادہ باریک ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کے نہ ملنے کی وجہ سے غیر ملکی سوت اپنے ملک میں منگوا کر بُن رہے ہیں

اب شاید آپ سمجھ جائیں گے کہ غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی اہمیت ہندوستان کے لئے کیا ہے۔ یہ سزا کے طور پر رائج نہیں کیا گیا ہے۔ اگر آج حکومت خلافت اور پنجاب کی بے انصافیوں کی تلافی کر دے اور اس پر راضی ہو جائے کہ ہندوستان کو فوری سوراج مل جائے گا تو اس وقت بھی بائیکاٹ کی تحریک جاری رہے گی۔ سوراج سے مراد یہ ہے کہ ایسی ہندوستانی مصنوعات کو جو قوم کی اقتصادی زندگی کے لئے ضروری ہیں قائم و برقرار رکھا جائے اور ایسی درآمدوں کو رد کا جائے جو ایسی زندگی میں مخل ہوں۔ زراعت اور چرخہ قومی جسم کے دو پھیپھڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں ہر ممکن طریقہ سے دق سے محفوظ رکھنا ہے

اس کے لئے کسی مزید انتظار کی ضرورت نہیں۔ غیر ملکی صناعوں اور ہندوستانی درآمد کرنے والوں کے مفاد پر غور کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں بالخصوص جبکہ تمام قوم زراعت سے تعلق رکھنے والے وسیع پیشہ کے فقدان کی وجہ سے بھوکی مر رہی ہو

آپ اس تحریر کے متعلق غلطی سے یہ خیال نہ کریں کہ وہ عام طور پر غیر ملکی مال کو بائیکاٹ کرنے کے لئے جاری کی گئی ہے۔ ہندوستان بین الاقوامی تجارت کے لئے اپنا دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا۔ سوائے کپڑے کے وہ اُن چیزوں کو جو ہندوستان کے باہر اچھی تیار ہو سکتی ہیں، شکر گذاری کے ساتھ قبول کرلیگا

ایسی شرائط پر جو فریقین کے لئے فائدہ بخش ہوں۔ کوئی چیز زبردستی اُس کے گلے نہیں منڈھی جا سکتی۔ لیکن میں مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مجھے بلا شبہ اس امر کی امید ہے کہ انگلستان کے لئے ممکن ہو سکے گا کہ وہ مساوات کے اصول پر ہندوستان کے ساتھ اشتراک عمل کرلے۔ وہ وقت ہو گا کہ تجارتی تعلقات کی چھان بین کی جائے۔ فی الحال تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ میں ہماری امداد کریں

شراب نوشی کے خلاف جو جہاد کیا جا رہا ہے وہ بھی اتنا ہی اہمیت رکھتا ہے۔ شراب کی دوکانیں سوسائٹی کے لئے لعنت ہیں۔ لوگوں میں اس مسئلہ کے متعلق اتنی بیداری کبھی پیدا نہیں ہوئی جتنی آج دکھائی دے رہی ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مسئلہ میں آپ سے زیادہ ہندوستانی وزرا زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر اپنا خیال صاف صاف پیش کردیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں حکومت کے ہر نظام کے ماتحت ترک شراب نوشی پر قوم کی طرف سے اصرار کیا جائے گا۔ آپ قوم کی طرف اپنے اثر کا وزن ڈال کر اس روز افزوں جدوجہد کی نشو و نما میں امداد دے سکتے ہیں"

مسٹر گاندھی نے ملاقات کے ذریعہ جو لبعد کو شائع ہو گئی تھی، تیسری اپیل ذیل کے الفاظ میں کی تھی:-

"انگریزوں کی جانب میرا طرز عمل کامل دوستی اور احترام پر مبنی رہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں اُن کا دوست ہوں اس لئے میری فطرت کے خلاف ہے

کہ میں کسی ایک انسان پر بھی عدم اعتماد کروں یا یہ یقین کروں کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی نجات حاصل کرنے کے ناقابل ہے۔ میں انگریزوں کا احترام کرتا ہوں اس لئے کہ میں ان کی جرأت، ان کی قربانی بالخصوص جبکہ وہ یقین کر لیتے ہیں کہ فلاں کام ان کی بہتری کیلئے ہے، اُن کے اتحاد و اتفاق اور ان کے وسیع نظم و نسق کی قوتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے جو امید اُن سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ زمانۂ قریب میں اپنے قدم پیچھے ہٹائیں گے، غیر منظم اور غیر منضبط اقوام کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کریں گے اور اس امر کا بدیہی ثبوت پیش کریں گے کہ ہندوستانی مستقبل کی برطانوی کامنویلتھ میں برابر کا دوست اور شریک کی حیثیت سے رہیگا

یہ امر کہ آیا یہ امید کبھی پوری بھی ہوگی یا نہیں، بہت بڑی حد تک خود ہمارے طرزِ عمل پر انحصار رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر مجھے انگلستان سے امید ہے اس لئے کہ مجھے ہندوستان سے امید ہے۔ ہم ہمیشہ غیر منظم حالت میں اور نقالی نہیں بنے رہیں گے۔ موجودہ بدانتظامی، بداخلاقی اور فقدانِ ہدایت کی تہ میں مجھے خوش انتظامی، اخلاقی قوت اور ہدایت کارفرما نظر آتی ہے وہ وقت آرہا ہے کہ انگلستان ہندوستان کی دوستی سے خوشی ہوگا۔ اور ہندوستان بڑھے ہوئے ہاتھ کو مسترد کرنے سے نفرت نہیں کریگا محض اس لئے کہ وہ ہاتھ اُس سے بہت کچھ چھین چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس امید کے ثبوت کے طور پر میں کوئی چیز پیش نہیں کرسکتا۔ وہ فنا نہ ہونے والے اعتقاد پر مبنی ہے۔ اور وہ کوئی پختہ اعتقاد نہیں کہلایا جا سکتا جو عام اصطلاح

میں کسی ثبوت کا محتاج ہو"

مسٹر گاندھی نے سب سے آخری اپیل اپنے قید میں جانے سے پیشتر ایک مضمون کے ذریعہ کی تھی جس کا عنوان تھا "کیا میں انگریزوں سے نفرت رکھتا ہوں؟" جس کا جواب انہوں نے زوردار نفی میں دیا تھا۔ وہ مضمون حسب ذیل ہے:۔

"دعا کے ذریعہ حاصل کردہ انضباط کے طویل نصاب کی بدولت میں گذشتہ چالیس سال سے کسی کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ تاہم میں نہایت عاجزی کے ساتھ اسے پیش کر رہا ہوں لیکن میں برائی کو نفرت کی نظر سے دیکھ سکتا ہوں اور دیکھتا بھی ہوں جہاں کہیں وہ پائی جاتی ہے۔ میں اس نظام کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں جسے انگریزوں نے ہندوستان میں قائم کیا ہے۔ میں ہندوستان کی بیرحمانہ لوٹ کھسوٹ کو اسی دلی نفرت سے دیکھتا ہوں جس نفرت سے میں چھوت چھات کو دیکھنے کا عادی ہوں جس کے لئے کروڑہا ہندو ذمہ دار ہیں

لیکن میں ظلم سے حکومت کرنے والے انگریزوں سے نفرت نہیں کرتا بعینہٖ جس طرح سے میں ظلم برپا کرنے والے ہندوؤں کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں تمام محبت آمیز طریقوں سے جنھیں ہم استعمال کر سکتے ہیں انکی اصلاح کروں گا۔ میرا عدم تعاون نفرت کی بجائے محبت پر مبنی ہے۔ میرا ذاتی مذہب مجھے تحکمانہ طریقہ سے منع کرتا ہے کہ میں کسی سے نفرت کروں۔ میں نے اس سادہ مگر شاندار اصول کو اس وقت ایک نصابی کتاب کے ذریعہ سیکھا

تھا جبکہ میری عمر صرف بارہ برس کی تھی اور وہ اعتقاد اب تک مجھ میں موجود ہے۔ وہ روز بروز مضبوط تر ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا میں عاجزی کے ساتھ ہر اُس انگریز کو یقین دلانا چاہتا ہوں جس کے دل میں میری طرف سے غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو کہ میں کبھی بھی کسی انگریز کو نفرت سے دیکھنے کے جرم کا مجرم نہیں بنونگا خواہ مجھے اُن کے خلاف ۱۹۲۱ء والی شدت کے ساتھ ہی کیوں نہ لڑنا پڑے۔ یہ جنگ غیر متشدد انہ ہوگی اور سچائی اور پاکیزگی پر مبنی ہوگی

میری محبت کوئی مخصوص چیز نہیں ہے۔ میں مسلمانوں یا ہندوؤں سے اس لئے محبت نہیں کرسکتا کہ انگریزوں سے نفرت رکھوں کیونکہ اگر میں ہندوؤں یا مسلمانوں سے محبت کروں اس بنا پر کہ اُن کے بعض طریقے مجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں تو میں اُن سے بہت جلد نفرت کرنے لگ جاؤں گا جونہی کہ اُن کے طریقے مجھے ناپسند معلوم ہوں گے جیسا کہ وہ ہر وقت معلوم ہوسکتے ہیں۔ جو محبت اُن لوگوں کی نیکی پر مبنی ہوگی جن سے آپ محبت کرتے ہیں تو وہ خود غرضانہ چیز ہے، برخلاف اس کے سچی محبت ترکِ خودی سکھاتی ہے اور کسی معاوضہ کی طالب نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اسے ہندو دیوی سیتا جی کی محبت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جنھوں نے اس وقت بھی رام سے محبت کی جبکہ انہیں اسے دہکتی آگ میں داخل ہونے کا حکم دیدیا گیا تھا۔ سیتا جی کا کچھ نہیں بگڑا اس لئے کہ وہ جانتی تھیں کہ وہ کیا کررہی ہیں۔ انھوں نے اپنی طاقت کا احساس کرکے نہ کہ اپنی کمزوری کا خیال کرکے قربانی دی۔ محبت دنیا کی طاقتور ترین قوت ہے اور ساتھ ہی وہ نہایت عاجزانہ بھی ہے جس کا تصور دماغوں میں آسکتا ہے۔"

ایک غلط خیال جس نے انگلستان میں بالکل ایک غیر حق بجانب تلخی پیدا کر دی تھی، اس وجہ سے پیدا ہو گیا تھا کہ مسٹر گاندھی نے تحریک عدم تعاون کے شباب پر پرنس آف ویلز کی سرکاری آمد پر حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا جنھیں اُس وقت کے والیسرائے لارڈ ریڈنگ نے ہندوستان آنیکی دعوت دی تھی

ایسے نامسعود زمانہ میں پرنس کو ہندوستان بلانے کا یہ غیر دانشمندانہ قدام بہترین اور عقلمند ترین مشیروں کی رائے کے خلاف کیا گیا تھا۔ لیکن جب وہ عمل میں آگیا، مسٹر گاندھی نے فی الفور بائیکاٹ کی تحریک کر دی۔ اس موقع پر اپنے طرزِ عمل کی جو تشریح انھوں نے پیش کی تھی، اُس کی انگلستان میں بہت کم نشر و اشاعت ہوئی تھی، بہرحال وہ درجِ ذیل کی جاتی ہے:۔

"میں خود شاہزادے کے بائیکاٹ اور اُن کے خیر مقدم کے بائیکاٹ میں ایک زبردست اور بنیادی فرق محسوس کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں ہز رائل ہائینس کا دلی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا بشرطیکہ وہ سرکاری سرپرستی اور حکومتِ حاضرہ کے حفاظت کرنے والے پردوں کے ماتحت نہ آتے۔ آئینی شہنشاہ کا وارثِ تخت و تاج ہونے کی وجہ سے شاہزادہ کی تمام حرکات و سکنات وزرا کے ہاتھ میں رہتی ہیں اور وہی ہدایات بھی جاری کرتے ہیں بلا لحاظ اس کے کہ وہ ہدایات کیسی ہی شائستہ زبان میں کیوں نہ جاری کی جائیں۔ لہٰذا بائیکاٹ کی تجویز کرتے وقت اس کے مجوزوں نے ایک غیر ذمہ دار بیوروکریسی اور ہز مجسٹی ملک معظم کے غیر دیانتدار وزرا کا بائیکاٹ کیا ہے

آپ پنا چت بھی میری اور پٹ بھی میری کی کہاوت پر عمل نہیں کر سکتے۔ یہ سچ

ہے کہ آئینی شہنشاہیت کے ماتحت شہنشاہ کی ذات کو سیاسیات سے الگ رکھا جاتا ہے۔ لیکن آپ شاہزادہ کو ایک سیاسی مشن پر اس غرض سے نہیں بھیج سکتے کہ اس سے سیاسی فوائد حاصل کریں اور ساتھ ہی اُن لوگوں کے خلاف شکایت بھی کریں جو آپ کا کھیل کھیلنا پسند نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان خون کے آنسو بہا رہا ہے، حکومت ہند کو چاہیئے تھا کہ وہ ملک معظم کی حکومت سے کہدیتی کہ یہ موقع شاہزادہ کو بھیجنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ یہ امر کہ آپ شاہزادہ کو لائیں اور اس کی وجہ سے ایسی حکومت کے لئے اعزازات حاصل کریں جو بے عزتی کے ساتھ برخواست کردئے جانے کی مستحق ہے موئے پر سو درّے کے مترادف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان اس وقت اتنے گہرے سوگ میں مبتلا ہے کہ وہ ہز رائل ہائینس کے خیر مقدم میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا اور یہ بات کہتے وقت میں اپنی وفاداری ثابت کر رہا ہوں، اور یہ کہ وزرا اور حکومتِ ہند دونوں درحقیقت شاہزادہ کو اپنے گہرے سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے میں عدم وفاداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر وہ اصرار کریں گے تو اس وقت ہندوستان کا کھلا فرض ہوگا کہ وہ اُن کی آمد سے کوئی تعلق نہ رکھے"

خواہ انگریز پرنس کی آمد کے بارے میں مسٹر گاندھی کے اختیار کردہ طرزِ عمل کے قرینِ مصلحت ہونے کے متعلق شک رکھیں، تاہم کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے نہایت سچائی کے ساتھ اپنا پہلو پیش کر دیا ہے اور اتنا زمانہ گذر جانے کے باوجود بھی بہت کم انگریز اُن کے طرزِ عمل پر غصہ کا اظہار کرینگے

جبکہ نیت کا اظہار ایک ایسے شخص کی جانب سے کر دیا گیا ہے جس کی سچائی پر کسی کو کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا

مسٹر گاندھی انگلستان اور جنوبی افریقہ دونوں مقامات میں انگریزوں کے ساتھ تقریباً تیس برس تک زندگی بسر کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ان کا کچھ عرصہ ان کا ساتھ رہ چکا ہے۔ انگریزوں نے ہمیشہ ان کا احترام کیا ہے اور انھوں نے بھی ہمیشہ انگریزوں کا ادب ملحوظ رکھا ہے۔ باہمی احترام کی وجہ سے دوستی گہری ہوتی گئی ہے جو ترقی کرتے کرتے اب اُن کی زندگی کا جزو بن گئی ہے۔ اس طریقے سے وہ انگریزی سیرت کے بالکل دوستانہ اور ہمدردانہ جج بن گئے ہیں اور انفرادی حیثیت سے انھوں نے مختلف انگریزوں کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، وہ شاذ و نادر ہی غلط ثابت ہوئی ہے۔ وہ عجب دل پسند طریقہ سے لوگوں کو اپنا عمر بھر کا دوست بنا لیتے ہیں اور وہ ہمیشہ وفادار اور مخلص ثابت ہوئے ہیں وہ اپنے طریقوں اور زندگی کی عادات میں قدرت کے بنائے ہوئے شریف آدمی کی حیثیت سے کبھی کوئی ایسی بات کہہ کر یا کوئی ایسا کام کر کے جو مذاق سلیم پر گران گذرے، کسی کے دل کو دکھانا نہیں چاہتے۔ اوسط درجہ کے انگریز کا مطمح نظر جس میں باشندۂ جزیرہ ہونے کے زبردست احساس کو بھی دخل ہے، بسا اوقات انہیں بھدا معلوم ہوگا، لیکن وہ اپنی خوش مزاجی کی بدولت ہر بات کو جو کہی جائے اور ہر فعل کو جو کیا جائے، برداشت کر لیتے ہیں، بالخصوص جبکہ بد تمیزی بد مذاقی کا نتیجہ ہو۔ وہ کارڈینل نیومین[1] کے الفاظ میں اپنے کیریکٹر کو قائم رکھتے ہیں: "وہ بھی

[1] Cardinal Newman

دوجہ ہے کہ یہ کہنا کہ وہ ایسا شخص ہے جو کسی کو تکلیف نہیں پہونچاتا ایک شریف
آدمی کی تقریباً تعریف ہے" کیونکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل میں بھی اُن کا
اخلاق نہ صرف شریفانہ ہوتا ہے بلکہ ہمہ گیر بھی ہوتا ہے
ایک بات تو اُن کی بالکل یقینی ہے اور انھوں نے مجھ سے متعدد بار
اُس کا تذکرہ کیا بھی ہے مگر نہایت ہی دوستانہ انداز میں۔ اُنھوں نے ایک
مرتبہ مجھ سے فرمایا: "ایک انگریز کبھی آپکا احترام نہیں کریگا جب تک کہ آپ اُس
اُسکے بالمقابل کھڑے نہ ہو جائیں گے۔ پھر وہ آپ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ کسی
مادی قوت سے نہیں ڈرتا لیکن وہ اخلاقی لحاظ اپنے ضمیر سے بہت خوف کھاتا ہے
بشرطیکہ آپ اس سے اپیل کریں اور اسے بتادیں کہ وہ غلطی پر ہے۔ وہ ابتدا ابتدا
میں اپنی غلطی پر جبر کی کھانا پسند نہیں کرتا، مگر وہ اُسپر غور کریگا اور وہ اُس پر
قبضہ کریگی اور اُسے اُسوقت تک تکلیف دیئے جائیگی جبتک کہ وہ اُسکی تلافی نکردیگا"
اس طرح سے معلوم ہو جائیگا کہ کسی تحریک ستیا گرہ میں آخری کامیابی ضمیر
سے ایسی اپیل کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر اوسط درجہ کا انگریز ایسی اپیل کے سننے
کا روادار نہ ہو تو ممکن ہے کہ تحریک ستیا گرہ کا سارے کا سارا پروگرام تبدیل
ہو جائے اور اخلاقی حملہ دوسرے نقطۂ نظر سے کیا جائے
یہ بات ہر اُس شخص پر واضح ہو جانی چاہیئے جس کسی نے مسٹر گاندھی کی مختلف
تحریکوں کے ریکارڈ کا مطالعہ کیا ہے کہ انگریز کی اخلاقی حس سے اپیل کرنے کے
بات کے بارے میں جو رائے انہوں نے قائم کی ہے وہ بالکل حیرت انگیز طریقے
سے صحیح ہوتی ہے۔ تقریباً ہر مثال میں جہاں کہیں اخلاقی مقصد منصفانہ تھا اور

جہاں کہیں تشدد واقع نہیں ہوا، فتح انہیں کی رہی ہے۔ غالباً کوئی شخص اپنی
زندگی میں سچائی اور انصاف کی خاطر اتنی زبردست فتوحات کا تصور نہیں
کرسکتا ہے جتنا وہ آج کرسکتا ہے۔ وہ اس صورتِ حالات کیلئے بھی خود انگریز
ہی کو موردِ تحسین و ستائش قرار دیتے ہیں۔ یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ کیا وہ تکلیفیں
اور ذلتیں جو خود انہوں نے برداشت کی ہیں، بسبب باربار کی ناکامی کے جو
اُنکے متبعین نے غیر متشدد رہنے میں ظاہر کی ہے، انہیں واقفکار انگریز مردوں
اور عورتوں کی نظروں میں کسی ظاہری کامیابی کے مقابلہ میں عزیز تر بنانے میں
موثر اور کارگر نہیں ہوئیں؟ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے جبکہ میں انگلستان میں
اُن کے اور اُن کی شخصیت کے متعلق لکچر دیرہا تھا
وقت آگیا ہے کہ اِس امر پر نہایت تفحص کیساتھ غور کیا جائے کہ آیا اُن
تمام واقعات کی روشنی میں جو حال میں وقوع پذیر ہوئے ہیں، مہاتما گاندھی سے خود
اُنکی قائم کردہ اخلاقی بنیادوں پر چلنے کے لئے مزید کام کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ بار
بار وہ اعادہ کرچکے ہیں کہ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں غریب دیہاتیوں کی
ترقی کے کام کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لیلے، اس طرح سے کہ ایک
طرف شراب اور منشیات کی ممانعت کردے اور دوسری طرف تحریکِ کھدر کو
ترقی دے تو وہ تعاون کے مسئلہ پر از سرِنو غور کرسکیں گے۔ ایسے پیشکش کی موجودگی
میں اُن کے ساتھ تصفیہ کرلینا ناممکن نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ از ابتدا
تا انتہا یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے دل پر غربا کا بوجھ اٹھائے
ہوئے ہیں

باب پانزدہم

"سنتری اعظم"

راولٹ ایکٹ کے نفاذ کے بعد ۱۹۱۹ء میں تحریک ستیاگرہ جاری کرنا اور پھر تشدد کا آغاز ہو جانے پر اُسے شریفانہ طور پر واپس لے لینا ایسے افعال ہیں جن پر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی شانتی نکیتن سے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ خود بھی اسی اندرونی کشمکش میں مبتلا تھے اور عہد مارشل لا کے واقعات کی خبروں نے جو پنجاب سے چھن چھن کر آتی تھیں اور جنھوں نے امرتسر میں اپنی انتہائی خوفناک صورت اختیار کر لی تھی انہیں بےحد مغموم کر دیا تھا انتہائی غم و غصہ کے عالم میں جس سے اُن کی زخمی روح کو قدرے تسکین ہو گئی تھی، شاعر نے اپنے خطاب نائٹ ہڈ کو واپس کر دیا تھا اور وائسرائے کو ایک قابلِ یادگار خط روانہ کیا تھا جس میں اُن وجوہ کی تشریح کر دی تھی جن کی بنا پر انھوں نے ایسی کارروائی کی۔ یہ تھا اُن کا ذاتی عدمِ تعاون ایک ایسی حکومت کے ساتھ جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ اُس نے ناقابلِ معافی مظالم روا رکھے ہیں۔ شاعر کے اس طرزِ عمل کی خبر تمام دنیا میں پھیل گئی اور اُس نے صورتِ حالات کو ایسے طریقہ سے صاف کر دیا جو اُس نازک موقع پر کسی اور طرح ممکن نہ تھا۔ اس لئے کہ ہندوستان کے باہر بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ

مارشل لا کے پردے میں کیا کیا کارروائیاں عمل میں آ رہی ہیں اور ان واقعات نے اور زیادہ صدمہ پہونچایا جب جنرل ڈائر نے کمیشن کے روبرو گواہی دی اور امرتسر میں اپنے افعال کی یہ کہہ کر مدافعت کی کہ اس کا منشا پنجاب میں "اخلاقی اثر" پیدا کرنا تھا

یہاں تک تو ان دونوں روحانی لیڈروں میں کوئی فرق نہ تھا۔ گاندھی کی اس شریفانہ اپیل سے کہ حیوانی قوت کا مقابلہ روحانی قوت سے کیا جائے ٹیگور نے پورا پورا اتفاق کیا۔ شانتی نکیتن میں میرے ابتدائی زمانہ قیام میں جبکہ میں مسٹر ڈبلیو، ڈبلیو پیئرسن کی معیت میں جنوبی افریقہ کی تحریک ستیاگرہ میں امداد دینے کی غرض سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت شاعر کی دعائیں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ اس طرح سے انھوں نے اپنی گوشہ نشینی کے باوجود تحریک میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔ بلا شبہ ایک مسئلہ پر شاعر نے ۱۹۱۸ء میں مہاتما گاندھی سے اختلاف رائے کیا تھا وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مسٹر گاندھی جنگ عظمیٰ میں ضلع کیرا میں رنگروٹ بھرتی کرائیں اس لئے کہ موخر الذکر صرف متشددانہ ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے میں مسٹر گاندھی اپنے اصولوں کو قربان کر رہے ہیں۔ خواہ دوسرے لوگ کچھ ہی کہیں، شاعر اس امر کو ایک غلطی خیال کرتے تھے کہ وہ اس طریقہ سے جنگی مقاصد کے لئے بھرتی کرائیں لیکن بہ حیثیت روحی طاقت کے علمبردار ہونے کے وہ ان کی سیرت کے اس قدر معترف تھے کہ ۱۹۱۹ء میں نیز ۱۹۲۰ء میں جب انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی پیروی کریں اور اپنی قسمت کو انکے ساتھ وابستہ کردیں

بشرطیکہ انہیں ایسا کرنے کی اجازت مل جائے۔ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے عیر ملک سے بھیجا تھا، وہ اس بات کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں کرتے ہیں اور شاعر کی بے خوف افتادِ طبع کی وجہ سے جس کا اظہار اُس وقت ہو گیا تھا جبکہ انھوں نے خطاب "نائٹ ہڈ" واپس کر دیا تھا، نیز دوسرے مواقع پر ایسا پیشکش نہایت معنی خیز تھا

اپریل ۱۹۱۹ء میں تحریکِ ستیاگرہ کے آغاز میں شاعر نے مہاتما گاندھی کے نام ایک خط بھیجا تھا جس سے خود شاعر کی پوزیشن کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ روحانی قوت کے اصول سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور نیز اس طریقہ سے جس کے مطابق مہاتما گاندھی جیسی زبردست اخلاقی طاقت اسے چلا رہی تھی۔ خط میں ذیل کی عبارتیں بھی درج تھیں:۔

طاقت اپنی تمام شکلوں میں عقل کے خلاف ہے، اُس کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جس کی آنکھوں پر گاڑی کھینچتے وقت پٹی بندھی ہو۔ اُس کا اخلاقی عنصر صرف اُس آدمی میں موجود ہوتا ہے جو گھوڑے کو چلا رہا ہے۔ منفعانہ مجہول وہ طاقت ہے جس کا بجائے خود اخلاقی ہونا ضروری نہیں۔ وہ سچائی کے لئے اور اس کے خلاف بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ قوت میں جو بنیادی خطرہ پنہاں ہے وہ اُس وقت زیادہ طاقتور بن جاتا ہے جبکہ اُس کی کامیابی کا امکان ہو، اس لئے کہ پھر وہ لالچ بن جاتا ہے

میں واقف ہوں کہ آپ کی تعلیم یہ ہے کہ نیکی کی مدد سے بدی کے خلاف جنگ کی جائے، لیکن ایسی جنگ بہادروں کے لئے ہوتی ہے نہ کہ معمولی انسانوں کے لئے

جو وراً جذبات سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ایک فریق کی بدی قدرتاً دوسرے فریق کے دلمیں بدی پیدا کردیتی ہے، ناانصافی تشدد کا باعث ہو جاتی ہے اور بے عزتی انتقام کا جذبہ پیدا کردیتی ہے

اس نازک موقع پر آپ انسانوں کے ایک بڑے لیڈر ہونے کی حیثیت سے ہم جلوہ گر ہوئے ہیں تاکہ اُس مطمح نظر کے متعلق آپ اپنے عقیدہ کا پرچار کریں جو جیسا کہ آپ واقف ہیں سارے ہندوستان کا مطمح نظر ہے جو پوشیدہ انتقام کی کمزوری اور خوفزدہ اشخاص کی بزدلانہ اطاعت ہر دو کے خلاف ہے۔ آپ نے اسی اصول کی تلقین کی ہے کہ جس کی مہاتما بدھ نے اپنے زمانہ کے لئے اور آنے والے زمانہ کے لئے کی تھی؛

"غصہ کو حلم کی طاقت سے اور بدی کو نیکی کی طاقت سے فتح کرو"

ہمیں جاننا چاہیئے کہ اخلاقی فتح کامیابی پر اصرار نہیں کرتی، یہ کہ ناکامی خود اس کی اپنی شان وشوکت اور فاعلیت سے اُس کو محروم نہیں کرتی۔ جو لوگ روحانی زندگی پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی برائی کا مقابلہ کرنا جو اپنی پشت پر زبردست مادّی طاقت رکھتی ہو، بدیہی شکست کی حالت میں بھی مطمح نظر کے عملی عقیدہ کی فتح کی ضمانت ہے

میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے اور ہمیشہ ہی کہا ہے کہ آزادی کا عظیم الشان تحفہ خیرات کے طور پر کسی قوم کو نہیں مل سکتا۔ اُس پر قبضہ رکھنے کی غرض سے ہمیں اُسے جیتنا چاہئے اور اسے جیتنے کا موقع ہندوستان کو اُس وقت ملے گا جبکہ وہ ثابت کردیگا کہ وہ اُس قوم سے اخلاقی لحاظ سے ارفع ہے جو اس پر فتح کے حق کی وجہ سے

حکومت کر رہی ہے۔ اسے خوشی خوشی تکلیف کا کفارہ ادا کرنا چاہئے۔ جو بڑوں کے لئے تاج کا درجہ رکھتا ہے۔ نیکی پر اپنے کامل عقیدہ سے مسلح ہو کر اُسے اس جہالت کے سامنے بغیر شرم محسوس کئے کھڑا ہو جانا چاہئے جو روح کی طاقت کا مذاق اڑاتی ہے

اور آپ اپنے وطن مالوف کو ایسے زمانہ میں واپس آرہے ہیں جبکہ اسے آپ کی ضرورت ہے تاکہ آپ اسے اس کا مشن یاد دلائیں، اسے صحیح کے سچے راستہ پر گامزن رکھیں موجودہ زمانہ کی سیاست کو اُس کمزوری سے پاک وصاف کر دیں جو یہ خیال کر رہی ہے کہ اُس نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے جب وہ چالبازانہ بددیانتی کے مانگے ہوئے پروں کے ساتھ حرکت پھرتی ہے

یہی سبب ہے کہ میں خلوصِ دل کے ساتھ دعاگو ہوں کہ کوئی ایسی چیز ہماری ذہنی ہوئی صف میں داخل نہ ہونے پائے جو ہماری روحانی آزادی کو کمزور کرنے والی ہو، یہ کہ سچائی کی خاطر جو شہادت حاصل کی جائے وہ محض ظاہری شکلوں والے تعصب میں منتقل نہ ہو جائے اور پھر وہ خود دھوکہ کی ایسی چیز نہ بن جائے مقدس ناموں کے پردہ میں اپنے آپ کو چھپا لیتی ہے

شاعر نے اس خط کے ہمراہ اپنی دو بنگالی نظمیں بھی ارسال فرمائی تھیں جن کا ترجمہ بھی خود انھوں نے بھیجدیا تھا:۔

مجھے اس عقیدہ میں اپنا سر بلند رکھنے دے کہ تو ہماری پناہ ہے، یہ کہ تمام ن کے معنی یہ ہیں کہ تیری طرف سے کمبخت بے اعتمادی پیدا ہو گئی ہے

آدمی کا خوف؟ لیکن اے بادشاہوں کے بادشاہ! اس دنیا میں کونسا ہے، کونسا بادشاہ ہے، جو تیرا مدِّ مقابل ہو سکتا ہے جس کے ید قدرت میں

میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہایت سچائی کے ساتھ گرفتار ہوں؟
دنیا کی کونسی ایسی طاقت ہے جو مجھے آزادی سے محروم کر سکتی ہے؟ کیا تیرے ہاتھ قید خانہ کی دیواروں میں سے قیدی تک نہیں پہونچتے اور روح کو مکمل آزادی نہیں دلا سکتے؟
اور کیا موت کے ڈر سے میں اس جسم کے ساتھ چمٹا رہوں جس طرح سے کہ ایک کنجوس اپنی بیکار دولت سے چمٹا رہتا ہے؟ کیا میری اس روح کو دائمی بلاوا نہیں آیا ہے تاکہ وہ دائمی زندگی کی دعوت میں شریک ہو؟
میں جانتا ہوں کہ تمام دکھ درد اور موت موقتی سایے ہیں، یہ کہ وہ تاریک قوت جو میرے اور تیری سچائی کے درمیان حائل ہے اس کہر کی مانند ہے جو طلوع صبح سے قبل پائی جاتی ہے۔ تو ہی ہمیشہ کے لئے میرا ہے اور تو طاقت کے جملہ غرور سے برتر ہے جو اپنی قوت سے میری مردانگی کا مذاق اڑانے کی جرأت کرتی ہے

میری دعا ہے کہ تو مجھے محبت کی اعلیٰ طاقت عطا فرما، تیری مرضی کے مطابق بولنے کی طاقت، عمل کرنے کی طاقت اور مصائب برداشت کرنے کی طاقت اور سب کو ترک کر دینے کی طاقت یا الگ تھلگ رہنے کی طاقت عطا فرما
میری دعا ہے کہ تو مجھے محبت کا اعلیٰ اعتقاد عطا فرما، موت میں زندگی کا اعتقاد، شکست میں فتح کا اعتقاد، خوبصورتی کی نزاکت کی پوشیدہ طاقت کا اعتقاد، تکلیف کی عظمت کا اعتقاد جو ضربات تو سہ لیتی ہے لیکن ان

بدلہ لینے سے متنفر رہتی ہے

۱۹۲۰ء کے آخر میں اور ۱۹۲۱ء کی ابتدا میں رابندرا ناتھ ٹیگور ایک ضروری کام کے سلسلہ میں یورپ اور امریکہ گئے ہوئے تھے، اور اس لئے وہ تحریک عدم تعاون کی ابتدا میں بنفس نفیس موجود نہ رہ سکے وہ بچشم خود اس امر کا مشاہدہ نہیں کر سکے (جیسا کہ میں کر سکا) کہ کس حیرت انگیز طریقہ سے مردوں اور عورتوں کے عظیم الشان مجمع نے (اور یہ وہ لوگ تھے جو غیر تربیت یافتہ تھے اور ضابطہ یا سخت ٹریننگ سے بالکل ناواقف تھے) تحریک ستیاگرہ کے اخلاقیات کو فطری طور پر مہاتما گاندھی سے سیکھا اور ابتدا ابتدا میں کسی قسم کا تشدد کئے بغیر خوشی کے ساتھ قید میں جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ افسران بالا دست نے تحریک کی ابتدائی منازل میں ایک حد تک نرمی اور مروت سے کام لیا۔ اگرچہ عورتوں نے بھی اپنے آپ کو قید کئے جانے کے لئے پیش کیا اور انہیں گرفتار بھی کر لیا گیا لیکن درحقیقت بہت کم عورتوں کو قید و بند کی تکالیف بھگتنی پڑیں لیکن مردوں اور نوعمر اشخاص میں قیدیوں کی تعداد بہت جلد ہزار ہا تک پہونچ گئی اور سرکاری قوت کے حیوانی عملدرآمد نے بہت جلد اپنا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اُن ایام کی بہادری بالخصوص طبقۂ طلبا کی بہادری کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی اور جن لوگوں نے اس کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے وہ اُسے کبھی نہیں بھولیں گے

اس کے بعد عامۃ الناس کی طرف تحریک میں تشدد کی روح داخل ہونی شروع ہو گئی، اور اس کے ساتھ ہی اُن لوگوں کے خلاف بھی تشدد

بڑھنے لگا جنھوں نے تحریک میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اُن میں سے بعض کے خلاف معاشرتی ظلم کی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ جوں جوں تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے والوں کی تعداد بڑھتی گئی، جوش و خروش میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کے جس حصہ پر اس کا اثر ہوا وہاں یہ جوش جملہ حدود سے آگے بڑھ گیا اور مشرقی بنگال میں تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کے اثرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں نیپال میں ۱۹۱۲-۱۳ء کی تحریک ستیاگرہ میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تھا، لیکن مجھے یہ نظارہ کلیتاً نیا اور کم روحانی معلوم ہوا

تحریک عدم تعاون کے شباب پر جب شاعر یورپ سے واپس ہوئے اور انھوں نے اپنے صوبہ (بنگال) کے باشندوں پر اس کا اثر دیکھا تو ہندوستان کے اس خطہ میں جو کچھ انہوں نے مشاہدہ کیا، اس سے انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ عام لوگوں کا طرزِ عمل گہرے اخلاقی عقیدہ کی بجائے اپنے اندر محض وحشیانہ قسم کا جوش و خروش رکھتا ہے۔ انھوں نے اس خیال کو جس طرح سے ادا کیا وہ یہ تھا کہ "وہ تو شور و شغب تھا، گانا نہیں تھا"۔ بنگال میں جو بات انہیں اور زیادہ واضح طریقہ سے معلوم ہوئی، یہ تھی کہ روحانی لیڈری محض اندھی تقلید ہو کر رہ گئی تھی۔ دبے ہوئے جذبات کو زوردار طریقہ سے ظاہر کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قول و فعل میں تشدد پیدا ہو گیا بجائے اس کے کہ صبر آمیز روحی قوت میں تبدیج طاقت پیدا ہوتی اس طرح سے کہ ایک بھی ضرب پہونچائے بغیر جذبات کو

خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جاتا جس کے بارے میں انھوں نے جنوبی افریقہ سے ہماری واپسی پر ہم سے اتنی مرتبہ واقعات سنے تھے

ایک دوسرا اختلاف جو وقت گذرنے پر زیادہ اہم ہوگیا، شاعر کا مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک کھدر میں حصہ لینے سے اظہار معذوری تھا اس لئے کہ اُسے ہندوستان کے افلاس کے عام علاج کے طور پر پیش کیا گیا تھا حالانکہ شاعر اسے صرف امداد رسانی کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔ وہ محض کھدر کی ساخت پر مہاتما گاندھی کے پورے اصرار کو نہیں سمجھ سکے گویا کہ باقی سب باتیں غیر ضروری تھیں

آرا کے یہ اختلافات حقیقی تھے اور جب کبھی کوئی موقع ملا، ان دونوں دوستوں نے طول و طویل مباحثے کئے جن میں مجھے بھی حاضری کا فخر حاصل ہوچکا ہے۔ ان میں سے ہر موقع پر جو بات مجھے بدیہی طور پر معلوم ہوئی وہ مزاج کا باہمی اختلاف تھا جو اس قدر شدید تھا کہ کسی ذہنی سمجھوتہ پر پہونچنا اُن کے لئے مشکل ہوگیا اگرچہ دوستی کی اخلاقی بندھنیں جوں کی توں قائم و برقرار رہیں۔ مجھے دوبارہ بیان کرنے کی اجازت دیجئے کہ روحانی طاقت پر شاعر کا عقیدہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس کا رنگ اُن کی تمام نظموں میں اور انسانی زندگی کے بارے میں ان کے تمام خیالات میں جلوہ گر ہے لیکن جب کبھی اُن کو عام طریقے اعلیٰ معیار سے گرے ہوئے معلوم ہوئے، وہ رنجیدہ ہوتے اور فی الفور اپنے خیالات کو تحریر کا جامہ پہنا دیتے۔ مہاتما گاندھی نے جو انہیں "دو سنتری اعظم" کا لقب دیا

ہے، وہ درحقیقت نہایت زبردست خطاب ہے جس نے اِس نازک دور میں اُن کی اصلی پوزیشن کو ایک قابلِ تعریف اور پسندیدہ جملہ میں ہمیشہ کے لیے بیان کر دیا ہے

کچھ دنوں بعد ایک ایسا وقت آیا جبکہ میں خود بھی اپنی مرضی کیخلاف متشددانہ کارروائیوں کے بارے میں اُسی مبحث میں اُلجھ گیا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی بہت دور آگے نکل گئے ہیں اور "واقعتاً آگ کے ساتھ کھیل رہے ہیں" جبکہ خود انھوں نے غیر ملکی کپڑوں کی ہولی میں رہنمائی کرنی شروع کردی تھی۔ اُس وقت مجھے یہ صرف معلوم ہوا کہ اسمیں کسی حد تک قومی منافرت داخل ہوگئی ہے جو خود اُن کی پاکیزہ فطرت کے خلاف ہے، بلکہ یہ بھی کہ لازمی طور پر اس کا نتیجہ مزید تشدد کی صورت میں نکلے گا۔ میں نے اپنا فرضِ منصبی محسوس کیا کہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں

لہٰذا جوں جوں تحریکِ عدمِ تعاون ترقی پاتی گئی اُسکے بنیادی نقائص زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ اس کی ہر دلعزیزی ہی اس کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ خود مہاتما گاندھی نے خطرات کو بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے بار بار تنبیہیں کیں لیکن معاملہ حد سے آگے بڑھ چکا تھا۔ جوش اور ہیجان کا اثر بہت دور تک جا پہونچا تھا۔ ہندوستان کے عامۃ النّاس کے دلوں میں ان کی طاقت کا احساس بیدار ہو چکا تھا لیکن ابھی انہیں اتنی روحانی تربیت حاصل نہ ہوئی تھی کہ وہ اُس طاقت کو قابو

میں رکھنا سیکھ جاتے۔ خود اُن کی شخصیت کے سوائے جو اپنی اندرونی صفات میں نہایت زبردست تھی، اور کوئی قوت ایسی نہ تھی جو عام تشددوں کے دماغوں پر مقناطیسی دباؤ رکھ سکتی ہے ایسی حالت میں جبکہ آتش گیر آزادی کے اس نئے حصول کا احساس فوری طریقہ سے ہو چکا ہو وہ خود ایک مدت تک حیرت انگیز طور پر تشدد کو پاس تک پھٹکنے نہ دینے میں کامیاب رہے۔ اپنے رفقا کے ساتھ انھوں نے غیر معمولی انسانی طاقت سے کام کیا تاکہ نگرانی قائم رہے لیکن اُس دور کا ہیجان انگیز جوش اور روزانہ کام کی زیادتی کے زبردست دباؤ نے خود لیڈروں کو اس رفتار سے ناواقف رکھا جس پر دھارا اُن کی قومی سعی کی کمزور کشتی کو تیز رفتاری کے ساتھ بہائے لئے جا رہی تھی۔ دو تین دفعہ زبردست تنبیہیں ملیں اور اس کے بعد بمبئی میں شکست کی آواز سنائی دی جبکہ شہر میں کئی دن تک تشدد کا عمل دخل رہا باوجود اس کے کہ اُس کی روک تھام کی بہادرانہ مساعی عمل میں لائی گئیں

اِن تمام آخری ہیجان انگیز ایام میں مجھے ہندوستان سے باہر کینیا اور جنوبی افریقہ میں طلب کر لیا گیا تھا اور میری واپسی فسادات بمبئی کے بعد ہوئی جبکہ حالات میں ابتری واقع ہو چکی تھی۔ مہاتما گاندھی نفس کشی اور تزکیۂ خودی کے مرحلہ سے گذر چکے تھے، لیکن وہ بہت کمزور اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور انہیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کے منہ سے نکل کر آئے ہیں۔ اگر اس موقع پر وہ انتقال

کرجاتے تو یقیناً وہ اُسے اپنے لئے رہائی خیال کرتے لیکن یہ مقدر میں نہ تھا۔[1] مابعد کے مہینوں میں ان کی کوششیں صرف عدم تعاون کی فضا میں عدم تشدد پیدا کرنے میں مسلسل طریقہ سے صرف ہوئیں۔ وہ دن کا وقت تھکا دینے والی جدوجہد میں صرف کرتے اور رات کا وقت جاگنے اور دعائیں مانگنے میں کاٹتے۔ صرف بہترین آب دار فولاد کی روح ہی تحمل اور بُردباری اور صبر آزمائی کی ایسی شدید آزمائش کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کے بعد چوری چورا میں تشدد کا دوسرا منظاہرہ ہوا آنے والے باب میں ان واقعات کا دردناک حال خود ان کے قلم کا لکھا ہوا درج کردیا گیا ہے

ظاہری ناکامی کی اُس ساعت میں مہاتما گاندھی اپنی بلندترین روحانی بلندی پر پہونچ گئے۔ جس پر وہ اپنی تمام زندگی میں کبھی نہیں پہونچے تھے۔ ایک عظیم الشان کوشش کے ساتھ ایسی حالت میں جبکہ خود اُن کے متبعین غصہ والی آوازیں اور تلخ الفاظ ادا کر رہے تھے، انھوں نے تحریک کا خاتمہ کردیا۔ انھوں نے ابتدائی منازل میں اعلان کردیا تھا کہ تحریک کا امتیازی پہلو اس کا عدم تشدد ہے اور وہ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ سیاسی طور پر اس کا نتیجہ تباہ کن ناکامی کی شکل میں نکلا۔ اخلاقی طور پر وہ سب سے عظیم الشان فتح تھی جو انہیں نصیب ہوئی اور وہ روح کی فتح تھی

---

[1] دیکھو ضمیمہ ہشتم

اس اخلاقی فیصلہ کے مختلف پہلو صاف طور پر نظر آسکتے ہیں شاعر کے اور میرے اعتراضات کا جو جواب آگے چل کر دیا گیا ہے، وہ نہایت ہی شریفانہ اپیل ہے۔ ہندوستان کے بیشمار غریب آدمیوں کی روحوں کی درد بھری چیخ، اُن کی نہ کم ہونے والی مصیبت اور شدید افلاس کی حالت اس کے ہر ہر لفظ سے عیاں ہے

مالبعد کے باب میں جس کا تعلق ان کے مقدمہ اور قید سے ہے، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ غریب آدمیوں کی یہ چیخ پنجاب اور خلافت کی ناانصافیوں کے مقابلہ میں اُن کے کانوں میں زیادہ زور کے ساتھ گونج رہی ہے۔ یہ دونوں بتدریج پس پشت ڈال دی گئی ہیں۔ نظام حکومت کے خلاف جو الزام انھوں نے عائد کیا ہے اس کا خوفناک ترین حصہ وہ ہے جس میں فاقہ کش کسانوں کی دائمی تکالیف پر زور دیا گیا ہے

ذیل کا جواب پہلا ہے جو انھوں نے شاعر کو دیا تھا:۔

"شانتی نکیتن کے شاعر نے "ماڈرن ریویو" میں موجودہ تحریک پر ایک زبردست مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ انھوں نے الفاظ میں مصوری کی ہے جو انہی کا حصہ ہے۔ وہ حکومت کے خلاف، غلامانہ ذہنیت کے خلاف یا عارضی جنون کی ہر اندھی تقلید کے خلاف، خواہ وہ خوف پر مبنی ہو یا امید پر، ایک بلیغ صدائے احتجاج ہے۔ یہ تمام کارکنوں کے لئے ایک قابل ستائش اور خوشگوار یاد دلانے والی چیز ہے تاکہ ہم لوگ بے صبری کا اظہار نکریں اور لوگوں پر رعب نہ بٹھائیں

شاعر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر اُس چیز کو جو ہماری عقل یا ہمارے دل کو اپیل نہ کرسکے، فی الفور مسترد کر دینا چاہئے۔ اگر ہم سوراج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سچائی پر قائم رہنا چاہئے خواہ اِس کا نتیجہ کچھ ہی نکلے۔ ایک مصلح کو جو اس لئے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے پیغام کو تسلیم نہیں کیا گیا جنگل میں چلا جانا چاہئے اور وہاں رہ کر اسے سیکھنا چاہئے کہ کس طرح سے اسے دیکھ بھال رکھنی چاہئے، انتظار کرنا اور دعا مانگنی چاہئے

اِن سب باتوں کے ساتھ ہمیں دلی اتفاق ہونا چاہئے اور شاعر اپنے اہلِ ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سچائی اور عقل کی حمایت کی۔ بلا شبہ ہماری آخری حالت پہلی سے بدتر ہوگی اگر ہم اپنی عقل کو کسی دوسرے کے حوالہ کر دیں گے۔ اور مجھے یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوگا کہ ملک نے بلا سوچے سمجھے اور اندھے پن کے ساتھ میرے قول و فعل کی پیروی کی ہے۔ میں اِس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محبت کے روبرو اندھے پن کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دینا لبسا اوقات زیادہ شر انگیز ثابت ہوتا ہے بہ نسبت اُس جبریہ اطاعت کے جو ظالم کے چابک کا نتیجہ ہو . . . .

لٰہذا یہ بہت اچھی بات ہے کہ شاعر نے اُن تمام آدمیوں کو دعوت دے دی ہے جو غلامانہ طریقہ سے چرخہ کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں کہ وہ جرأت کرکے اپنی بغاوت کا اعلان کر دیں۔ اُن کا مضمون ہم سب کے لئے ایک تنبیہ ہے جو اپنی بے صبری کے عالم میں اُن لوگوں کے خلاف جو ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، عدم بردباری یا تشدد کا مظاہرہ کر بیٹھتے ہیں۔ میں شاعر کو سنتری

سمجھتا ہوں جو تعصب، سستی، عدم بردباری، جہالت، اور اسی نوع کے دوسرے دشمنوں کی آمد کے خلاف ہمیں آگاہ کرتے رہتے ہیں

لیکن جہاں میں شاعر سے اس امر کے بارے میں متفق ہوں کہ ضرورت ہے کہ دیکھ بھال رکھی جائے مبادا ہم غور و فکر کی قوت سے محروم ہو جائیں، وہاں میرے متعلق یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اس قول کی تائید کر رہا ہوں کہ آج ملک میں وسیع پیمانہ پر اندھی تقلید پائی جاتی ہے۔ میں نے بار بار عقل سے اپیل کی ہے اور میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے ملک کو یقین ہو گیا ہے کہ چرخہ اسے خوش حال بنا دیگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کافی غور و خوض کر لیا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ آیا اب بھی تعلیمیافتہ ہندوستانی چرخہ کی بنیادی سچائی کا اندازہ کر چکا ہے۔ انہیں سطح کی مٹی کو اندرونی مغز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ انہیں اور زیادہ گہرا جانا چاہیئے اور بچشم خود ملاحظہ کرنا چاہیئے کہ آیا اسے اندھی تقلید کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے یا عقل کی کسوٹی پر کسنے کے بعد اس کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے

میں شاعر اور رشی سے بلا شبہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ مقدس چیز کی حیثیت سے چرخہ کو کاتنا شروع کر دیں۔ جب جنگ چھڑ جاتی ہے اُسوقت شاعر اپنے بربط کو اور مقنن اپنی قانونی کتابوں کو الگ رکھ دیتا ہے۔ شاعر جنگ ختم ہو جانے کے بعد پھر اپنی ترنم ریزیاں شروع کر سکتا ہے۔ مقنن پھر اپنی کتابوں کا مطالعہ شروع کر سکتا ہے جب لوگوں کو آپس میں لڑنے کی فرصت مل جائیگی۔ جب مکان میں آگ لگی ہوئی ہو، تمام گھر والے باہر نکل پڑتے ہیں

اور ہر ایک آگ بجھانے کی غرض سے بالٹی ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ جب میرے گرد و پیش کے سب لوگ کھانے نہ ملنے کی وجہ سے مر رہے ہوں تو اس وقت میرا کام محض اشارہ جاتا ہے کہ میں بھوکوں کو کھانا کھلاؤں

میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے اس لئے کہ اُس کی مردانگی پر روزانہ چرکے لگائے جا رہے ہیں، وہ بھوک سے مر رہا ہے اس لئے کہ اُس کے پاس سامانِ خورد و نوش خریدنے کے لئے کام نہیں ہے۔ کھلنا فاقہ کشی میں مبتلا ہے اس لئے نہیں کہ لوگ کام نہیں کر سکتے بلکہ اس لئے کہ ان کے پاس کام نہیں ہے۔ سونپے ہوئے اضلاع لگاتار چوتھے قحط میں سے گذر رہے ہیں۔ اُڑیسہ وہ سرزمین ہے جو مزمن قحط میں مبتلا ہے

ہمارے شہر حقیقی ہندوستان نہیں ہیں۔ ہندوستان ساڑھے سات لاکھ دیہات میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ شہر دیہات پر اپنی زندگی کیلئے انحصار کرتے ہیں۔ وہ دوسرے ممالک سے اپنی دولت نہیں لاتے۔ شہر کے لوگ تو یورپ، امریکہ اور جاپان کے بڑے بڑے کارخانوں کے دلال اور کمیشن ایجنٹ ہیں، شہروں نے موخرالذکر ممالک کے ساتھ اشتراک عمل کرکے خون چوسا ہے اور یہ عمل گذشتہ دو سو سال سے جاری ہے۔ میرا عقیدہ جو تجربہ پر مبنی ہے یہ ہے کہ ہندوستان روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پاؤں اور اس کی ٹانگوں کا دورۂ خون تقریباً بند ہوگیا ہے، اور اگر ہم نے خبر نہ لی تو وہ بالکل تباہ ہو جائے گا

کمزور اور سست باشندوں کے لئے واحد قابل قبول شکل جس میں خدا

اپنے آپ کو ظاہر کر سکتا ہے، کام ہے اور بطور اس کی مزدوری کے روٹی کا وعدہ ہے۔ خدا نے آدمی کو پیدا کیا تاکہ وہ اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے کام کرے۔ کیا یہ امر باعث تعجب ہے اگر ہندوستان ایک وسیع قید خانہ بن گیا ہے؟ بھوک ہی وہ دلیل ہے جو ہندوستان کو چرخہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ چرخہ کی آواز شریف ترین چیز ہے اس لئے کہ وہ محبت کی آواز ہے اور محبت سوراج ہے۔ ہمیں اُن لکھوکھا انسانوں کا خیال کرنا چاہیئے جو آج جانوروں سے بھی کم ہیں اور جو تقریباً نیم جاں حالت میں رہتے ہیں۔ چرخہ ہمارے لکھوکھا نیم جاں ہم ملکی مردوں اور ہم ملکی عورتوں کے لئے زندگی بخش گھونٹ ہے

یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کاتوں جبکہ مجھے خوراک حاصل کرنے کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی؟ اس لئے کہ میں وہ چیزیں کھا رہا ہوں جو میری ملک نہیں ہیں۔ میں اپنے ہم ملکیوں کی لوٹ مار پر گذران کر رہا ہوں۔ ہر اُس سکہ کی جو آپ کی جیب میں داخل ہوتا ہے، راہ کا کھوج لگایئے تو آپ کو میرے بیان کی صداقت معلوم ہو جائیگی

سوراج اُن لکھوکھا باشندوں کے لئے ایک بے معنی چیز ہو جائیگا اگر انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی مجبور فرصت کے اوقات کو کس طرح کام میں لائیں۔ اس سوراج کا حصول تھوڑی مدت کے اندر ممکن ہے لیکن یہ صرف چرخہ کے احیا ہی سے ممکن ہو سکتا ہے

میرا دعویٰ ہے کہ چرخہ چھوڑ دینے سے ہم نے اپنا بایاں پھیپھڑا گم کر دیا

ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں دق کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے چرخہ کا ازسر نو احیا اس خوفناک بیماری کی ترقی کو روک دیتا ہے بعض چیزیں ایسی ہیں جنھیں تمام اشخاص کو ہر قسم کی آب و ہوا میں انجام دینا چاہیئے۔ چرخہ ہی وہ چیز ہے جسے سب لوگ ہندوستانی آب و ہوا میں چلا سکتے ہیں، کم سے کم اس تبدیلی کے دور میں، اور بہت بڑی اکثریت کو تو ہمیشہ ہمیشہ چلانا چاہیئے

غیر ملکی کپڑے کے ساتھ ہمیں جو محبت وابستہ کئے ہوئے ہے اسی نے چرخہ کو اس کے احترام سے نیچے گرا دیا۔ اسی وجہ سے میں غیر ملکی کپڑا پہننا گناہ سمجھتا ہوں۔ مجھے اقرار ہے کہ میں اقتصادیات اور اخلاقیات میں زیادہ فرق نہیں کرتا۔ اقتصادیات جو کسی فرد واحد یا قوم کی اخلاقی بہبودی کو صدمہ پہونچائے، بد اخلاقی ہے اور اسی وجہ سے وہ گناہ ہے۔ اسی طرح جو اقتصادیات ایک ملک کو اجازت دیتی ہے کہ وہ دوسرے ملک کو لوٹ لے، وہ بد اخلاقی ہے۔ امریکہ کی گیہوں کھانا اور اپنے اناج کے بیچنے والے پڑوسی کو گاہک نہ ملنے کی وجہ سے فاقہ کرنے دینا گناہ ہے۔ ان چیزوں کو خریدنا اور استعمال کرنا بھی گناہ ہے جو جبریہ مزدوری کرا کے بنوائی جاتی ہیں۔ اسی طرح میرے لئے ریجنٹ اسٹریٹ کے بہترین ریشمی کپڑے پہننا بھی گناہ ہے جبکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں اپنے پڑوس کے کاتنے والوں اور بننے والوں کے بنائے ہوئے کپڑے پہنتا تو نہ صرف یہ کہ میری تن پوشی ہو جاتی بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں خوراک ملتی اور ان کی تن پوشی بھی ہو جاتی۔ میرے گناہ کا جو احساس مجھ پر مستولی ہو رہا ہے وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں غیر ملکی کپڑوں کو نذرِ آتش کر دوں اور اس طرح سے میں اپنے آپ کو مطہر بنا لوں اور اس کے بعد سے

میرے پڑوسیوں کے بھدّے ہاتھ سے کتے ہوئے کپڑے کے استعمال پر قناعت کر لوں۔ یہ جاننے کے بعد کہ ممکن ہے کہ میرے پڑوسی پیشہ ترک کرنے کے بعد چرخہ چلانا شروع نہ کریں، میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں خود اسے اختیار کر لوں اور اس طرح سے اسے ہر دلعزیز بنا دوں

در اصل میں اپنے غیر ملکی کپڑے جلا دینے سے اپنی ذلّت کو نذرِ آتش کر رہا ہوں۔ ننگے آدمیوں کو ایسے کپڑے دے کر جن کی اُنہیں ضرورت نہیں ہے، بجائے کام دینے کے جن کی انہیں شدید ضرورت ہے، مجھے ان کی بے عزتی کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ میں ان کا مربّی بن کر گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا

اس کے ساتھ ہی عدمِ تعاون کی اسکیم یا سودیشی کا پروگرام محض اس ملک کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ میری خاکساری مجھے گھروں کی چھتوں پر سے اس امر کا اعلان کرنے میں مانع آتی ہے کہ عدمِ تعاون عدمِ تشدد اور سودیشی تمام دنیا کے لئے ہے۔ اگر اُسی سرزمین میں جہاں سے یہ پیغام دیا جا رہا ہے، یہ پیغام بارآور نہیں ہو سکتا تو پھر یہ بے کار سی چیز ہے

فی الحال ہندوستان اور باقی دنیا میں کوئی چیز مشترک نہیں سوائے اس کی ذلّت، فقر اور وباؤں کے۔ کیا یہ اس کی قدیم مذہبی کتب ہیں جو ہمیں دنیا بھر میں پھیلانی چاہیئں؟ اچھا تو وہ مختلف ایڈیشنوں میں چھپ چکی ہیں اور یقین نہ کرنے والی اور بت پرست دنیا ان کی طرف دیکھنا بھی

نہیں چاہتی اس لیے کہ ہم خود جو ان کے وارث اور محافظ ہیں، انہیں پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا دنیا کو ان میں شرکت کی دعوت دینے کا خیال کرنے سے پہلے مجھے انکو اپنے قبضہ میں لینا چاہیئے۔ ہمارا عدم تعاون نہ انگریزوں کے ساتھ ہے اور نہ مغرب کے ساتھ۔ وہ تو اس نظام کے ساتھ ہے جسے انگریزوں نے اپنی مادی تہذیب کے ذریعہ قائم کیا ہے جس کا لازمی نتیجہ حرص اور کمزوروں کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ ہمارا عدم تعاون یہ ہے کہ ہم انگریز حکام کے ساتھ اُن کی شرائط پر اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیں۔ ہم اُن سے یہ کہتے ہیں: آؤ اور ہماری شرائط پر ہم سے اشتراک عمل کرو اور ایسا کرنے میں ہمارا آپ کا اور دنیا کا بھلا ہو گا۔

ہمیں انکار کر دینا چاہیئے کہ کوئی شخص ہمیں اٹھا کر لے چلے۔ ڈوبتا ہوا آدمی دوسروں کو نہیں بچا سکتا۔ دوسروں کو بچانے کے قابل بننے کے لئے ہمیں پہلے اپنے آپ کو بچانا چاہیئے۔ ہندوستانی قومیت خاص طور پر جنگ جو یا نہ یا تباہ کن چیز نہیں ہے۔ وہ تو صحت بخش، مذہبی اور اس لئے بنی نوع انسان کی خدمت گذار ہے۔ ہندوستان کو زندہ رہنے کا فن سیکھنا چاہیئے، اس سے قبل کے کہ وہ بنی نوع انساں کے لئے جان دینے کی تمنا کر سکے جو چوہیاں بیچارگی کی وجہ سے اپنے آپ کو بلی کے منہ میں باقی ہیں، اپنے جبریہ ایثار اور قربانی کی وجہ سے کسی ثواب کی حقدار نہیں ہو سکتیں

اپنی شاعرانہ فطرت کے مطابق شاعر اعظم مستقبل کے لئے زندہ ہیں اور وہ متوقع ہیں کہ ہم بھی اُن کی ہی تقلید کریں۔ وہ ہماری تعریف کرنے والی

نظر کے سامنے اُن پرندوں کی تصویر کھینچ رہے ہیں جو علی الصبح آسمان پر اڑتے ہوئے خدا کی حمد کے ترانے گاتے ہیں۔ اُن پرندوں کو پیٹ بھر کھانا مل چکا تھا اور وہ آرام پائے ہوئے پروں کے ساتھ اُڑتے تھے اور اُن کی رگوں میں قبل کی رات میں تازہ خون دوڑ چکا ہے لیکن میں ایسے پرندوں کو دیکھ کر کڑھ رہا ہوں جو فقدانِ طاقت کی وجہ سے اپنے پروں کو پھڑپھڑانے پر بھی مائل نہیں ہوسکتے۔ انسانی پرندہ ہندوستانی آسمان کے نیچے اُس سے کمزور تر اٹھتا ہے جبکہ وہ بظاہر آرام کرنے کے لئے سویا تھا کیونکہ لکھوکھا انسانوں کے لئے وہ دائمی جگار یا دائمی بے ہوشی کی سی کیفیت ہے۔ مگر اس ناقابلِ یقین دکھ بھری حالت کا پورا احساس کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اس کا تجربہ کریں۔ مجھے یہ بات مشکل معلوم ہوئی ہے کہ میں تکلیف اٹھانے والے مریضوں کو کبیر کا ایک دوہا سنا کر تسلی و تشفی دے سکوں۔ بھوکے کروڑہا انسان ایک ایسی نظم کے طالب ہیں جو طاقت بخشنے والی خوراک کی شکل میں ہو۔ وہ انہیں نہیں ملتی۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے کام کریں۔ اور وہ اُسے صرف اُس وقت حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنا خون پسینہ کر دیں گے"

مسٹر گاندھی کا دوسرا مضمون جس میں انھوں نے تحریکِ عدم تعاون کے بارے میں شاعر کے شبہات کا جواب دیا ہے، حسب ذیل ہے :۔

"شاعرِ ایشیا بہت جلد دنیا کا شاعر بن رہے ہیں۔ اُن کے روز افزوں وقار نے اُن پر مزید ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ ہندوستان کی جو سب

سے بڑی خدمت وہ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پیغام کے وہ اپنے شاعرانہ انداز میں دنیا تک پہونچادیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نہایت صداقت کے ساتھ متفکر ہیں کہ ہندوستان اپنے نام سے کوئی جھوٹا یا کمزور پیغام نہ بھیجے۔ وہ قدرتاً اپنی ملک کی شہرت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ موجودہ تحریک سے اتفاق رائے کرنے کی غرض سے انھوں نے بہت سعی کی ہے۔ انہیں اقرار ہے کہ وہ پریشان ہیں۔ وہ عدم تعاون کے شور وشغب میں اپنے بربط کے لئے کوئی موزوں نغمہ نہیں پاتے

تین زوردار چٹھیوں میں انھوں نے اپنے شبہات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہندوستان کا جو تخیل انھوں نے قائم کر رکھا ہے، عدم تعاون اس کے شایانِ شان نہیں ہے، یہ کہ وہ سلبی اصول ہے اور مایوسی کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ وہ علیحدگی، تنگ خیالی اور تخریب کا فلسفہ ہے

کوئی ہندوستانی ایسا نہ ہوگا جو ہندوستان کی عظمت کے بارے میں شاعر کے اس خوبصورت احساس خودداری پر فخر نہ کرتا ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ انھوں نے اپنے شبہات کو ہمارے پاس ایسی زبان میں لکھکر بھیجا ہے جو نہ صرف دلاویز ہے بلکہ واضح بھی ہے

کوئی ہندوستانی ایسا نہیں ہے جو شاعر کے شبہات کے بارے میں فخر محسوس نہ کرتا ہو۔ ممکن ہے کہ میں انہیں یا پڑھنے والے کو جو ان کی بلاغت سے مسحور ہو چکا ہے، یقین نہ دلا سکوں لیکن میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں

کہ عدم تعاون کا تخیل ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ اُس سے خوف کھائیں اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ملک کے متعلق شرم محسوس کریں اس بنا پر کہ اس نے عدم تعاون اختیار کر لیا ہے۔ اگر اخیر میں یہ معلوم ہو کہ تحریک عملی اطلاق کے لحاظ سے ناکام رہی تو یہ اصول کا یا سچائی کا قصور نہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اُسے عملی شکل میں لانا چاہتے ہیں، کامیاب نہیں ہوئے۔ ممکن ہے کہ عدم تعاون کی تحریک قبل از وقت شروع کر دی گئی ہو۔ اگر صورت حالات یہ ہے تو پھر ہندوستان اور دنیا کو انتظار کرنا چاہیئے لیکن ہندوستان کے لئے اب کوئی مفر نہیں سوائے اس کے کہ وہ تشدّد اور عدم تعاون میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے

اس کے ساتھ شاعر کو اس بارے تشویش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ عدم تعاون کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور مغرب کے درمیان ایک سدِّ سکندری قائم کر دی جائے۔ برخلاف اس کے عدم تعاون کا مقصد باعزت اور رضاکارانہ اشتراک عمل کے لئے جو باہمی احترام اور اعتماد پر مبنی ہو، راستہ ہموار کرنا ہے۔ موجودہ جنگ جبریہ اشتراکِ عمل کے خلاف یکطرفہ احتجاع کے خلاف، لوٹ مار کے موجودہ طریقوں جنہیں تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مسلح طور پر عائد کئے جانے کے خلاف جاری کی گئی ہے

عدم تعاون برائی میں غیر شعوری اور نارضامندانہ شرکت کیخلاف صدائے احتجاج ہے

شاعر کو طلبا کی بہت زیادہ تشویش ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ انہیں دعوت نہیں دینی چاہیئے تھی کہ وہ سرکاری مدارس کو چھوڑ دیں اس سے قبل

کہ اُن کے لیئے ایسے اسکول بہم پہونچائے جاتے جہاں وہ جاسکتے۔ اس موقع پر میں اُن سے اختلاف رائے رکھنے پر مجبور ہوں۔ میں نے ادبی تعلیم کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ میرے تجربہ نے ثابت کردیا ہے کہ بجائے خود انسان کی اخلاقی حالت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتی۔ سرکاری مدارس نے ہمیں نامرد بنادیا ہے، ہمیں اپاہج کردیا ہے اور ہمیں دہریہ بنادیا ہے۔ انھوں نے ہمارے دلوں میں بے اطمینانی پیدا کردی ہے اور ہمیں مایوس بنادیا ہے۔ انھوں نے ہمیں وہی بنادیا ہے جو اُن کا مقصود تھا یعنی کلرک اور ترجمان

ایک حکومت بظاہر اپنے وقار کی تعمیر محکوم کے رضاکارانہ تعلق پر قائم کرتی ہے۔ اور اگر ہمیں غلام رکھنے میں گورمنٹ کے ساتھ تعاون رکھنا غلطی تھی تو پھر ہمارا فرض تھا کہ ہم ابتدا اُن اداروں سے کرتے جہاں ہمارا تعلق بہ ظاہر نہایت رضاکارانہ تھا۔ ایک قوم کے نوجوان ہی اس کی امید ہیں۔ میری رائے ہے کہ جونہی ہم نے یہ بات دریافت کرلی کہ حکومت کا نظام کلیتہً یا زیادہ تر خراب ہے اس کے بعد سے ہمارے لئے اپنے بچوں کو اس سے تعلق رکھنے دینا گناہ ہوگا

لیکن شاعر نے لڑکوں کو اسکولوں سے نکلوا لینے پر جو صدائے احتجاج بلند کی ہے وہ درحقیقت اصول عدم تعاون ہی کے اعتراض کا شاخسانہ ہے۔ وہ ہر سلبی چیز سے ڈرتے ہیں۔ اُن کی ساری روح مذہب کے سلبی احکام کے خلاف بغاوت کناں معلوم ہوتی ہے۔ میں اُن کے اعتراض کو انہی کی ناقابلِ تقلید زبان میں پیش کئے دیتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

———— نے موجودہ تحریک کی تائید میں مجھ سے متعدد بار کہا ہے کہ ابتدا میں کسی مطمح نظر کو قبول کر لینے کے مقابلہ میں مسترد کر دینے کا جذبہ زیادہ طاقتور معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میں اسے امر واقعی سمجھتا ہوں لیکن میں اُسے سچائی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ برہما ودّیا کا مطمح نظر مکتی (نجات) ہے اور بدھ مذہب کا مطمح نظر نروان (نیستی) ہے۔ مکتی ہماری توجہ کو ایجابی باتوں کی طرف مبذول رکھتی ہے اور نروان سچائی کا سلبی پہلو پیش کرتا ہے۔ لہٰذا بُدھ نے دُکھ (تکلیف) کی حقیقت پر زور دیا جس سے اجتناب لازمی تھا اور برہما ودّیا نے آنند (خوشی) کی حقیقت پر زور دیا جسے حاصل کرنا چاہیئے،

ان اور اسی قسم کے اور فقرات سے قارئین شاعر کی ذہنیت کی کُنجی دریافت کر لیں گے۔ میری عاجزانہ رائے میں استرداد بھی ویسا ہی مطمح نظر ہے جیسا کہ کسی چیز کی قبولیت۔ تمام بڑے بڑے مذاہب یہ تعلیم دیتے ہیں کہ دو متضاد طاقتیں ہم پر اپنا عمل کر رہی ہیں اور یہ کہ انسانی کوششیں ہمیشہ استرداد اور قبولیت کے سلسلہ میں مرکوز رہتی ہیں۔ برائی سے عدم تعاون ویسا ہی فرض ہے جیسا کہ اچھائی کے ساتھ تعاون۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ شاعر نے غیر شعوری طور پر بُدھ مذہب کے ساتھ بے انصافی سے کام لیا ہے جب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نروان محض ایک سلبی حالت کا نام ہے۔ میں زور کے ساتھ یہ بات کرتا ہوں کہ مکتی (نجات) بھی نروان کی طرح سلبی پہلو رکھتی ہے۔ نفس کی بندھن سے آزادی یا اس کی نیستی ہی انسان کو آنند (دائمی مسرت) کی طرف لے جاتی ہے

اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ شاعر ناحق عدم تعاون کے سلبی پہلو سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ ہم نے دہنیں رکھنے کی طاقت کھو دی تھی۔ حکومت سے دہنیں، کہنا غیر وفادارانہ بلکہ تقریباً خلاف مذہب سمجھا جاتا تھا۔ تعاون کرنے سے جان بوجھ کر انکار کر دینا گھاس پھوس اکھاڑ کر پھینک دینے کے ضروری عمل کی حیثیت رکھتا ہے جسے ایک کاشتکار بیج بونے سے پہلے کر لیتا ہے زراعت کے گھاس پھوس اکھاڑنے کا فعل بونے کی طرح لازمی ہے۔ بلا شبہ جب فصلیں کھڑی ہو جاتی ہیں اس وقت بھی جیسا کہ ہر کاشتکار جانتا ہے گھاس پھوس اکھاڑنے والی درانتی روزمرہ کام میں آنیوالی چیز کی حیثیت رکھتی ہے

قوم کا عدم تعاون حکومت کے نام دعوت ہے اس امر کی کہ وہ اس کی شرائط پر تعاون کرے جیسا کہ ہر قوم کا حق ہے اور ہر اچھی حکومت کا فرض ہے۔ عدم تعاون قوم کا نوٹس ہے اس امر کی اطلاع دینے کے لئے کہ وہ اب غلامی کی حالت سے مطمئن نہیں ہے۔ قوم نے غیر فطری اور غیر مذہبی اصول تشدد کی بجائے عدم تعاون کا غیر ضرر رسان، قدرتی اور مذہبی اصول اختیار کر لیا ہے۔ اور اگر کبھی ہندوستان کو وہ سوراج ملے گا جس کا خواب شاعر دیکھ رہے ہیں تو وہ صرف غیر متشددانہ عدم تعاون ہی کے ذریعہ ملیگا۔ وہ دنیا کو پیغام امن دے سکتے ہیں اور اعتماد رکھ سکتے ہیں کہ ہندوستان اپنے عدم تعاون کے ذریعہ بشرطیکہ وہ اپنی قسم پر قائم رہا اپنے پیغام کی عملی تفسیر پیش کرے گا۔ عدم تعاون کا مقصد حب الوطنی ہے جس کے لئے شاعر اس قدر تڑپ رہے ہیں۔ ایسا ہندوستان جو یورپ کے

قدموں پہ پڑا ہوا ہو، بنی نوع انسان کے دل میں کوئی امید پیدا نہیں کر سکتا مگر بیدار اور آزاد ہندوستان بلا شبہ دکھی دنیا کے لئے امن اور شانتی کا پیغام دے سکتا ہے"

ہندوستان کے سب سے بڑے دو روحانی لیڈروں کے درمیان اس اختلاف رائے کی پوری تشریح کرنے کے بعد جسکے ساتھ ساتھ ہر فریق کی طرف سے ایسے اقتباسات بھی پیش کر دئے گئے ہیں جن میں ساری تحریک عدم تعاون کے بڑے بڑے اصولوں سے بحث کی گئی ہے اور عالمگیر اہمیت کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں، میں تے ہچکچاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ باب کو "ولایتی کپڑوں کی ہولی" کے واقعہ پر ختم کر دوں جس میں مجھے رنج و افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرا نام بھی آگیا ہے۔ لیکن ایسا کرنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ مسٹر گاندھی کی طرف سے ملک کے تمام حصوں میں اور بالخصوص بمبئی میں اس قسم کے بار بار افعال کی پُر جوش ترغیب نے مزید تشدد کا راستہ کھول دیا۔ مثلاً بمبئی میں ایک موقع پر ولایتی کپڑوں کی ہولی کے لئے جو مجمع اکٹھا ہوا تھا، وہ اتنا زبردست تھا کہ اس کا اندازہ ایک لاکھ سے اوپر کیا جاتا تھا اور اُس کے بعد سے فتنہ و فساد کی لہر تمام شہر میں پھیل گئی۔ جو لوگ ولایتی لباس زیب برتن کئے ہوئے تھے، اُن پر خفیف حملے بھی کئے گئے

اور طریقوں سے انسانی جذبات میں اشتعال پیدا کیا گیا تھا۔ ذاتی طور پر میں نے غیر متشدد ترکِ تعاون کی ابتدا میں عملی حصہ لیا تھا یہ یقین

کرتے ہوئے کہ جو برائیاں پنجاب میں کی گئی ہیں، اُن کی موجودگی میں یہ فعل صداقت پر مبنی ہے۔ اس طرح سے مجھے مجبوراً اُس طریق عمل کے خلاف کھلم کھلا صدائے احتجاج بلند کرنی پڑی جو میری رائے میں عدم تشدد کے عین منافی تھا اور جو صاف طور پر نمایاں ہو گیا تھا

لیکن ولایتی کپڑوں کی ہولی اس وقت تک بدستور جاری رہی جب تک کہ بمبئی اور چوری چورا کے واقعات نے جن کا ذکر باب آئندہ میں کیا گیا ہے، تحریک کو فوری اور تباہ کن طریقہ سے پایۂ اختتام تک پہونچا دیا

میری صدائے احتجاج اور تقریباً بے شمار چٹھیوں کے جواب میں مہاتما گاندھی نے "ینگ انڈیا" میں ذیل کا مضمون تحریر فرمایا تھا:۔

"مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام اس امر کو پسند کریں گے کہ جو خوبصورت اور درد بھری چٹھی مسٹر اینڈریوز نے مجھے تحریر کی ہے۔ اس کے پڑھنے میں وہ بھی شریک ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میں جانتا ہوں کہ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی غریب اشخاص کی امداد کرنے کے خیال سے کی جا رہی ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔ لفظ "غیر ملکی" میں قومی منافرت کی ہلکی سی اپیل مضمر ہے جو دن بدن اس امر کی طالب ہے کہ اس کی روک تھام کی جائے نہ یہ کہ اسے اور ہیجان میں لایا جائے۔ آپ کا اُس بڑے ڈھیر کو آگ لگانے کے فعل نے جس میں نازک اور باریک کپڑے بھی تھے، مجھے سخت صدمہ پہونچایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُس دنیا کو نظر انداز کر رہے ہیں جس سے ہم متعلق ہیں اور خود غرضی کے ساتھ ہم

ہندوستان ہی پر اپنی توجہات کو مرکوز کئے دے رہے ہیں اور (مجھے خوف ہے) کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم قدیم، خراب اور خودغرضانہ قوم پرستی کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اگر یہ ایسا ہی ہے تو ہم پھر اُسی خراب چکّر میں پھنس رہے ہیں جس سے نکلنے کے لئے یورپ ایسی زبردست جدوجہد کر رہا ہے لیکن وہ دلیلوں کے ذریعہ اُس سے باہر نہیں آسکتا۔ میں پھر یہ بات کہتا ہوں کہ اس واقعہ نے مجھے سخت صدمہ پہونچایا ہے اور مجھے وہ تشدد کی ایک شکل معلوم ہوتی ہے۔ اور باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ تشدّد آپ کے لئے کس قدر نفرت انگیز چیز ہے۔ میں بالکل نہیں چاہتا کہ غیر ملکی کپڑے کے سوال کو مذہبی بنا لیا جائے"

"میں بے حد مسرت محسوس کر رہا تھا جب آپ شراب خواری، منشیات، چھوت چھات، نسلی منافرت جیسی بنیادی اخلاقی خرابیوں کے انسداد کے لئے زبردست حملے کر رہے تھے اور جب آپ ایسی حیرت افزا اور خوب صورت نرمی کے ساتھ زناکاری کی خوفناک برائی کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ لیکن غیر ملکی کپڑے کی ہولیاں جلانا اور لوگوں سے یہ کہنا کہ اُسے پہننا مذہبی گناہ ہے، اپنے ہم جنس مردوں اور عورتوں، اپنے بیرونی بھائیوں اور بہنوں کی شریف دستکاریوں کے نمونوں کو آگ میں جھونک دینا۔ یہ کہنا کہ اس کے استعمال سے روح ناپاک ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ واقف ہیں کہ مجھے اب وہ کھدر پہنتے ہوئے خوف ہوتا ہے جو آپ نے مجھے مرحمت

فرمایا ہے مبادا ایں بھی دوسرے آدمیوں کی نسبت فریسیؔ[1] کی طرح یہ رائے رکھنے لگ جاؤں اور کہنے لگ جاؤں کہ "میں تجھ سے زیادہ مقدس ہوں"۔ میں نے یہ بات پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی

'آپ جانتے ہیں کہ جب آپ کوئی ایسی بات کرتے ہیں جو مجھے تکلیف دیتی ہے تو میں کس طرح سے آپ کو چلّا کر کہہ دیتا ہوں، اور یہ بھی ایک ایسی چیز ہے جس نے مجھے تکلیف پہونچائی ہے'

یہاں پر اُن کا خط ختم ہو جاتا ہے

یہ خط اُن سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے! جب کبھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ میری کسی بات سے انہیں تکلیف نہیں پہونچی ہے (اور بلا شبہ یہ پہلا موقع نہیں ہے) تو وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر خطوط کی بھرمار کر دیتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ باہمی محبت کا ہے نہ کہ بحث و تمحیص کا۔ اور دلایتی کپڑوں کی ہولی کے ساتھ بھی یہی بیتی

میں ہولی کی ضرورت کے بارے میں پہلے کی طرح کامل یقین رکھتا ہوں اس عمل میں نسلی احساس پر کبھی زور نہیں دیا جاتا۔ میں مقدس اور منتخب خاندانی یا دوستوں کے حلقوں میں بعینہٖ یہی بات کروں گا جو کام میں کرتا ہوں یا جو بات میں کہتا ہوں، اس پر میں اپنے اس اٹل معیار کو چسپاں کیا کرتا ہوں کہ آیا فلاں فعل عزیز ترین اور قریب ترین اشخاص کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ جو ایمان مجھے اس قدر عزیز ہے، اس بارے میں اُس کی تعلیم اٹل اور غیر مبہم

[1] یہودیوں کا ایک فرقہ جو مذہبی رسوم کی ظاہری پابندی پر زور دیتا ہے۔ مترجم

ہے۔ اور یہی وہ اعتقاد ہے جو میرے بہت سے اعمال کے بارے جن سے اکثر اوقات میرے دوست بھی چکرا جاتے ہیں، مجھے یقین سے معمور رکھتا ہے

مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک دوربین کو جو میرے اور ایک دوست کے درمیان باعثِ نزاع بنی ہوئی تھی، سمندر کے اندر پھینک دیا تھا۔ اس نے ابتدا میں تامل کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے ایک خوبصورت اور قیمتی چیز کی تباہی کو درست خیال کیا حالانکہ وہ ایک دوست کی طرف سے تحفہ تھا۔ تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ نہایت قیمتی تحایف کو بھی بغیر کسی معاوضہ اور تامل کے تباہ و برباد کر دینا چاہیئے اگر وہ کسی کی اخلاقی ترقی کو روک رہے ہوں۔ کیا اُس قیمتی سامان کو جس میں پلیگ کے اثرات موجود ہوں، نذرِ آتش کرنا مقدس فرض خیال نہیں کیا جاتا؟ مجھے یاد ہے کہ جب میں نوجوان تھا اُس وقت میں نے اپنی پیاری بیوی کی پیاری چوڑیاں توڑ دی تھیں اس لئے کہ وہ ہمارے درمیان سخت اختلاف کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو وہ اُن کی والدہ کا عطیہ تھیں۔ میں نے وہ فعل نفرت کے جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ جاہلانہ جذبۂ محبت کے ماتحت کیا تھا۔ جیسا کہ میں اُس واقعہ کو اس بڑی عمر پر پہونچکر دیکھ سکتا ہوں۔ چوڑیوں کی تباہی نے ہماری امداد کی اور ہم ایک دوسرے سے قریب تر آگئے

اگر تمام غیر ملکی چیزوں پر زور دیا جاتا تو یقیناً وہ فعل نسلی منافرت پیدا کرتا اور شر انگیز ہوتا۔ مگر زور تمام غیر ملکی کپڑے پر دیا جا رہا ہے۔ یہ حد بندی دنیا کے لئے معمولی بات نہیں ہے۔ مگر میں انگریزی لیور گھڑیوں یا خوبصورت

جاپانی پینٹ پر ہندوستان کا دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا لیکن میں یورپ کی بہترین شرابوں کو بالضرور تباہ وبرباد کردینا چاہتا ہوں خواہ انہیں نہایت حفاظت اور احتیاط سے کیوں نہ تیار اور محفوظ کیا گیا ہو۔ شیطان اپنے جال بہت خوبصورت طریقہ سے بچھاتا ہے اور وہ نہایت جاذب توجہ بھی ہوتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ صحیح کو غلط سے جدا کرنے والا خط اس قدر باریک ہوتا ہے کہ دکھائی نہیں پڑتا لیکن وہ خط تو غیر متبدل اور مستقل طور پر وہاں موجود ہے۔ اسے عبور کرنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہو سکتا ہے

ہندوستان آج نسلی اختلافات میں مبتلا ہے نہایت سخت کوشش کرنے کے بعد میرے لئے یہ ممکن ہوا ہے کہ میں لوگوں کے خراب جذبات کو قابو میں رکھ سکوں۔ عام لوگوں کے دل رنج اور نفرت کے جذبات سے معمور ہیں اس لئے کہ وہ کمزور ہیں اور اپنی کمزوری کو دور کرنے کی غرض سے ضرورت سے زیادہ جاہل ہیں۔ میں اس نفرت کو آدمیوں کی بجائے چیزوں کی طرف منتقل کر رہا ہوں غیر ملکی کپڑوں کی محبت غیر ملکی حکومت، فقر و فاقہ اور سب سے زیادہ جو چیز خراب ہے یعنی بہت سے گھروں میں بے شرمی کی زندگی کا باعث ہوا ہے شاید قارئین کرام کو یہ بات معلوم نہیں کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ کاٹھیاواڑ کے ہزار ہا اچھوت جلاہے اپنے پیشہ کو جاتا ہوا دیکھ کر بمبئی کی میونسپلٹی میں جھاڑو دینے پر مقرر ہو گئے۔ اور ان لوگوں کی زندگی اس قدر مشکل ہو گئی ہے کہ بہت سے اپنے بچوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور جسمانی اور اخلاقی طور پر تباہ برباد ہو چکے ہیں

ہیں بعض نہایت بے بسی کے ساتھ اپنی بیٹیوں نیز اپنی بیویوں کی بے شرمیوں کو دیکھو رہے ہیں۔ قارئین کو شاید معلوم نہیں ہے کہ گجرات میں اس طبقہ کی بہت عورتوں نے گھر کا کام کاج نہ ملنے کے باعث کسی نہ کسی دباؤ کے ماتحت اپنی عصمت کو فروخت کرنے کی غرض سے کوٹھوں پر بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ ممکن ہے قارئین کو معلوم نہ ہو کہ چند سال قبل پنجاب کے غیور جلاہوں نے کام نہ ملنے کے سبب سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور اس طرح سے وہ اپنے افسروں کے حکم سے غیور اور بے گناہ عربوں کے قتل کا باعث بنے تھے اپنے ملک کی خاطر نہیں بلکہ محض اپنی روزی کی خاطر۔ ان گم کردہ راہ کرایہ کے ٹٹوؤں سے کامیاب اپیل کرنا اور انہیں اُن کے قاتلانہ پیشہ سے جدا کرنا مشکل امر ہے

لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات ہے اگر میں اب یہ خیال کروں کہ غیر ملکی کپڑے کو چھونا گناہ ہے؟ کیا ایک ایسے شخص کے لئے جس کا ہاضمہ بہت کمزور درنازک ہو، مرغن غذائیں کھانا گناہ نہیں ہے؟ کیا اس کا فرض نہیں ہے کہ یا تو وہ انہیں ضائع کر دے یا کسی کو دیدے؟ میں جانتا ہوں کہ ایسی حالت میں کہ میرا بیٹا بستر پر پڑا ہوا ہے جسے اُن سے پرہیز رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن جنہیں وہ کھانا پسند کرتا ہے اس وقت میں مرغن غذاؤں کے ساتھ کیا کارروائی کروں گا۔ اس کے دل میں سے لالچ کا جذبہ نکالنے کی غرض سے میں خود انہیں کھانے سے اجتناب کروں گا۔ خواہ مجھ میں انہیں ہضم کر لینے کی قابلیت ہی کیوں نہ ہو، اور خود اس کی موجودگی میں انہیں ضائع کردونگا تاکہ کھانے کے گناہ کا سبق اس کے دل میں اُتر آئے

اگر غیر ملکی کپڑے کا ضیاع اعلیٰ ترین اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک اچھی چیز ہے تو پھر ہمیں سودیشی کپڑے کی قیمت میں اضافہ کے خیال سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ پیداوار کو ترقی دینے کا فوری طریقہ یہ ہے کہ کسی چیز کو تباہ کر دیا جائے ایک عظیم الشان کوشش اور فوری تباہی کے ذریعہ ہندوستان کو اس کی نیند اور حیرت یہ سستی سے بیدار کرنا مقصود ہے۔ ذیل میں آسام گزیٹیر کے مصنف مسٹر ایلین کی رائے درج کی جاتی ہے جنہوں نے کامروپ کے بارے میں ۱۹۰۵ء میں یہ الفاظ تحریر کئے تھے:۔

'حال کے سالوں میں درآمد کپڑے کے لئے شوق پیدا ہو رہا ہے، یہ ایسی بدعت ہے جس کی سفارش نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے جو وقت پہلے سانچہ پر صرف کیا جاتا تھا وہ اب بالعموم کسی دوسرے مفید کام میں صرف نہیں ہوتا

جن جن آسامیوں سے میں نے گفتگو کی ہے وہ سب اپنا نقصان کر لینے کے بعد ان الفاظ کی صداقت کا احساس رکھتے ہیں۔ غیر ملکی کپڑا ہندوستان کے لئے وہی حکم رکھتا ہے جو جسم میں فاسد مادہ رکھتا ہے۔ ہندوستان کی صحت کے لئے اول الذکر کی تباہی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ جسم کی صحت کے لئے موخر الذکر مادہ کا اخراج

سودیشی کی اسپرٹ کو پورے طور پر پیدا کر دینے کے بعد ہمیں اس امر کا خوف نہیں کرنا چاہئے کہ اس سے تنگ خیالی اور علیحدگی کا احساس ترقی پذیر ہوتا ہے۔ دوسروں کے تقدس کی حفاظت کرنے سے پیشتر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے جسموں کی حفاظت اس طرح سے کریں کہ ہر قسم کی زیادتی کی تباہ کاریوں

سے اپنے آپ کو محفوظ کریں۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے کہ وہ مردہ بنا ہوا ہے اور دوسرے کی مرضی پر حرکت کرتا ہے۔ ترکیۂ باطن کے ذریعہ اُسے زندہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ اور پھر وہ اپنے لئے اور بنی نوعِ انسان کے لئے ایک ابدی رحمت ہو جائے گا۔ اُسے درا بے پروائی سے زیادہ کھا لینے دو، پیش دستی کرنے دو اور حریص بن جانے دو، اور پھر اگر وہ اٹھا تو صرف تباہ کرنے کے لئے اٹھے گا اور اپنے لئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک لعنت بن جائیگا

اور سودیشی پر پختہ یقین رکھنے والے کے لئے گھر کا بنا ہوا کپڑا پہننے میں اس بے جا اظہار و نمود کی ضرورت نہیں جس کی فریسی سے توقع کی جاتی ہے فریسی نیکی کا مربی ہوتا ہے۔ کھدر کا پہننے والا سودیشی کے نقطۂ نظر سے اُس آدمی کی مانند ہے جو اپنے پھیپھڑوں کا استعمال کرتا ہے۔ ایک قدرتی اور لازمی فعل کی بجا آوری ضروریات سے ہے۔ خواہ دوسرے لوگ اُسے ناپاک جذبات کے ماتحت کریں یا اُس سے بالکل ہی اجتناب رکھیں،،

باب شانزدہم

فسادات بمبئی

زمانۂ حال میں کسی قومی لیڈر کو ایسی حالت میں جبکہ ایک بہادرانہ جد وجہد بھی جاری ہو، شاید ہی اس سے زیادہ دھچکہ محسوس ہوا ہو جتنا مہاتما گاندھی کو ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں پہونچا تھا، کیونکہ ان کے اعتماد اور پرامن بائیکاٹ کی تقریباً فاتحانہ توقع کے خلاف بمبئی کے مزدوروں نے پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر ملوں کے رقبہ میں مجنونانہ انداز میں فساد برپا کردیا اور اس طرح عدم تعاون کی تحریک کے غیر تشدد دانہ پہلو کو اپنی ایک حرکت سے تباہ وبرباد کردیا

خود مسٹر گاندھی کو اس غیر متوقع واقعہ سے سب سے زیادہ صدمہ پہونچا اس لئے کہ وہ بنفس نفیس عین موقعۂ واردات پر بمبئی میں موجود تھے لیکن مختص بے بسی اور بیچارگی کی حالت میں۔ ان کی شخصیت کا جادو بھی جس نے دوسرے مواقع پر حیرت انگیز کارنامے انجام دئے تھے، عامۃ الناس کے تشدد کی روک تھام کرنے سے عاجز رہا۔ انھوں نے پہلے سے شاہزادہ کی آمد کے دن غیر ملکی کپڑوں کی ہولی منانے کا انتظام کر رکھا تھا اور انہیں یہ امید تھی کہ وہ لوگوں کو دوسرے مرکز کی جانب متوجہ رکھ سکیں گے لیکن مزدوری پیشہ لوگ ملوں کے رقبہ میں ان دنوں کے عام ہیجان کی رو میں اس قدر بے قابو ہوگئے اور ایسی بے صبری

کا اظہار کیا کہ انھوں نے ہولی کو تو ایک طرف چھوڑا اور اس کی بجائے اشتعال انگیز اور مجنونانہ فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں نہ صرف بے گناہ راہگیر قتل ہوئے بلکہ شراب کی دوکانیں بھی جلا کر خاکستر کر دی گئیں۔ یہ تشددانہ مظاہرہ چند دن تک قائم رہا اور پھر کہیں جا کر رکا۔ بالآخر وہ زیادہ تر اس وجہ سے رکا کہ مسٹر گاندھی نے قسم کھالی تھی کہ جب تک وہ ختم نہ ہوگا وہ کھانا پینا بند رکھیں گے۔ اس بزرگ نے ان کے پیروؤں کی عظیم الشان بہادرانہ کوششوں میں جان ڈال دی۔ اور انھوں نے فسادات کو دوسرے مقامات میں پھیلنے سے روکنے کی جان توڑ کوششیں شروع کر دیں

لیکن اگرچہ اب ماضی پر نظر ڈالنے سے ان واقعات کی جو فسادات پر ختم ہوئے رفتار کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں رہتا، تاہم اُس وقت خود مہاتما گاندھی کے لئے بھی یہ امر ممکن نہیں تھا کہ وہ اُس غم و غصہ کے جوش کا قبل از وقت اندازہ کر لیں جو زیر سطح آہستہ آہستہ بھڑک کر ایک زبردست آگ کی شکل میں تبدیل ہونیوالا تھا

اُن ایام کی روحانی عظمت نے (جبکہ وہ تقریباً ہر لمحہ اس انقلابی حالت کے پیدا ہو جانے کی توقع کر رہے تھے جس کے ذریعہ سوراج حاصل ہونا) اُنہیں انسانی جذبات کے ان ادنیٰ مظاہرات سے کہیں زیادہ بلند مقام پر پہونچا دیا تھا۔ اُن کے پیروؤں کا جوش جو ہر وقت انہیں گھیرے رہتے تھے، بالکل عدیم المثال تھا۔ بڑے بڑے کام جو معمولی حالات میں کم سے کم ایک نسل میں تکمیل پاتے، ایک دن میں درست کر لئے گئے۔ مثلاً تحریک عدم تعاون کے عین شباب کی حالت میں مہاتما گاندھی کے ایک دورۂ آسام نے وہاں کے حسّاس اور محب وطن اشخاص کے

دلوں میں اس قدر جوش پیدا کر دیا کہ اس کی وجہ سے ان کی افیم کھانے کی خراب عادات جن کا وہ نصف صدی سے شکار ہو رہے تھے، یکقلم چھوٹ گئیں۔ شراب خواری بدکاری اور چھوت اور چھات وغیرہ جیسی خرابیوں کے بارے میں بھی دیگر مقامات میں اسی قسم کے کارنامے معرض تحریر میں لائے جا سکتے ہیں۔ بہر حال اُن عجیب و غریب اور جوش انگیز ایام کے متعلق یہ بات بالکل سچائی کے ساتھ بیان کی جا سکتی تھی کہ معجزات کا دور پھر واپس آگیا ہے۔ کہنہ خرابیاں کسی فوجی طاقت کی آمد کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک رشی کی شریفانہ ڈکیٹر شپ کی بدولت بتدریج ختم ہو رہی تھیں

اسی وجہ سے انہیں وہ فوری اور غیر متوقع صدمہ بہت تلخ معلوم ہوا کیونکہ اس پُرامن اخلاقی اصلاح کا تمام ڈھانچہ عامۃ الناس کی تشدد آمیز اور مجنونانہ حرکات کی بدولت جو پہلے بمبئی میں اور بعد میں چوری چورا میں معرض ظہور میں آئیں، ٹوٹ کر رہ گیا

لیکن اگر ابتدا میں مہاتما گاندھی کا صدمہ باعتبار شدت نہایت سخت اور اپنے فوری اثر کے لحاظ سے تقریباً مفلوج کر دینے والا تھا، تاہم اُن کا اُس سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ نہایت پاکیزہ تھا، کیونکہ ان کی توبہ در تپسیا کا فعل بجائے خود اخلاقی جرأت اور کفارہ ادا کرنے والی قربانی سے مملو تھا ایسی کھلم کھلا توبہ کی راہ میں جس پر وہ قید خانہ میں مُصر تھے۔ اُن کے بعض نہایت پرجوش پیرووں کی طرف سے جو دور دراز مقامات سے آئے تھے قدرے مشکلات پیدا کر دی گئیں۔ انھوں نے اُن پر زور دیا کہ وہ اس قسم کا

ذلت آفرین طریقہ اختیار نہ کریں اور وہ ان کی کمزوری کی وجہ سے اُن سے متنفر ہو گئے لیکن وہ اُس خرابی کا جو پھیل چکی تھی مہاتما گاندھی کی طرح اندازہ کرنے سے بالکل قاصر رہے اور وہ اپنے اندر بہت کم روحانی نگاہ رکھتے تھے

لیکن خدا تعالیٰ مہربان تھا — یہ وہ الفاظ ہیں جو مسٹر گاندھی نے دلی گہرے جذبہ سے متاثر ہو کر تحریر کئے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے انہیں اُس برائی سے جو ابھی تک ان کے دل میں جاگزیں تھی اور جس نے انہیں کمزور بنا دیا تھا دو چار کر دیا تھا۔ کیونکہ مجمع اس وقت بھی اپنے تشدد سے باز نہیں آیا جبکہ وہ باہر نکل کر اس کے درمیان پہونچ گئے۔ اس نے انہیں علیحدہ پھینک دیا۔ اس طرح خود انہی کے ملک والوں نے انہیں بے بس بنا دیا اور ان کی تحریک پر اندر سے کاری ضرب لگ گئی لیکن اسی حالت بیچارگی میں انھوں نے رہائی کے لئے خدا کو پکارا اور ان کی آواز سن لی گئی

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ روحانی دنیا میں انھوں نے جو اپنے نفس پر یہ اخلاقی فتح حاصل کی وہ اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان تھی جو عدم تعاون کی ظاہرا کامیابی سے حاصل ہو سکتی تھی

جیسا کہ شاعر رابندرا ناتھ ٹیگور ایک اور موقع پر کہہ چکے ہیں:۔

"میرے آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں سڑک کے کنارے
اور شکست خوردہ لوگوں کا گیت گاؤں
کیونکہ وہ دلہن ہے جس سے وہ پوشیدہ طور پر محبت کرتا ہے"

اپنی تمام زندگی میں مہاتما گاندھی کبھی بھی اتنی بلندی پر نہیں پہونچے جس

پردہ اپنی آخری قید سے قبل کے ایام میں پہونچ چکے تھے۔ انہیں خود اپنے پیرؤں کے عضہ آمیز طعنے سننے پڑے اور یہ بھی سننا پڑا کہ وہ ایسے وقت میں تحریکِ عدمِ تعاون کا ستیاناس کر رہے ہیں جبکہ وہ اپنی طاقت کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکی ہے۔ خالصتاً سیاسی نقطۂ نظر سے غالباً یہ سب کچھ صحیح تھا۔ مگر روحانی سلطنت میں یہ سب چیزیں بے حقیقت رہ جاتی ہیں

جس اولوالعزمی سے مہاتما گاندھی نے ایک زبردست صورتِ حالات کا مقابلہ کیا ویسی ہی اولوالعزمی ہندوستان کے برطانوی حکام سے ظہور میں نہیں آئی اس لیئے کہ انھوں نے عین اُس موقع سے فائدہ اٹھاکر جبکہ تحریک گڑبڑ کی حالت میں تھی، اس کے لیڈر پر وار کر دیا۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے یہ چال بہت کارگر تھی مگر اس میں بہادری کا شائبہ تک نہ تھا

لیکن اُن تاریک ایام میں بھی جبکہ انسانی جذبات میں زبردست ہیجان پیدا ہو چکا تھا، مقدمہ کی صدارت کرنے والے جج کے طرزِ عمل سے بہادری کا سچا اظہار کیا گیا۔ مجھ سے مہاتما گاندھی کے بعض نہایت گھرے پیرؤں نے جو عدالت میں موجود تھے، تمام واقعہ بیان کیا ہے۔ ٹھیک اُس موقع پر جبکہ آخری نظارہ تقریباً اس قدر درد انگیز ہو گیا تھا کہ اس کا برداشت کرنا انسانی طاقت کے لیئے ناممکن تھا، جج نے سنجیدگی کے ساتھ مگر نہایت پسندیدہ الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا جس میں قیدی کے تقدس اور اس کی شرافت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جواب میں مہاتما گاندھی کے پُراخلاق شکریہ نے سماعت مقدمہ کی کارروائی کو پایۂ اختتام تک پہونچا دیا

میرے لئے یہ سچی اور حقیقی مسرت کا باعث ہے کہ میں نہ صرف اپنے ذاتی بلکہ دوسروں کے تجربہ کی بنا پر بھی یہ لکھنے کے قابل ہوا ہوں کہ کس طرح سے مابعد کے ایک نہایت نازک موقع پر کرنل میڈکؔ[1] نے جو ایک بہت ہی اچھے ڈاکٹر ہیں نہایت نزاکت اور ہوشیاری کے ساتھ بڑی بڑی مشکلات کی موجودگی میں اپنے ہاتھ سے عملِ جرّاحی کیا جس نے بالآخر مہاتما گاندھی کی جان بچائی۔ سیسون ہاسپٹل پونہ میں جہاں آپریشن کیا گیا تھا، جس محبت آمیز حفاظت کے ساتھ میٹرن اور نرس نے خدمت کی ہے، وہ بھی کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ محبت کے ان افعال نے اس زمانہ کی تلخی کو بہت وسیع حد تک دور کرنے میں مدد دی اور سارے ہندوستان نے دوسرے ممالک کے باشندوں کے ساتھ چھ سال کی بجائے دو سال کی قید کے بعد ۱۹۲۴ء میں قیدی کے رہا کر دیئے جانے پر خوشیاں منانے میں ہمنوائی کی

موجودہ باب میں ان کی وہ تحریرات درج کی جاتی ہیں جو فسادات بمبئی کے بعد اور نیز چورا چوری کے فسادات کے بعد معرض تحریر میں لائی گئی تھیں۔ اوّل الذکر درج ذیل ہے:۔

"بمبئی کی شہرت جو میری امیدوں کی آماجگاہ ہے کل داغدار ہو گئی۔ عین اُس وقت جبکہ میں اپنی انتہائی سادگی میں شہریوں کو اشتعال کی موجودگی میں بھی انکے غیر متشدد رہنے پر مبارکباد دے رہا تھا، خود شہزادے کی آمد اور وہ حالات جو طے کردہ تقریبات کی ادائگی سے متعلق ہیں اور پبلک کا وہ روپیہ جو

[1] Col Maddock

ہز رائل ہائینس کو مبارک باد دینے کے سلسلہ میں ضائع کیا گیا ہے، یہ سب ایک ناقابل برداشت اشتعال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے باوجود بھی نے اپنے اوپر قابو رکھا۔ میرے خیال میں یہ امر اس قابل تھا کہ اس کے لئے مبارک باد پیش کی جائے۔ غیر ملکی کپڑے کی ہولی محض ایک مظاہرہ تھا جو یک طرفہ سرکاری مظاہرہ کا طبعی جواب تھا

مجھے کیا معلوم تھا کہ عین اس وقت جبکہ شاہزادہ آراستہ راستوں سے گزر رہا ہوگا۔ اور شہر کے دوسرے حصہ میں غیر ملکی کپڑے کی ہولی منائی جا رہی ہوگی، ملوں کے مزدور مجرمانہ حکم عدولی کرتے ہوئے لوگوں کے سروں سے اُنکی پارسی ٹوپیاں زبردستی چھین لینگے۔ اور بے ضرر یورپینوں پر پتھر پھینکیں گے۔ جوں جوں دن گذرتا گیا۔ مجمع کا جوش بھی جو اپنی ابتدائی کامیابی سے مست تھا، بڑھتا گیا۔ اس نے ٹریم کاروں کو اور ایک موٹر کو جلا دیا۔ شراب کی دو کانوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور دو کو نذر آتش کر دیا

میں نے شورش کا حال ایک بجے کے قریب سنا اور چند دوستوں کی معیت میں فساد زدہ رقبوں میں موٹر پر بیٹھ کر گشت کیا اور اپنی پارسی بہنوں کی ایذا رسانی کی نہایت تکلیف دہ اور شرمناک داستان کو سنا۔ پندرہ سو کے مجمع میں سے جس نے میری گاڑی کو گھیر لیا تھا، کسی ایک نے بھی اس الزام کی تردید نہ کی جبکہ ایک پارسی نے جو غصہ کی وجہ سے آگ بگولا بنا ہوا تھا، کانپتے ہوئے ہونٹوں سے نہایت سنجیدہ الفاظ میں واقعات کو دہرایا۔ ایک معمر پارسی جنٹلمین نے کہا:۔ "مہربانی کر کے ہمیں موالیوں کی اس حکومت سے بچائیے"

اس خبر نے کہ پارسی بہنوں کے ساتھ برا برتاؤ کیا گیا ہے، میرے دل کو چھلنی کر دیا یہ سچ ہے کہ چند پارسی خوش آمدید کی تقریبات میں شامل ہوئے تھے لیکن انہیں حق حاصل تھا کہ وہ اپنی رائے پر قائم رہیں اور انہیں کوئی ایذا نہ پہونچائی جائے سوراج میں کسی دباؤ کی ضرورت نہیں۔ وہ متعصب ملا جو زبردستی ایک ہندو کا تبدیلِ مذہب کراتا ہے، کم سے کم یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ثواب کا استحقاق پیدا کر رہا ہے لیکن عدم تعاون کرنے والا شخص یا اس کا ساتھی جو جبر استعمال کرتا ہے، اپنے جرم کے لئے اس قسم کی کوئی وجہ نہیں رکھ سکتا

جب میں دو ٹانکی پہونچا تو میں نے دیکھا کہ شراب کی ایک دکان ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے۔ پولس کے دو سپاہی بری طرح سے زخمی ہو گئے ہیں اور چارپائیوں پر بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی شخص نہیں۔ میں موٹر سے نیچے اترا۔ مجمع نے فوراً مجھے گھیر لیا اور چلا کر "مہاتما گاندھی کی جے" پکاری۔ یہ آواز میرے کانوں پر ہمیشہ گراں گذرتی ہے لیکن یہ آواز سن کر جتنی تکلیف مجھے اُس دن ہوئی جبکہ مجمع اپنے دو زخمی بھائیوں سے غافل گلے پھاڑ پھاڑ کر آوازے لگا رہا تھا، اتنی کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے اسے سرزنش کی اور وہ خاموش ہو گیا۔ دو زخمی آدمیوں کے لیے پانی لایا گیا۔ میں نے اپنے دو ہمراہیوں اور مجمع کے بعض اشخاص سے درخواست کی کہ وہ ان مرتے ہوئے پولس کے سپاہیوں کو ہسپتال لے جائیں۔ اس کے بعد میں کچھ دور اور آگے بڑھا اور وہاں جا کر یہ نظارہ دیکھا کہ آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ وہاں دو ٹریم کاریں تھیں جس میں مجمع نے آگ لگا دی تھیں۔ میں نے ایک جلتی ہوئی موٹر

گاڑی بھی دیکھی۔ میں نے مجمع سے درخواست کی کہ وہ منتشر ہو جائے، اور اس سے کہا کہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے خلافت، پنجاب اور سوراج کے مقاصد کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ میں جب گھر واپس آیا تو دل میں اگرچہ گھناؤنے واقعات سے سخت تکلیف تھی، مگر طبیعت ایک گونہ ہلکی ہو گئی تھی

پانچ بجے کے قریب چند بہادر سندھی نوجوان یہ اطلاع دینے کے لئے آئے کہ بھنڈی بازار میں مجمع ہر ایسے راہگیر کو ستاتا ہے جس کے سر پر غیر ملکی ٹوپی ہوتی ہے اور اگر وہ اپنی ٹوپی دینے سے انکار کرتا ہے تو اسے بری طرح پیٹا جاتا ہے۔ ایک بہادر بوڑھے پارسی پر جس نے مجمع کا مقابلہ کیا اور اپنی ٹوپی نہیں دی، بری طرح حملہ کیا گیا۔ مولانا آزاد سبحانی اور میں دونوں بھنڈی بازار گئے اور جا کر مجمع کو سمجھایا کہ جو لوگ بے گناہ آدمیوں پر حملہ کرتے ہیں وہ گویا اپنے مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ مجمع نے بظاہر منتشر ہونے کی کوشش کی۔ پولس وہاں موجود تھی لیکن وہ انتہا سے زیادہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے تھی۔ ہم پھر آگے بڑھے۔ واپس ہوتے وقت ہماری دہشت کی کوئی حد نہ رہی جب ہم نے شراب کی ایک دکان کو جلتے ہوئے دیکھا۔ فائر بریگیڈ کے کام میں بھی رخنہ اندازی کی جاتی تھی۔ پنڈت نیکی رام شرما اور دوسرے اصحاب کی کوششیں قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے دکان کے آدمیوں کو تو باہر نکال لیا

مجمع محض بدمعاشوں یا لڑکوں پر مشتمل نہ تھا۔ وہ مجمع ایسا نہ تھا کہ معاملات کو نہ سمجھتا ہو۔ اس میں سب کے سب مزدور ہی نہ تھے۔ وہ خالصتاً ایک ایسا مجمع تھا جس میں ہر قسم کے لوگ شریک تھے اور جو کسی کی بات سننے پر نہ تو آمادہ ہوتا

تھا اور نہ رضامند۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ
کوئی ایک مجمع نہ تھا بلکہ گروہ در گروہ تھا، جس کی تعداد کم سے کم ۲۰ ہزار
ہو گی۔ وہ شرارت کرنے اور تباہی پھیلانے پر تلا ہوا تھا

میں نے سنا کہ گولیاں چلائے جانے کی وجہ سے موتیں واقع ہوگئی ہیں
اور یہ کہ اینگلو انڈین علاقوں میں ہر ایسے والنیٹر کو بری طرح زدوکوب کیا گیا
ہے جس نے اپنے ملک کی بنی ہوئی ٹوپی یا قمیض کو نہیں اتار دیا۔ میں نے سنا کہ ان
میں کے بہت سے اشخاص کو شدید طریقہ سے مجروح کیا گیا ہے۔ میں یہ سطور
چھ ہندو اور مسلمان ورکروں کی موجودگی میں لکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس
حالت میں آئے ہیں کہ ان کے سر پھٹے ہوئے ہیں اور خون بہہ رہا ہے، اور ان
میں سے ایک کی ناک کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور بھی شدید زخم آئے ہیں۔ وہ
مولانا آزاد سبحانی اور مولانا معظم کی رہنمائی میں پریل گئے تھے تاکہ وہ مل کے
مزدوروں کے جذبات کو ٹھنڈا کریں جن کی نسبت اطلاع ملی تھی کہ وہ ٹریم
کاروں کو روکے کھڑے ہیں۔ یہ ورکر اپنی منزل مقصود تک نہ جا سکے اور اپنے
زخموں کے ساتھ واپس آگئے، تاکہ زبان حال سے اپنی حالت بیان کریں

عدم تعاون کرنے والے اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔ یہ سچ ہے کہ
وہ ہر جگہ نہایت خطرات کی حالت میں بھی شرارت کو بند کرنے اور اس کی روک
تھام کرنے کی مسلسل کوششیں کر رہے تھے لیکن یہ سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے
یا ہمیں تشدد کی جواب تک رد نما ہو چکا ہے، ذمہ داری سے بری کرنے کے لئے کافی
نہیں ہے ہمیں دعویٰ ہے کہ ہم نے پر امن ماحول پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ اپنے عدم

تشدد سے لوگوں پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اپنے عدم تشدد کو روکے رکھیں لیکن ہم وہاں ناکام رہے ہیں جہاں ہمیں کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ ہمارے لئے کل کا دن بڑی آزمائش کا تھا۔ ہم نے وعدہ کر رکھا اور اس وعدہ کے بموجب ہم پابند تھے کہ شہزادہ کی شخصیت کو ہر نقصان یا بے عزتی سے محفوظ رکھیں، اور ہم نے اپنے اس وعدہ کو توڑ دیا اس حد تک کہ ہم میں سے کسی نے ایک بھی یورپین کو یا کسی دوسرے شخص کو جس نے شہزادہ کی خوش آمدید میں حصہ لیا، بے عزت یا زخمی کیا۔ وہ خوش آمدید میں حصہ لینے کے اتنے ہی حقدار تھے جتنا ہم اس سے اجتناب کرنے کے۔ میں خود بھی اپنی ذاتی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ کسی دوسرے کے مقابلہ میں میں بغاوت کی اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے زیادہ ذمہ دار ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں اس اسپرٹ کو قابو میں رکھنے یا اسے ضبط میں لانے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مجھے اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ میرے لئے یہ تمام کشمکش مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ میں برت اور دعا پر یقین رکھتا ہوں اور میں تجویز کرتا ہوں کہ میں آیندہ ہر پیر کے دن چوبیس گھنٹے کا برت رکھوں گا اس وقت کہ سوراج حاصل نہ ہو جائے۔"

غالباً اس اپیل کے بعد مشکل سے چار مہینے گذرے ہوں گے کہ تشدد کا دوسرا مظاہرہ چوری چورا کے مقام میں کیا گیا۔ مجمع نے ان لوگوں کی رہنمائی میں جو زور زور سے "مہاتما گاندھی کی جے" پکارا کرتے تھے، چند پولس مینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر انہیں پولس اسٹیشن سمیت نذر آتش کر دیا۔ یہ واقعۂ ہائلہ عین اس وقت معرض ظہور میں آیا جبکہ مہاتما گاندھی وائسرائے کے نام الٹیمیٹم

بھیج چکے تھے جس میں باردولی میں سول نافرمانی شروع کردینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ جب انہیں چوری چوراکی خبر ملی تو انھوں نے فوراً باردولی کی سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کردیا اور اپنے غصہ سے بھرے ہوئے پیروؤں کا مقابلہ کیا۔ اسوقت اُنھوں نے ذیل کا مقالہ تحریر کیا تھا۔

"خدا تعالیٰ مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہے۔ اُس نے مجھے تیسری مرتبہ آگاہ کردیا کہ ابھی تک ہندوستان میں ایسا سچا اور غیر متشدد ماحول پیدا نہیں ہوا جو بجائے خود وسیع پیمانہ پر ایسی نافرمانی کو حق بجانب ٹھہرا سکے جسے سول، شریفانہ، سچی، عاجزانہ ارادی لیکن محبت آمیز جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے کسی صورت میں بھی مجرمانہ اور نفرت انگیز نہیں ہونا چاہیئے

خدا نے ۱۹۱۹ء میں مجھے آگاہ کردیا تھا جبکہ راؤلٹ ایکٹ کے خلاف ایجیٹیشن شروع ہوا تھا۔ میں نے رجعت قہقری کی اور اسے "ہمالیہ جیسی بڑی غلطی" قرار دیا، خدا اور بنی نوع انسان کے آگے میں نے اپنی فروتنی کا اقرار کیا اور نہ صرف وسیع سول نافرمانی کو روک دیا بلکہ خود اپنی نافرمانی کو بھی جو مجھے معلوم ہے محض سول اور غیر متشددانہ ہوتی

دوسری مرتبہ واقعات بمبئی کے ذریعہ خدا نے مجھے ایک خوفناک تنبیہ کی۔ اُس نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنی آنکھوں سے ان افعال کا مشاہدہ کروں جو بمبئی کے مجمع کی بد دلت ۱۷ نومبر کو ظہور میں آئے۔ یہ ذلت ۱۹۱۹ء والی ذلت سے بہت زیادہ شدید تھی لیکن اس سے مجھے فائدہ ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ قوم کو سول نافرمانی ترک کردینے سے فائدہ پہونچا۔ سول نافرمانی ترک کردینے سے یہ معلوم ہوگیا کہ

ہندوستان سچائی اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہے

لیکن تلخ ترین ذلت ابھی پیش آنے والی تھی۔ مدراس نے مجھے تنبیہ کی تھی لیکن میں نے اس کی پرواہ نہ کی لیکن خدا تعالیٰ نے چوری چورا کے ذریعہ صریح الفاظ میں آگاہ کر دیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جو کانسٹبل ایسے بیرحمانہ طریقہ سے موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے، انہوں نے بیحد اشتعال انگیزی کی تھی۔ انھوں نے اپنے وعدہ کو بھی توڑ ڈالا تھا جو انسپکٹر کی طرف سے کیا گیا تھا یعنی یہ کہ انہیں ستایا نہیں جائے گا لیکن جب جلوس گذر گیا تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے اُن کے ساتھ مداخلت کی گئی اور کانسٹبلوں نے انہیں گالیاں بھی دیں۔ اول الذکر نے چلا کر امداد طلب کی۔ مجمع واپس لوٹ آیا۔ کانسٹبلوں نے فائرنگ شروع کر دی اور جو تھوڑا بہت گولی بارود ان کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا اور وہ حفاظت کے خیال سے پولس سٹیشن کے اندر چلے گئے۔ میرے اطلاع دہندہ نے مجھے بتایا ہے کہ اس پر مجمع نے اسٹیشن میں آگ لگا دی۔ کانسٹبل جنھوں نے اپنے آپ کو بند کر لیا تھا، جان بچانے کے لئے باہر نکلے اور جونہی وہ باہر آئے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے جنھیں بعد میں ملتہب شعلوں کی نذر کر دیا گیا

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی عدم تعاون والنٹیر کا اس وحشیانہ واقعہ میں ہاتھ نہ تھا اور یہ کہ مجمع کو نہ صرف فوری اشتعال دیا گیا تھا بلکہ اُسے اُس ضلع میں پولس کے ناروا مظالم کا بھی عام طور پر علم تھا لیکن اشتعال خواہ کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو، میں اُن آدمیوں کے وحشیانہ قتل کو کسی امکانی طریقہ سے حق بجانب نہیں قرار دے سکتا جنھوں نے اپنے آپ کو بالکل بیکس بنا لیا تھا اور ایک اعتبار سے

اپنے آپ کو مجمع کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا اور ایسی حالت میں جبکہ ہندوستان عدم تشدد کا دعویٰ کرے اور عدم تشدد ہی کے ذریعہ آزادی کے تخت پر متمکن ہونے کی آرزو رکھے، مجمع کی جانب سے تشدد کا اظہار خواہ ایسی کارروائی اشتعال ہی کے جواب میں کی گئی ہو ایک بہت برا شگون ہے

بہرحال چوری چورا کا واقعہ مرض کی ایک زبردست علامت ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جن مقامات میں سختی کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے، وہاں ذہنی یا جسمانی تشدد کا اظہار نہیں ہوا۔ میرا عقیدہ صرف یہ ہے کہ اُن علاقوں میں جہاں سختی کی پالیسی زیر عمل ہے، پبلک کی طرف سے جن ناقابلِ التفات واقعات تشدد کا اظہار ہوا ہے وہاں ضرورت سے بہت زیادہ سختی برتی گئی ہے۔ میں ممنوعہ علاقوں میں جلسوں کے ارادی انعقاد کو تشدد نہیں کہتا۔ تشدد سے میری مراد پتھروں کا پھینکنا ہے یا بعض صورتوں میں دھمکی دینا یا ناروا دباؤ ڈالنا ہے۔ درحقیقت سول نافرمانی پر کسی ہیجانی کیفیت کی ضرورت نہیں۔ سول نافرمانی خاموشی سے تکلیف سہنے کی تیاری کا نام ہے۔ اس کا اثر حیرت انگیز ہوتا ہے اگرچہ وہ نمایاں نہیں ہوتا تاہم وہ شریفانہ ضرور ہوتا ہے لیکن میں نے ایک حد تک جوش و خروش کو لازمی خیال کیا اور غیر ارادی تشدد کو بھی ایک خاص حد تک قابلِ معافی سمجھا، بالفاظ دیگر میں نے کسی قدر نامکمل حالات میں بھی سول نافرمانی کو ناممکن العمل خیال نہیں کیا۔ مکمل حالات کے ماتحت اس نافرمانی کا جو سول ہو، بہت کم احساس ہوتا ہے لیکن موجودہ تحریک مسلّمہ ناموافق حالات کے ماتحت ایک خطرناک تجربہ ہے

چوری چورا کا واقعۂ ہائلہ دراصل مستقبل کے لئے شمع ہدایت ہے۔ اس سے
ظاہر ہوجاتا ہے کہ اگر سخت احتیاطی تدابیر عمل میں نہ لائی گئیں تو ہندوستان
آسانی کے ساتھ کون سے راستہ پر گامزن ہوجائے گا۔ ہم سچائی اور عدم تشدد
کا محض زبان سے اقرار کرکے آزادی کی مملکت میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتے
عام سول نافرمانی کا التوا اور ہیجانی کیفیت کا ازالہ مزید ترقی کے لئے
ضروری چیزیں ہیں، بلاشبہ وہ باتیں مزید رجعت کی روک تھام کرنے کی غرض
سے لازمی ہیں۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ ہر کانگریسی (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اس
التوا سے نہ صرف یہ کہ مایوس نہ ہوگا۔ بلکہ وہ جھوٹ اور قومی گناہ کے بوجھ سے
آزادی محسوس کریگا
دشمن کو ہماری ذلت یا مفروضہ شکست پر خوشیاں منا لینے دو۔ یہ بہتر
ہے کہ ہم پر بزدلی اور کمزوری کا الزام لگایا جائے بمقابلہ اس کے کہ ہم پر یہ الزام
عائد کیا جائے کہ ہم اپنی قسم توڑتے ہیں اور خدا کے خلاف گناہ کرتے ہیں دنیا
کے روبرو جھوٹا ثابت ہونا ہزار ہا گنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم خود اپنے
ذات سے جھوٹے بنیں
اور اس لئے میری نظر میں عام سول نافرمانی اور دیگر چھوٹی چھوٹی تحریکات
کا التوا جو ہیجان کو قائم رکھنے کے لئے مقصود تھیں، میرے لئے کافی کفارہ نہیں
ہے، اس امر کا کہ میں ذریعہ بنا ہوں خواہ کتنا ہی غیر ارادی کیوں نہ ہو،
اُس وحشیانہ تشدد کا جو لوگوں کے ہاتھوں چوری چورا میں ظہور میں آیا
ضروری ہے کہ میں اپنے نفس کو اور زیادہ پاکیزہ بناؤں۔ مناسب ہے کہ

پہلے سے زیادہ بہتر آکہ بنوں تاکہ میرے گرد و پیش کے اخلاقی ماحول کا خفیف ترین اختلاف بھی محسوس کیا جا سکے۔ میری دعاؤں میں زیادہ گہری سچائی اور فروتنی ہونی چاہیئے بمقابلہ اس کے جو آج ظاہر ہو رہی ہے اور میرے لئے برت سے زیادہ جس کے ساتھ ضروری ذہنی تعاون بھی ہوگا، کوئی چیز امداد دینے والی اور اندرونی پاکیزگی پیدا کرنے والی نہیں ہے

میں جانتا ہوں کہ ذہنی روش ہی سب کچھ ہے۔ ٹھیک جس طرح سے کہ پرارتھنا پرندے کی گیت کی طرح محض ایک میکانیکل چیز بن سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح برت بھی جسم کے لئے محض ایک میکانیکل تکلیف قرار پا سکتا ہے لیکن جو مقصود پیش نظر رکھا گیا ہے، اس کے لئے ایسی میکانیکل ترکیبیں بالکل بے معنی اور بیکار ہیں

لیکن جو برت دلی جذبات کے اظہار کے لئے، نفس پر روح کی حکومت کے حصول کے لئے اختیار کیا جائے، وہ شخص متعلق کے ارتقا میں ایک نہایت طاقتور عنصر ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا گہرے غور و خوض کے بعد میں اپنے لئے پانچ دن کا مسلسل روزہ تجویز کرتا ہوں جس میں مجھے صرف پانی پینے کی اجازت ہوگی۔ وہ اتوار کی شام کو شروع ہوگا اور جمعہ کی شام کو ختم ہو جائیگا۔ مجھے کم سے کم اتنا ضرور کرنا چاہیئے

میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا بھی خیال کر لیا ہے جو میرے سامنے منعقد ہو رہی ہے۔ مجھے اس تکلیف کا بھی احساس ہے جو پانچ دن کا برت رکھنے سے بہت سے دوستوں کو پہونچے گی، لیکن میں اب کفارہ کو نہ تو زیادہ

مدت کے لیے ملتوی کر سکتا ہوں اور نہ اس میں کسی قسم کی کمی کر سکتا ہوں

میں اپنے رفقائے کار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری تقلید نہ کریں ان کے معاملہ میں بنیادی تحریک بالکل مفقود ہے۔ وہ سول نافرمانی کے بانی نہیں ہیں۔ میری ناخوشگوار پوزیشن اس سرجن کی سی ہے جو ایک مسلمہ خطرناک مریض کو ہاتھ میں لینے کے لئے مہارت اور اہلیت نہ رکھے

مجھے امید ہے کہ کارکن شرارت کرنے والوں کا پتہ لگانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے اور ان پر زور دیں گے کہ وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں۔ لیکن خواہ قاتل میری نصیحت قبول کریں یا نہ کریں میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے سوراج کی تحریکات کو نہایت شدید نقصان پہونچایا ہے میں ان سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تحریک تشدد کو چھپانے یا اس کی تیاری کرنے کے لئے پردہ کا کام دینے کی غرض سے جاری نہیں کی گئی ہے۔ میں بہر حال ہر ذلت، ہر عذاب، ذات برادری سے کلی اخراج حتی کہ موت بھی برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں اس کوشش میں کہ میں تحریک کو تشدد بننے یا تشدد کی ابتدا کرنے سے روک دوں۔ میں کفارہ بھی علانیہ ادا کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں قیدیوں کے ساتھ ان کی قسمت میں شریک ہونے کے موقع سے اپنے آپ کو محروم کر رہا ہوں

عدم تشدد پر قائم رہنے والے عدم تعاونی صرف اس وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ وہ ہندوستان کے بدمعاشوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے بالفاظ دیگر جبکہ موخر الذکر بھی حب الوطنی یا مذہب کے تقاضہ کی بنا پر اپنی تشدد انہ

کارروائیوں سے اجتناب کرنا سیکھ لیں گے۔ کم سے کم اس وقت تک کے لئے کہ عدم تعاون کی تحریک جاری رہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوری چورا کے دردناک واقعات نے مجھے بالکل چونکا دیا

'لیکن اس اعلان کے بارے میں کیا کہتے ہو جو تم نے والیسرائے کے نام بھیجا تھا اور اس جواب الجواب کے بارے میں بھی جو والیسرائے کے بیان کے جواب میں شائع کیا گیا تھا؟' شیطان نے پوچھا۔ (وہ ذلت کا تلخ ترین پیالہ تھا جو پینا پڑا) 'یقیناً حکومت کو شاندار دھمکیاں دینے اور اہالیانِ باردولی سے مواعید کرنے کے دوسرے دن ہی اسے واپس لے لینا نہایت بزدلی کی بات ہے۔' اسطرح سے شیطان نے دعوت دی کہ میں سچائی اور پھر مذہب سے انکار کردوں اور بالآخر خدا کا بھی انکاری بن جاؤں۔ میں نے ورکنگ کمیٹی کے روبرو اور اُن دوستوں کے روبرو جو میرے نزدیک تھے، اپنے شکوک اور مشکلات پیش کیں۔ ابتدا میں ان سب نے میرے ساتھ اتفاق رائے نہیں کیا۔ غالباً ان میں سے بعض اب تک میرے ساتھ اتفاق رائے نہیں کرتے۔ لیکن کسی آدمی کو ایسے رفقائے کار نہ ملے ہونگے جیسے خدا تعالیٰ نے مجھے عطا کئے ہیں جو نہ صرف جذبات کا لحاظ کرنیوالے ہیں بلکہ معاف بھی کر دینے والے ہیں! انھوں نے میری مشکل کا اندازہ لگا لیا اور نہایت صبر کے ساتھ میرے دلائل کو سنا۔ اب نتیجہ آپکے سامنے ہے۔ جو ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی شکل میں ہے۔ تقریباً سارے کے سارے جارحانہ پروگرام کی ایسی سختی کے ساتھ تنسیخ ممکن ہے کہ سیاسی اعتبار سے نامعقول یا غیر دانشمندانہ ٹھہرائی جائے۔ لیکن اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ بالکل معقول ہے؛ اور میں مشککین کی خدمت میں عرض کرنا

چاہتا ہوں کہ میری تذلیل اور اقرارِ غلطی سے ملک کو فائدہ پہونچیگا

جس نیکی کا میں دعویدار ہو سکتا ہوں وہ سچائی اور عدم تشدد ہے ما فوق الفطرت طاقتیں رکھنے کا میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مجھے انکی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ویسا ہی خراب جسم ہے جو میرے ہمجنس انسانوں میں سے کمزور ترین فرد کے پاس ہے اور اسلئے میں ہر شخص کی طرح غلطی کر سکتا ہوں۔ میری خدمات میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے اب تک کوتاہیوں کے باوجود ان کو نوازا ہے

کیونکہ غلطی کا اقرار ایک جھاڑو کی مانند ہے جو کوڑے کرکٹ کو لیجاتا ہے اور سطح کو پہلے سے زیادہ صاف کر دیتا ہے۔ اس اقرار سے میں اپنے آپکو زیادہ طاقتور محسوس کرتا ہوں لیکن اس رجعت قہقری کے باوجود پیش نظر مقصد کی کامیابی یقینی ہے۔ سیدھے راستہ سے مسلسل انحراف کرنے سے کبھی کوئی شخص منزلِ مقصود کو نہیں پہونچا "

مہاتما گاندھی کے اس فعل کا فوری نتیجہ نہایت گہری مایوسی و ہراس کی شکل میں نکلا لیکن ان کے قریب ترین دوست جو ان کے خیالات سے بہت اچھی طرح سے واقف تھے مطلق پریشان اور ہراساں نہیں ہوئے۔ تمام ملک میں مایوسی کا دور دورہ تھا جو ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ جب میں نے اس موقع پر دیہات کا چکر لگایا تو میں نے دیکھا کہ مایوسی دیہات اور شہروں میں یکساں طور پر جاری و ساری ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ٹھیک اس موقع پر حکومت نے اپنا وار کیا۔ اس الزام میں کہ "ینگ انڈیا" کے بعض مضامین نے بد دلی پھیلائی ہے۔ اور مہاتما گاندھی گرفتار کر لئے گئے

باب ہفدہم

مقدمہ اور قید

مقدمہ

مہاتما گاندھی نے جو کچھ اتنی مرتبہ ایسے آسان طریقہ سے کہنے کی کوشش کی تھی اس کی تصدیق اُن الفاظ سے ہوجاتی ہے جو انھوں نے اپنے مقدمہ کے موقع پر ادا کیے تھے، جبکہ انہیں "بد دلی" پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا تھا، اور اُن کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا

انھوں نے اپنے مجرم ہونے کا فوراً اقرار کرلیا اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ وہ نظام سلطنت جس نے اس قدر نقصان پہونچایا ہے، اب اس قابل نہیں رہا کہ اُس کے ساتھ محبت کی جائے۔ ان کے بیان میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ یہ ہے کہ اُن دو سالوں کے دوران میں جبکہ تحریک عدم تعاون جاری رہی، نظام سلطنت کے خلاف اُن کے الزام کا مرکز پنجاب کے مظالم اور مسلمانوں کے ساتھ بد عہدی سے ہٹ کر صرف ایک الزام یعنی غربا پر ظلم کیجانب منتقل ہو گیا تھا

سنہ ۱۹۲۱ء میں اس زمانہ میں جبکہ تحریک عدم تعاون اپنے شباب پر تھی اور اس کی کامیابی ہر طرح سے یقینی سمجھی جاتی تھی، مسٹر گاندھی نے علانیہ طور پر اعلان کیا تھا کہ اگر نظام سلطنت "افلاس" کا سوال اپنے ہاتھ میں لیلے اور کاتنے اور بننے

جیسی گھریلو صنعتوں کی دل کے ساتھ ترویج کرے اور ساتھ ہی شراب اور نشّی ادوّیہ کی مجرمانہ تجارت کا خاتمہ کردے تو وہ اسے تبدیلی دل کی علامت متصور کریں گے حکام کی توجہ بار بار ان امور کی جانب مبذول کی گئی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا

مقدمہ بجائے خود نہایت جاذب توجہ تھا، نہ صرف قیدی کی عظمت کی وجہ سے بلکہ جج کے شریفانہ کلمات کے سبب بھی جس نے فیصلہ صادر کیا تھا۔ اُس دَور کی بہت کچھ تلخی جج کی تقریر کی بدولت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ قید اور مقدمہ کے دوران میں مَیں ریلوے کے اُن مزدوروں کے ساتھ رہا کرتا تھا جنھوں نے ٹونڈلہ میں ہڑتال کر رکھی تھی۔ فرائضِ عامہ کے باعث میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ میں بذاتِ خود مقدمہ میں شرکت کر سکوں۔ مہاتما گاندھی نے مجھے خط کے ذریعہ تاکید کردی تھی کہ اُن کی خاطر میں فرائضِ عامہ سے غفلت نہ برتوں اور اپنے متعلق یہ لکھا تھا کہ "میں پرندہ کی طرح ہشاش بشاش ہوں"[1]۔ قید میں جانے سے بیشتر جو طویل ہدایات انھوں نے حکیم اجمل خاں کے نام تحریر کی تھیں، اُس میں انھوں نے زیادہ تر ہندو مسلم اتحاد[2] کے لئے اپنی دلی آرزو کا اظہار کیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں اپنی رہائی کے بعد اِن دونوں مذاہب کے مابین فسادات کے سلسلہ کا آغاز ہو گیا جس نے انہیں سب سے زیادہ رنج پہونچایا جو بالآخر دہلی میں اُن کے طویل برت پر انجام پذیر ہوا۔ مقدمہ کے سلسلہ میں جو بیان انھوں نے دیا وہ حسبِ ذیل ہے:۔

"اس سے پہلے کہ میں اپنا بیان پڑھوں میں اس امر کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ

[1] دیکھو ضمیمہ نہم

[2] دیکھو ضمیمہ دہم

میں فاضل ایڈووکیٹ جنرل کے ریمارکس کی لفظ بلفظ تصدیق کرتا ہوں جو مجھ خاکسار کے متعلق عرض کئے گئے ہیں۔ یہ میرا بہت ہی تکلیف دہ فرض ہے لیکن مجھے اس فرض کو سجالانا ہے۔ اس لئے کہ میں اس ذمہ داری سے واقف ہوں جو میرے کندھوں پر پڑی ہوئی ہے! اور میں اس تمام الزام کی تصدیق کردینی چاہتا ہوں جو فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے بمبئی، مدراس اور چوری چورا کے حادثات کے بارے میں مجھ پر عائد کیا ہے۔ ان پر عمیق غور و خوض اور ہر رات کو ان پر غور کرتے سو جانے کے بعد میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں چوری چورا کے شیطنت آمیز جرائم یا بمبئی کے مجنونانہ مظالم سے اپنے آپ کو الگ کرلوں۔ فاضل ایڈووکیٹ جنرل کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ ذمہ دار شخص کی حیثیت سے، ایسے آدمی کی حیثیت سے جو تعلیم سے اچھی طرح بہرہ ور ہو، جسے اس دنیا کے تجربہ کا وافر حصہ ملا ہو، مجھے اپنے افعال میں سے ہر ایک کے نتائج کا علم ہونا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں آگ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے خطرناک تجربہ کیا تھا اور اگر مجھے رہائی ملی تو میں پھر ویسا ہی کروں گا۔ میں نے آج صبح یہ بات محسوس کی ہے کہ میں اپنے فرض کی ادائگی سے قاصر رہوں گا اگر میں وہ بات نہ کہوں جو میں نے ابھی ابھی بیان کی ہے

میں تشدد کو رد کرنا چاہتا تھا اور اب بھی رد کرنا چاہتا ہوں۔ عدم تشدد میرے ایمان کا پہلا جزو ہے۔ نیز یہ میرے مذہب کا آخری جزو ہے لیکن مجھے دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے یا تو ایسے نظام کے سامنے جس سے میرے خیال میں میرے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا یا ہے سرتسلیم خم کرنا تھا

یا اپنے ہم ملکیوں کے مجنونانہ غصہ کے خطرہ کو برداشت کرنا تھا جس کا مظاہرہ یقینی تھا بعد اس کے کہ وہ میرے منہ سے سچائی معلوم کر لیتے۔ میں واقف ہوں کہ میرے ہم ملک سے کبھی کبھی مجنونانہ حرکات ضرور سرزد ہوئی ہیں مجھے اس کا بہت افسوس ہے اور اس لئے میں یہاں کسی ہلکی سزا کی بجائے انتہائی سزا قبول کرنے پر تیار ہوں۔ میں رحم کا ملتجی نہیں ہوں۔ اور نہ میں کوئی ایسی بات پیش کرنی چاہتا ہوں جس سے میرا جرم ہلکا معلوم ہو۔ لہٰذا میں یہاں پر سخت سے سخت سزا کو دعوت دیتا ہوں (اور میں اسے بصد خوشی قبول کر دوں گا) جو مجھے دی جا سکتی ہے اس فعل کے لئے جو قانونی اصطلاح میں ارتکاب جرم بالارادہ کے نام سے موسوم ہے اور جو میرے نزدیک ہر شہری کا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ لہٰذا جناب جج! آپ کے لئے جو واحد راستہ کھلا ہوا ہے وہ جیسا کہ میں اپنے بیان میں کہنے والا ہوں، یہ ہے کہ یا تو آپ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں یا میرے لئے سخت ترین سزا تجویز فرمائیں بشرطیکہ آپ کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ نظام اور قانون جس کے عملدرآمد میں آپ اعانت فرما رہے ہیں، عامۃ الناس کے لئے فائدہ رساں ہے مجھے اس قسم کی تبدیلی خیال کی کوئی توقع نہیں لیکن اس وقت کہ میں اپنا بیان ختم کروں، شاید آپ اس امر کا اندازہ لگا لیں گے کہ وہ کیا چیز ہے جو میرے سینہ میں موجزن ہے جس کی وجہ سے میں یہ سخت ترین قسم کا مجنونانہ خطرہ برداشت کر رہا ہوں جس کا ایک صحیح الدماغ آدمی متحمل ہو سکتا ہے

غالباً یہ میرا فرض ہے کہ میں ہندوستانی پبلک اور انگلستان کی پبلک کے اطمینان کے لئے اس امر کی تشریح کر دوں کہ میں کس طرح سے ایک پکے وفادار

اور موالاتی سے سخت ترین بد دلی پھیلانے والا اور تارکِ موالات بن گیا۔ عدالت کے روبرو بھی میں بیان کروں گا کہ میں نے ہندوستان میں از روئے قانون قائم شدہ حکومت کے خلاف بد دلی پھیلانے کے الزام کا اقرار کیوں کر لیا ہے

میری پبلک زندگی ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ میں ناخوشگوار حالات میں شروع ہوئی۔ انگریزی حکام کے ساتھ میرا پہلا سابقہ مسرت بخش نہ تھا۔ میں نے معلوم کر لیا کہ انسان اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے مجھے کوئی حقوق حاصل نہیں ہیں کیونکہ میں ہندوستانی ہوں

لیکن میں مطلق ہراساں نہیں ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نظامِ سلطنت کا حقیقی جزو نہیں اور یہ کہ وہ نظامِ سلطنت اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا بلکہ اس کا بیشتر حصہ اچھا ہے۔ میں نے حکومت کے ساتھ رضا کارانہ طور پر اور دل سے موالات کی اور جب کبھی میں نے اُسے قصور وار پایا اس پر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی بھی کی لیکن میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ وہ تباہ و برباد ہو جائے

بعد ہٗ جب سلطنت کی ہستی ۱۸۹۹ء میں بوئروں کے اعلانِ جنگ سے خطرہ میں پڑ گئی اس وقت میں نے اسے اپنی خدمات پیش کیں، ایک رضاکارانہ ایمبولینس کور بنائی اور چند معرکوں میں جو لیڈی اسمتھ میں امداد پہونچانے کے سلسلہ میں پیش آئے تھے، خدمات انجام دیں۔ اسی طرح ۱۹۰۶ء میں بغاوت زولو کے موقع پر میں نے اسٹریچر اٹھانے والی جماعت بنائی جو تا اختتامِ بغاوت خدمت کرتی رہی۔ ان دونوں موقعوں پر مجھے تمغہ جات ملے اور مراسلات میں بھی

میرا ذکر کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے کام کے سلسلہ میں مجھے لارڈ ہارڈنگ نے قیصر ہند گولڈ میڈل عنایت فرمایا۔ جب سنہ ۱۹۱۴ء میں انگلستان اور جرمنی کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی، تو اس وقت میں نے لندن میں ایک رضاکارانہ ایمبولینس کور بنائی جو اُس زمانہ کے لندن کے مقیم ہندوستانیوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تعداد طلبا کی تھی۔ حکام نے اس کے کام کی تعریف کی اور اسے قیمتی قرار دیا۔ آخر میں ہندوستان میں لارڈ چیمسفورڈ نے سنہ ۱۹۱۸ء میں دہلی کی وار کانفرنس میں رنگروٹوں کی بھرتی کے لئے خاص اپیل کی تو میں نے اپنی صحت کو نقصان پہونچا کر کیرا میں ایک کور مرتب کرنے کی جد وجہد کی اور رنگروٹ بھرتی کئے جا رہے تھے کہ جنگ ختم ہو گئی اور احکام موصول ہو گئے کہ اب رنگروٹوں کی ضرورت نہیں رہی۔ خدمت کرنے کی ان تمام کوششوں میں جو چیز مجھے اکساتی رہی وہ یہ یقین تھا کہ ایسی خدمات کے ذریعہ یہ امر ممکن ہے کہ اپنے اہل ملک کے لئے سلطنت میں مساوات کا درجہ حاصل کر لیا جائے۔

پہلا دھچکہ راؤلٹ ایکٹ کی شکل میں پہونچا جس کا مقصد یہ تھا کہ باشندوں کو ہر قسم کی حقیقی آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ میں نے اپنا فرض محسوس کیا کہ اس کے خلاف شدید قسم کا ایجیٹیشن کیا جائے۔ اس کے بعد پنجاب کے مظالم وقوع میں آئے جن کی ابتدا جلیانوالے باغ کے قتل عام سے شروع ہوئی اور جو رینگنے کے احکام، علانیہ سزائے تازیانہ اور دیگر ناقابل بیان ذلتوں پر منتج ہوئے میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ وزیر اعظم نے مسلمانانِ ہندوستان کو ٹرکی اور اسلام کے مقدس مقامات کی صیانت کے بارے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا ہوتا نظر

ہنیں آتا لیکن دوستوں کی پیش گوئیوں اور ان کی سنجیدہ تنبیہوں کے باوجود میں نے ۱۹۱۹ء امرتسر کانگریس میں موالات رکھنے اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کو قبول کرانے کی سخت کوشش کی، اس امید میں کہ ہندوستانی مسلمانوں سے کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا تھا، وزیر اعظم اسے پورا کریگا یہ کہ پنجاب کے زخم کا اندمال کیا جائے گا اور یہ کہ اصلاحات اگرچہ وہ ناکافی اور ناقابل اطمینان تھیں، ہندوستان کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے والی ثابت ہوں گی

لیکن ساری توقعات پر پانی پھر گیا۔ وعدہ خلافت پورا ہنیں ہوا پنجاب کے جرم کی پردہ پوشی کی گئی اور نہ صرف یہ کہ مجرموں کو سزا ہنیں ملی، بلکہ ان میں سے اکثر ملازمت پر برقرار رہے اور ہندوستان کے خزانہ سے برابر پنشن پاتے رہے اور بعض صورتوں میں انہیں انعامات بھی دئے گئے۔ نیز میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اصلاحات نہ صرف یہ کہ وہ دل کی تبدیلی کا مظہر نہ تھیں بلکہ وہ ہندوستان کی دولت کو اور زیادہ گھسیٹ لے جانے اور ہندوستان کی غلامی کو طول دینے کا ذریعہ تھیں

میں نہایت بے دلی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچا کہ برطانوی تعلق نے ہندوستان کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے پہلے سے زیادہ بےکس و مجبور بنا دیا ہے۔ ایک غیر مسلح ہندوستان کسی حملہ آور کے خلاف تاب مقاومت ہنیں رکھ سکتا تا وقتیکہ اس کی خواہش ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی مسلح جنگ میں مصروف ہو۔ یہ حالت اس درجہ زبون ہے کہ ہمارے بعض بہترین اشخاص خیال کرنے لگے ہیں کہ ابھی کئی صدیوں کی ضرورت ہے اس سے پیشتر کہ ہندوستان ڈومنین اسٹیٹس حاصل کرے۔ وہ

اس قدر غریب ہوگیا ہے کہ اب اُس میں مخطوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہی
انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان اپنی لکھو کھا جھونپڑیوں میں اپنا سوت کاتتا تھا اور اپنا کپڑا خود بنتا تھا اور اس اضافہ کی لےسے اپنے قلیل ذرائع آمدنی کو بڑھانے کی ضرورت تھی۔ یہ گھریلو صنعت جو ہندوستان کی زندگی کے لئے اس قدر جان بخش ہے، ایسے ظالمانہ اور غیر انسانی طریقوں کے ذریعہ جن کا بظاہر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، تباہ و برباد کر دی گئی ہے جیسا کہ خود انگریز گواہوں نے بیان کیا ہے
شہر کے رہنے والے کیا جانیں کہ کس طرح سے ہندوستان کے نیم فاقہ زدہ عامۃ الناس آہستہ آہستہ بے جان کئے جا رہے ہیں؟ انہیں کیا معلوم کہ اُن کا تکلیف دہ آرام نام ہے اس دلّالی کا جو انہیں اس کام کے لئے ملتی ہے جسے وہ غیر ملکی تاجروں کے لئے انجام دیتے ہیں؟ انہیں اس کا کیا علم کہ ہندوستان کی ازروئے قانون قائم شدہ حکومت عامۃ الناس کو لوٹنے کے لئے قائم ہے؟ بہت سے دیہات میں اِن آنکھوں کو جو انسانی ڈھانچے دکھائی دیتے ہیں وہ بجائے خود ایسی شہادت ہیں جس کی توجیہ نہ تو صداقت نما کذب سے اور نہ الفاظ کے طلسم سے کی جا سکتی ہے۔ مجھے ذرّہ برابر شبہ نہیں کہ انگلستان نیز ہندوستان کے شہروں کے رہنے والوں کو انسانیت کے خلاف اس جرم کا بشرطیکہ ہمارے اوپر کوئی خدا ہو جواب دینا ہوگا جو غالباً تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے
اس ملک کا قانون بھی غیر ملکی تاجروں کی فائدہ رسانی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پنجاب کے مارشل لا کے مقدمات کا جو غیر جانبدارانہ مطالعہ میں

نے کیا ہے، اس سے میں اس یقین پر پہونچا ہوں کہ ۹۵ فی صدی سزائیں کلیتاً درست نہ تھیں۔ ہندوستان میں سیاسی مقدمات کا جو تجربہ مجھے حاصل ہے اس کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہر دس سزا یافتہ اشخاص میں سے نو آدمی بالکل بے گناہ ہوتے ہیں۔ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی عدالتوں میں سو میں سے ننانوے صورتوں میں ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کے مقابلہ میں کوئی انصاف نہیں کیا جاتا

جو تصویر میں نے پیش کی ہے، وہ مبالغہ آمیز نہیں کہی جا سکتی۔ یہ تقریباً ہر اُس ہندوستانی کا تجربہ ہے جسے ایسے مقدمات سے واسطہ پڑ چکا ہے میری رائے میں قانون کے نظم و نسق کو اِن باتوں سے نہایت ذلیل بنا دیا گیا ہے خواہ ارادۃً خواہ بلا ارادہ، صرف اس لئے کہ لوٹنے والوں کو فائدہ پہونچے

اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ انگریز اور ان کے وہ ہندوستانی رفقائے کار جو ملک کے نظم و نسق میں اُن کے شریک ہیں، اس امر سے واقف نہیں ہیں کہ وہ اُس جرم کے ارتکاب میں مشغول ہیں جس کی صراحت کی میں نے کوشش کی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے انگریز اور ہندوستانی افسران ایمانداری کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جس نظامِ سلطنت کے چلانے میں وہ امداد دے رہے ہیں وہ دنیا کے بہترین نظاموں میں سے ایک ہے اور یہ کہ ہندوستان اس کے ماتحت استقلال مگر آہستگی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ ایک پُر پیچ اور نازک لیکن خوف بٹھانے کے موثر نظام نے جس کے ساتھ ایک طرف طاقت کا مکمل مظاہرہ ہے اور دوسری طرف انتقامی یا مدافعانہ حملہ تو توں کی

محرومی ہے، باشندوں کو کمزور بنادیا ہے اور ان میں تصنع کی عادت ڈالدی ہے۔ اس تباہ کن عادت نے حکام کی جہالت اور خود فریبی میں اور اضافہ کردیا ہے

دفعہ ۱۲۴ الف جس کے ماتحت خوش قسمتی سے مجھ پر الزام لگایا گیا ہے، غالباً تعزیرات ہند کی سیاسی دفعات میں اہم ترین ہے اور اس کا مقصد ایک شہری کی آزادی کو دبانا ہے۔ محبت قانون کے ذریعہ نہ تو پیدا کی جا سکتی ہے، اور نہ اسے قاعدہ کے ماتحت لایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کے دل میں کسی دوسرے شخص یا نظام کے لئے محبت موجود نہیں ہے تو اسے کامل آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی عدم محبت کا ثبوت دیتا رہے اس وقت تک کہ وہ تشدد پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترقی نہ دے یا اس کی ترغیب نہ دے۔ لیکن جس دفعہ کے ماتحت مسٹر بینکر اور مجھ پر الزام عائد کیا گیا ہے ایک ایسی دفعہ ہے جس کے ماتحت محض عدم بد دلی کو ترقی دینا ہی جرم ہے۔ میں نے بعض مقدمات کا مطالعہ کیا ہے جو اس دفعہ کے ماتحت چلائے گئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان کے بعض محبوب ترین محبانِ وطن کو اس کے ماتحت سزائیں ملی ہیں۔ اس لئے میں اپنے آپ کو خوش سمجھتا ہوں کہ مجھ پر بھی اسی دفعہ کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا ہے

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ ان وجوہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو میری بد دلی کا باعث ہوئے ہیں۔ مجھے کسی واحد حاکم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے اور حضور ملک معظم کی ذاتِ شاہانہ سے تو مجھے کسی قسم کی بد دلی ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر میں ایسی حکومت کے بارے میں بد دل ہونا نیکی سمجھتا ہوں جس نے

مجموعی طور پر ہندوستان کو ہر سابقہ نظام حکومت کے مقابلہ میں زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ اور میرے لئے یہ امر فخر و مباہات سے کم نہیں کہ میں وہ مختلف مضامین لکھنے کے قابل ہوا جو میرے خلاف شہادت میں پیش کئے گئے ہیں

درحقیقت میرا اعتقاد ہے کہ میں نے ہندوستان اور انگلستان دونوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے یہ دکھا کر کہ ترک موالات کے ذریعہ ہم اس غیر قدرتی حالت سے باہر نکل سکتے ہیں جس میں فی الحال دونوں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میری حقیر رائے میں ایسا ترک موالات جس کے ہمراہ برائی ہو، ویسا ہی انسانی فرض ہے جیسا کہ موالات جس کے ہمراہ نیکی ہو۔ میں اپنے اہل ملک کو یہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ متشدد و ترک موالات برائی کو کئی گنا زیادہ کر دیگا اور چونکہ ایک برائی کو نہ صرف تشدد کے ذریعہ ہی قائم رکھا جا سکتا ہے، لہٰذا برائی کی اعانت کو واپس لے لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تشدد سے کلیتاً بری رہیں

عدم تشدد میں یہ چیز شامل ہے کہ اس سزا کو بخوشی قبول کیا جائے۔ جو برائی پر منتج ہونے والے ترک موالات کے لئے دی جائے۔ لہٰذا میں یہاں پر موجود ہوں کہ سخت سے سخت سزا کو دعوت دوں اور اسے بخوشی قبول کر دں جو مجھ کو دی جا سکتی ہے اُس فعل کے لئے جو قانونی اصطلاح میں ارتکاب جرم بالارادہ کے نام سے موسوم ہے اور جو میرے نزدیک ہر شہری کا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ آپ کے لئے جو واحد راستہ کھلا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو آپ اے جج، آپ کے لئے جو واحد راستہ کھلا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو آپ مستعفی ہو جائیں اور اس طرح سے اپنے آپ کو برائی سے الگ تھلگ کر لیجئے وددو

آپ یہ محسوس کریں کہ جس قانون پر عملدرآمد کرنے کے لئے آپ طلب کئے گئے ہیں وہ مجسم برائی ہے اور یہ کہ میں درحقیقت بالکل بے گناہ ہوں، یا میرے لئے سخت ترین سزا تجویز فرمائیں بشرطیکہ آپ کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ نظام اور وہ قانون جس کے چلانے میں آپ اعانت فرما رہے ہیں اس ملک کے باشندوں کے لئے فائدہ رساں ہے اور یہ کہ میری جد و جہد اس بنا پر مفادِ عامہ کے لئے نقصان رساں ہے''

اس کے بعد جج نے اپنا فیصلہ سنایا جو درج ذیل ہے:۔

مسٹر گاندھی! ایک لحاظ سے آپ نے میرے کام کو آسان تر کر دیا ہے کہ آپ نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ تاہم جو چیز اب باقی رہتی ہے یعنی منصفانہ سزا کی تعیین، وہ غالباً اتنی ہی مشکل چیز ہے جتنی اس ملک میں کسی جج کو پیش آسکتی ہے۔ قانون اشخاص کا احترام نہیں کرتا۔ اس کے باوجود اس امر کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے کہ آپ ہر اس شخص سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں جس کے مقدمہ کی سماعت میں کر چکا ہوں یا کبھی آیندہ کروں گا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے کہ آپ اپنے کروڑہا اہلِ ملک کی نظر میں ایک بہت بڑے محبِ وطن ہیں اور ایک بہت بڑے لیڈر ہیں وہ لوگ بھی جو سیاسیات میں آپ سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، آپ کو اعلیٰ مقاصد رکھنے والا شخص خیال کرتے ہیں مجبوراً ... کو خوش ... بتے ہیں کہ آپ کی زندگی بہت شریفانہ اور مقدس ہے

مگر مجھے صرف ایک پہلو سے آپ پر نظر ڈالنی ہے۔ یہ میرا فرض منصبی نہیں ہے جو میری ... نہیں ہے اور ... اس کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کسی اور پہلو سے آپ پر نظر ڈالوں یا نکتہ چینی کر نہیں سکتا ... فرض صرف اتنا ہے کہ میں آپ کو ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جانچوں، جو

قانون کے ماتحت ہے جس نے خود اپنے منہ سے اقرار کیا ہے کہ اس نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو ایک معمولی شخص کے لئے سلطنت کے خلاف اہم سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اسے فراموش نہیں کرتا کہ آپ نے مسلسل تشدد کے خلاف پرچار کیا ہے اور یہ کہ آپ نے بہت سے مواقع پر (جیسا کہ میں یقین کرنے کے لئے تیار ہوں) تشدد کی روک تھام کرنے کے لئے بہت کچھ کوششیں کی ہیں۔ لیکن آپ کی سیاسی تعلیم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اور ان اشخاص کی فطرت کا اندازہ کرتے ہوئے جو اس کے مخاطب تھے، میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آپ کس طرح سے مسلسل طور پر یہ یقین رکھ سکتے تھے کہ اس کا لازمی نتیجہ تشدد کی شکل میں نہیں نکلے گا؟

ہندوستان میں غالباً بہت کم اشخاص ایسے ہیں جو سچائی کے ساتھ اس امر پر افسوس نہ کرتے ہوں کہ آپ نے ہر کسی حکومت کے لئے یہ امر ناممکن بنا دیا ہے کہ وہ آپ کو آزاد چھوڑے رکھے لیکن واقعہ بھی یہی ہے۔ میں یہ جانچنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مفادِ عامہ کی حفاظت میں آپ کو کس قدر سزا ملنی چاہئے۔ اور میں فیصلہ صادر کرتے وقت اُس مقدمہ کی مثال کی پیروی کرنا چاہتا ہوں جو کئی امور میں زیرِ بحث مقدمہ سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کا فیصلہ بارہ سال قبل ہوا تھا میری مراد بال گنگا دھر تلک کے مقدمہ سے ہے اور جو اسی دفعہ کے ماتحت کیا گیا تھا۔ جو سزا اُن کے لئے تجویز ہوئی تھی وہ اپنی آخری شکل میں چھ سال کی قیدِ محض کی سزا تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے غیر معقول تصور نہ کریں گے کہ آپ کے ساتھ بھی مسٹر تلک کا سا سلوک روا رکھا جائے یعنی یہ کہ ہر الزام کے لئے دو دو

سال کی قید محض، جو مجموعی طور پر چھ سال ہو جاتی ہے اور یہ میرا فرضِ منصبی ہے کہ میں یہ سزا آپ کے لئے تجویز کروں، اور ایسا کرتے وقت میں ایک بات کہنی چاہتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں واقعات کی رفتار گورنمنٹ کے لئے ممکن بنا دے کہ وہ اس مدت کو گھٹا دے اور آپکو رہا کر دے تو مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص مسرور نہ ہوگا

مسٹر گاندھی نے جواب میں فرمایا:۔

"میں ایک بات کہنی چاہتا ہوں۔ چونکہ آپ نے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک مرحوم کے مقدمہ کا ذکر کر کے میری عزت افزائی فرمائی ہے، اس لئے میں یہ صرف اتنی بات کہوں گا کہ میں اپنے لئے انتہائی فخر اور عزت سمجھتا ہوں کہ میرا نام ان کے نام کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ جہاں تک سزا کا تعلق ہے میں یقیناً اسے اتنا ہی ہلکا خیال کرتا ہوں جتنا کوئی جج مجھے دے سکتا ہے، اور جہاں تک مقدمہ کی تمام کارروائیوں کا تعلق ہے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے اس سے زیادہ اظہارِ اخلاق کی توقع نہیں ہو سکتی تھی"

باب ختم کرنے سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ذاتی تجربہ سے کچھ باتیں درج کر دوں۔ قید سے رہائی کے بعد سے مہاتما گاندھی نے اپنی اعلیٰ ایمانداری اور نیکی کی بدولت "ہندوستان کے ہر انگریز" کے دل کو موہ لیا ہے اور میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ ہر انگریز عورت کے دل کو بھی موہ لیا ہے۔ انہوں نے انہیں اپنی پاکیزہ خوش طبعی کی وجہ سے بھی موہ لیا ہے جو تقریباً بلا ارادہ ان کی ہر تحریر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مثلاً جب کبھی وہ اپنی "مہاتمائیت" کے تھکا دینے والے بوجھ کے نیچے دب کر چلاتے ہیں، اور جب کبھی وہ معتقدین کے

بے قابو مجمعوں کو اپنے پاؤں چھونے سے بے کار منع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو آدھی رات کو ان کا درشن کرنے کی غرض سے انہیں جگا دیتے ہیں تو اس وقت وہ ہر انگریز کی فوری ہمدردی کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مزید برآں صغرسنی کی شادیوں، کمسن بیوگان اور چھوت چھات کے خلاف اپنی بے باکانہ تقریروں کی بدولت وہ ان کا دلی احترام حاصل کر لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس احترام میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کبھی وہ کسی میونسپل کارپوریشن کے ممبروں سے مدحیہ نورانی ایڈریس حاصل کرنے کے بعد جواب میں انہیں صبح کا باقیماندہ حصہ میونسپل پاخانوں کا معائنہ کرنے اور میونسپلٹی کے اچھوت اسٹاف (عملہ) کو دیکھنے میں صرف کرنے کی فوری دعوت دیدیتے ہیں۔ صفائی اور پاکیزگی کے لئے ان کا انہماک جو چھوٹی سے چھوٹی عملی تفصیل تک جا پہنچا ہے، ان کی نظر میں نہایت قابلِ تعریف خیال کیا جاتا ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مس میو[1] بھی اپنی کتاب "مدر انڈیا" میں جسے مسٹر گاندھی مزاحاً "داروغۂ صفائی کی رپورٹ" کہتے ہیں، اُن کے خلاف کچھ زیادہ نہیں لکھ سکی

اب زیادہ عام امور کی طرف لوٹیئے۔ یہ ان کی عام عادت ہے کہ وہ کسی نوع مشنریوں، یا حکام یا انگریز تاجروں کی درخواست کو مسترد نہیں کرتے کہ وہ اُن سے ملیں اور خیالات تفصیل کے ساتھ ان کے روبرو پیش کریں۔ اس قسم کی درخواستیں اس وقت زیادہ بڑھ جاتی ہیں جب کہ وہ دورہ پر روانہ ہوتے ہیں اور پھر ان کی انتہائی بے تکلفی اور اخلاق کے سامنے ہر قسم کی جھجک جاتی

[1] Miss Mayo

رہتی ہے۔ وہ مکمل طریقہ سے تمام اشخاص کی میزبانی کرتے ہیں جو اُن کے آشرم میں جاکر ان سے ملتے ہیں اور وہ رات دن ان کی خاطر مدارات میں لگے رہتے ہیں۔ وہ قابل تعریف مہمان بھی ہیں جب کبھی وہ اپنی باری سے دوسروں کے یہاں جانے کی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر مشنری کا دل ان کی طرف راغب ہے۔ اور ان کے بعض عزیز ترین انگریز دوست مشنری ہی ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر چھوٹے بچے ان کے نہایت ہر دلعزیز رفیق ثابت ہوتے ہیں۔ سابرمتی میں وہ کبھی سیر کو نہیں جاتے جب تک کہ وہ اپنے آشرم کے بچوں کو ساتھ نہیں لے لیتے جو اُن کی انگلیاں پکڑ کر چلتے ہیں اور جن سے وہ راستہ بھر باتیں اور ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ ان کی مجلس ہمیشہ بشاش اور مسرور رہتی ہے۔ جس گھر میں وہ چلے جاتے ہیں ہر صورتِ حالات ایکساں رہتی ہے۔ انہوں نے بتا دیا ہے اور یہ بات بہت کم آدمیوں کے لئے ہو گی، کہ ایک مقدس آدمی اپنی روزمرہ کی زندگی میں حیرت انگیز طریقہ سے انسان اور عملی دونوں رہ سکتا ہے۔ انہیں اپنے کسی وقار یا اقتدار کا ذرہ برابر خیال نہیں۔ ہر موقع پر غریب ترین اور ادنیٰ ترین اشخاص ان سے بے تکلفی سے ملتے ہیں اور ہر جگہ کے اچھوت تو انہیں اپنا آدمی ہی خیال کرتے ہیں

میں اس باب کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جسے مہاتما گاندھی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بیان کیا ہے۔ اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جبکہ وہ جنگ بوئر کے دوران میں زخمیوں کو بچانے میں اپنی غیر معمولی جرأت اور ایثار کا اظہار کرنے کے باعث محاذ کی تمام برطانوی افواج میں بہت مشہور ہو چکے

تھے۔ وہ اپنی اسٹریچر کور کے ساتھ شیولے کیمپ کی طرف آرہے تھے جہاں لارڈ رابرٹس کے بیٹے لفٹننٹ رابرٹس[۱] کو مہلک طریقہ سے زخمی ہو جانے کے بعد پہونچا دیا گیا تھا۔ مسٹر گاندھی کا اسٹریچر کور ہی میدان جنگ سے زخمی افسر کو لایا تھا۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"اس دن گرمی بہت سخت تھی اور ہر شخص پیاس کے مارے بیتاب ہو رہا تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹی سی ندی پڑتی تھی جہاں ہم اپنی پیاس بجھا سکتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پہلے کون پیئے؟ ہماری خواہش تھی کہ پہلے برطانوی سپاہی اپنی پیاس بجھالیں تو اس کے بعد ہم اپنی پیاس بجھانے کی فکر کریں گے۔ لیکن انھوں نے ابتدا کرنے سے انکار کر دیا اور ہم سے اصرار کیا کہ ہم پہل کریں کچھ دیر تک یہ خوشگوار مقابلہ جاری رہا جس میں ہر فریق دوسرے کو آگے بڑھا کر خود کو پیچھے رکھنا چاہتا تھا"

۱؎ Lieut. Roberts

باب ہشدہم

دہلی کا برت

مہاتما گاندھی کی پُر از واقعات زندگی کی تمام کارروائیوں میں ان کی شخصیت پر سب سے زیادہ روشنی ڈالنے والا واقعہ غالباً دہلی کا "عظیم الشان برت" ہے، کیونکہ یہ وہ نام ہے جو خود ہندوستانیوں کی جانب سے اسے دیا گیا ہے۔ برت ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کے آخر میں رکھا گیا تھا اور اس کی مدت اکیس دن کی تھی۔ وہ ایسے زمانہ میں رکھا گیا تھا جبکہ وہ ایک بہت ہی سخت بیماری اور آپریشن سے اچھے ہوئے تھے۔ قید خانہ میں جانے سے پیشتر انہوں نے حیرت انگیز دور اندیشی کے ساتھ حکیم محمد اجمل خان صاحب کے نام جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں ہندو مسلم اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا[1] اسی اتحاد کو قائم رکھنے اور اسے استقلال بخشنے کی خاطر انہوں نے یہ طویل روزہ رکھا تھا

سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء تک کے درمیانی عرصہ میں افقِ ہندوستان پر گہرے بادل منڈلانے لگ گئے تھے جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے تھے اور بالآخر وہ طوفان سنہ ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں فرقہ وارانہ مذہبی تنازعات کی شکل میں پوری شدت کے ساتھ پھوٹ نکلا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ تشدد کے واقعات

[1] دیکھو ضمیمہ دہم

رونما نہ ہوتے ہوں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جاہل اور اَن پڑھ ہندو اور مسلمان احمقانہ اور مجنونانہ جھگڑوں میں مبتلا ہو گئے ہیں

آپریشن کے بعد جو ہوئیں مہاتما گاندھی کی صحت یابی کی تمام مدت میں مجھے ان کی معیت میں رہنے کا فخر حاصل ہوا تھا۔[1] ان کا ارادہ جلدی اچھا ہو جانے کا تھا تاکہ وہ شمالی ہندوستان کا دورہ کر سکیں جہاں یہ فسادات بسرعت تمام بڑھ رہے تھے، اس غرض سے کہ صورتِ حالات کے بے قابو ہونے سے بیشتر وہ ان کی روک تھام کر سکیں

لیکن جب بالآخر وہ وہاں جانے کے قابل ہوئے، اس وقت بدترین واقعات معرضِ ظہور میں آچکے تھے۔ متعدد مقامات میں فسادات جن میں خونریزی بھی کی گئی تھی، شروع ہو چکے تھے اور ان واقعات میں سب سے زیادہ رنجدہ اور ذلت آفرین واقعہ کوہاٹ کا تھا جو شمال مغربی سرحد پر ہے

ٹھیک اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ان کے دہلی پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد واقعات کی رفتار ایسی منزل پر پہنچ گئی جو انسانی قابو سے باہر تھی۔ آگ سلگ چکی تھی اور مذہبی منافرت کے شعلے بہت تیزی کے ساتھ بھڑک رہے تھے۔ مہاتما گاندھی دن رات واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور خدا سے دعائیں مانگنے میں مصروف رہتے تھے۔ آخرکار انہوں نے محسوس کیا کہ اس دورِ تاریکی میں آگے بڑھنے کے لئے انہیں خدا کے پاس سے صریح ہدایت مل گئی ہے بہت ہی شدید بیماری سے اٹھنے کے بعد باوجود اپنی کمزوری کے

[1] دیکھو ضمیمہ یازدہم

انہوں نے اکیس دن کا روزہ رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تاکہ وہ اپنے ہی
ملک کے باشندوں کے گناہوں اور کمزوریوں کا کفارہ ادا کریں۔ انہوں نے
ایک خط میں جسے انہوں نے شائع کیا تھا، یہ بات بیان کر دی تھی کہ روزہ ایک
اور خدا کے درمیان ایک معاملہ ہے اور اس کا مقصد محض تزکیۂ نفس ہے۔
تاہم اسے پبلک سے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اور اس جبر کا پھیلنا تھا کہ
فسادات یکقلم موقوف ہو گئے جو اس قدر شدت کے ساتھ برپا ہو رہے تھے۔
ساتھ ہی اس واقعہ نے ایسے طریقہ سے جو اور کسی طرح ممکن نہ تھا قوم کے
لیڈروں کو اکسایا کہ وہ اس ایک مسئلہ پر جو ہندوستان کے لئے بہ حیثیت قوم
کے موت اور زندگی کا حکم رکھتا ہے، اپنی توجہ مرکوز کر دیں

روزہ کے دوسرے دن جب میں شانتی نکیتن سے دہلی پہنچا، مہاتما
گاندھی نے خود مجھ سے فرمایا کہ روزہ کی ابتدا کس طرح سے ہوئی جیسا کہ میں
اوپر بیان کر چکا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان
کیا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے جو ذہنی تکلیف اور کشمکش انہیں اٹھانی پڑی، وہ
ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ مگر برخلاف اس کے تب دعاؤں کے
دوران میں ایک مرتبہ روشنی نمودار ہو گئی ان کا سارا تامل اور شک کافور
ہو گیا کہ جس فرض کی بجا آوری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ منجانب اللہ ہے
میرے عاجزانہ اور متفکرانہ سوالات کے جواب میں کہ اگر روزہ کا باران
کے نحیف جسم کے لئے بارگراں ثابت ہوا تو کیا اس کے بعد بھی وہ اسے جاری
رکھیں گے، انہوں نے فرمایا کہ وہ خدا پر اس قدر محکم یقین رکھتے ہیں کہ وہ

اچھی طرح سے واقف ہیں کہ یہ صورت حالات کبھی پیدا نہ ہوں گی۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ جسمانی طریقہ سے معاملہ برداشت سے باہر ہوگیا ہے تو وہ کھانا کھانے پر تیار ہو جائیں گے۔ اس وعدہ کے ساتھ ہم کو مجبوراً اتفاق کرنا پڑا

بارھویں دن حالت نازک ہوگئی۔ دونوں ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ ان کی جان فوری خطرہ میں ہے اور انہوں نے کھانا کھا لینے پر زور دیا مجھ سے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا گیا تا کہ میں بھی انہیں ایسا کرنے کی ترغیب دوں وہ ان کی خاموشی کا دن تھا اور انہوں نے ہماری عاجزانہ درخواست کے جواب میں ذیل کے الفاظ لکھ دئے: "خدا پر بھروسہ رکھئے" جب ہم نے اور زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے پھر لکھا: "آپ کو دعا کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے"۔ اس رات کو ہم سب نہایت درجہ بیکل اور متفکر رہے اس لئے کہ وہ موسم برسات کے آخر میں طوفانِ باد و باران کی رات تھی لیکن دوسرے دن ان کی حالت سے زیادہ کمزوری معلوم نہیں ہوئی اور وہ آخر وقت تک مسرور اور خندان رہے اور اسی طرح ان کے اکیس دن تیر ہو گئے۔ یہ سچ ہے کہ اور لوگوں نے اس سے زیادہ مدت تک روزے رکھے ہیں، لیکن اتنے کمزور و نحیف جسم کی حالت میں اور روزے سے قبل اتنی زبردست بیماری اٹھانے کے باوجود ایسا واقعہ شاذونادر ہی ہوا ہوگا

انہوں نے مجھے اس تمام عرصہ میں اپنے ہفتہ وار اخبار "ینگ انڈیا" کی ایڈیٹری کرنے کی اجازت دیدی۔ وہ اقتباسات جو میں اس باب کیلئے جمع کر رہا ہوں، کسی قدر بکھری ہوئی حالت میں ہیں، لیکن اگر سب کے سب

یکجا کر دیئے جائیں تو مغربی قارئین کو اس نظارہ کا اندازہ ہو جائے گا جس کے ساتھ اس قدر باتیں وابستہ ہیں۔ چونکہ وہ نازک زمانہ میں تحریر کئے گئے تھے اس لئے وہ جذبات اور محسوسات کا مخصوص ماحول اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں

سب سے پہلے مسٹر گاندھی کی وہ تحریر درج کی جاتی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ دعا کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے اور روزہ کس وجہ سے رکھا گیا ہے :۔

"میں دعا کے بغیر کوئی کام شروع نہیں کرتا۔ انسان خطا اور غلطی کا پتلا ہے۔ اسے اپنی کارروائیوں کی صحت کے بارے میں کبھی یقین نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے جس بات سے وہ یہ اندازہ لگاتا ہو کہ اس کی دعا کو اجابت حاصل ہو گئی ہے، وہ محض اس کے تکبر کی گونج ہو۔ حقیقی رہنمائی کے لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دل کلیتہً پاک ہو اور بدی کرنے کے ناقابل۔ میں اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں تو کشمکش کرنے والی، غلطیاں کرنے والی کوشش کرنے والی ناکمل روح رکھتا ہوں۔ لیکن میں صرف اپنے اوپر اور دوسروں پر تجربہ کرنے سے ترقی کر سکتا ہوں۔ میں خدا کی حقیقی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہوں اور اسی طرح بنی نوع انسان کے ایک ہونے پر بھی میرا ایمان ہے۔ اس سے کیا کہ ہم جسم رکھتے ہیں؟ مگر ہماری روح تو ایک ہے۔ سورج کی شعاعیں انعکاس کی وجہ سے بےشمار ہیں۔ لیکن ان کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ لہٰذا میں خبیث سے خبیث روح سے بھی اپنے آپ کو

علیحدہ نہیں کر سکتا اور نہ میں اس سے انکار کر سکتا ہوں کہ میں نیک ترین آدمی کی روح کے ساتھ یگانگت رکھتا ہوں۔ اس لئے طوعاً و کرہاً مجھے اپنے تجربہ میں اپنے تمام ہمجنسوں کو شامل کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی میں تجربہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی تجربوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلہ کا نام ہے
میں جانتا تھا کہ عدم تعاون ایک خوفناک تجربہ ہے۔ عدم تعاون بطور خود غیر فطری، ناپاک اور گناہ سے پُر ہے۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ عدم تعاون جس کے ساتھ عدم تشدد ہو، بعض وقت مقدس فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن عام جمہور پر اس کا اطلاق کرتے وقت ہر قسم کی غلطی کا امکان تھا۔ مگر خوفناک بیماریوں کے لئے خوفناک دواؤں کی ضرورت ہے۔ غیر متشدد عدم تعاون انارکی اور اس سے بدتر خرابیوں کا واحد تدارک تھا اور چونکہ اسے غیر متشدد رکھنا منظور تھا اس لئے میں نے اپنی زندگی کو جوکھم میں ڈال دیا

یہ حقیقت کہ ہندو اور مسلمان جو صرف دو سال قبل بظاہر دوست کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اب بعض مقامات میں بلیوں اور کتوں کی طرح سے آپس میں دست و گریبان ہو رہے ہیں قطعی طور پر ظاہر کرتی ہے کہ جس عدم تعاون پر وہ عمل پیرا تھے، غیر متشدد نہ تھا۔ میں نے بمبئی، چوری چورا اور دوسرے بہت سے چھوٹے مقامات میں اس کے اثرات دیکھے تھے۔ میں نے اس وقت کفارہ ادا کیا تھا اور اس کا فوری اثر بھی ہوا تھا لیکن اس ہندو مسلم کشیدگی کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کوہاٹ کے درد انگیز

واقعات سنکر معاملات ناقابل برداشت ہو گئے سابرمتی سے دہلی کی روانگی کے وقت سروجنی دیوی نے مجھے لکھا تھا کہ صلح و آشتی پر تقریریں کام نہ دینگی مجھے کوئی موثر علاج معلوم کرنا چاہیئے۔ وہ مجھ پر ذمہ داری ڈالنے میں حق بجانب تھیں۔ کیا عامۃ الناس کی وسیع طاقت کو معرض ظہور میں لانے کا باعث میں نہ تھا؟ اب اگر وہ طاقت اپنے آپ کو تباہ کرنے والی ثابت ہو تو میرا فرض ہے کہ میں ہی اس کے لئے علاج ڈھونڈوں۔ چنانچہ میں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں سخت محنت اور گہرے غور کے بعد علاج معلوم کرسکونگا مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ علاج اس طویل روزہ کی شکل میں ہوگا اور پھر بھی میں جانتا ہوں کہ روزہ اتنا طویل نہیں ہے کہ میری روح کی اذیت اور تکلیف کو مطمئن کرسکے۔ کیا میں نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے؟ کیا میں نے بے صبری دکھائی ہے؟ کیا میں نے بدی کے ساتھ مصالحت کرلی ہے؟ ممکن ہے میں نے یہ سب باتیں کی ہوں یا ان میں سے ایک بات بھی نہ کی ہو۔ مجھے جس بات کا علم ہے وہ تو صرف وہ ہے جسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اگر وہ لوگ جواب جنگ کررہے ہیں حقیقی عدم تشدد اور سچائی پر عامل رہتے تو جو خونی لڑائی اس وقت برپا ہے، وہ ناممکن ہوتی۔ میری ذمہ داری فی الحقیقت کہیں نہ کہیں ضرور ہے

امیٹھی، سانبھر اور گلبرگہ کے فسادات سے مجھے سخت رنج پہنچا تھا۔ میں نے امیٹھی اور سانبھر کے بارے میں ہندو اور مسلمان دوستوں کی تیار کردہ رپورٹیں پڑھی تھیں۔ میں نے ان مسلمان اور ہندو دوستوں کی

مشترکہ تقریبات بھی پڑھی تھیں، جو گلبرگہ تشریف لے گئے تھے۔ میں شدید کرب و بلا کی حالت میں تھا اور باوجود اس کے میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ کوہاٹ کی خبر نے سلگتے ہوئے ڈھیر میں شعلے پیدا کر دئے کچھ نہ کچھ کام کرنا ضروری ہو گیا۔ میں نے بے چینی اور غم میں دو راتیں کاٹیں۔ بدھ کے دن مجھے علاج معلوم ہو گیا۔ سب مجھے کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ آشرم میں ہم صبح کی پرارتھنا کے وقت رحم کے دیوتا شیو جی سے ان گناہوں کی معافی کے طالب ہوتے ہیں جو ہم سے ارادتاً یا بے سمجھے بوجھے سرزد ہو جاتے ہیں۔ میری تپسیا دکھے ہوئے دل کی دعا ہے کہ اے خدا میرے وہ گناہ جو بے سمجھے بوجھے مجھ سے سرزد ہوئے ہوں، معاف کر دئے جائیں

یہ ان مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے تنبیہ ہے جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے سچے دل سے مجھ سے محبت کی ہے اور میں ان کی محبت کا اہل ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ کفارہ ادا کرنے میں شریک رہیں گے اس لئے انہوں نے اپنے دل میں خدا تعالےٰ کے وجود سے انکار کرنے کا کبیرہ گناہ کیا ہے۔ ایک دوسرے کے مذہب کو برا بھلا کہنا، غیر محتاط بیانات دینا، جھوٹ بولنا، بے گناہوں کے سر توڑنا، مندر یا مساجد کی بے حرمتی کرنا درحقیقت خدا سے انکار کرنا ہے۔ دنیا اس کتوں کی لڑائی کو جو ہم میں برپا ہے، دیکھ رہی ہے۔ بعض مسرت کے ساتھ اور بعض رنج کے ساتھ۔ ہم شیطان کے کہنے میں آ گئے ہیں۔ مذہب۔ خواہ آپ کسی نام سے پکاریں۔ زیادہ سخت چیز ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کفارہ یہ نہیں ہے کہ وہ تپسیا کریں بلکہ اپنے قدموں کو پیچھے لوٹا لیں۔ مسلمان کی تپسیا یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے برا نہ سوچے اور اسی طرح ہندو کی سچی تپسیا یہ ہے کہ

وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے دل میں برا خیال تک نہ لائے
میں کسی ہندو یا مسلمان سے درخواست نہیں کرتا کہ وہ اپنے مذہبی عقائد میں سے کسی عقیدہ کی ذرہ برابر قربانی کریں۔ اسے صرف اتنا ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ یہ مذہب ہے۔ لیکن میں ہر ہندو اور مسلمان سے بالضرور درخواست کرونگا کہ وہ دنیوی فائدہ کی خاطر آپس میں جنگ نہ کریں۔ مجھے دکھ بہت پہنچے گا اگر میرے روزے نے کسی ایک کو آمادہ کر دیا کہ وہ اپنے اصول کو ترک کر دے۔ باقی رہا میرا برت تو وہ میرے لئے خدا کے درمیان ایک معاملہ ہے"

روزہ کے دوران میں میں نے اپنے لئے ان گجراتی بھجنوں کو نقل کر لیا تھا جو ایسی روحانی تکلیف کے موقع پر بالخصوص جبکہ جسمانی کمزوری بھی ساتھ ہو ان کی مسرت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ وہ ہیں جنھیں دیہات کے معمولی کسان تک اپنے اپنے علاقوں میں گایا کرتے ہیں۔ غربا میں بھی وہ کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ذیل کے تراجم سے اُن کی مذہبی عبادتی اہمیت کا ہلکا سا اندازہ ہو سکے گا

۱

خدا کا راستہ بہادروں کے لئے ہے، وہ بزدلوں کے لئے نہیں ہے
پہلے اپنی جان اور دینا سب کچھ قربان کردو۔ پھر تم خدا کا نام جپ سکتے ہو
صرف وہی شخص خدائی ساغر سے لذت اندوز ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے، اپنی بیوی، اپنی دولت اور خود اپنی زندگی کو قربان کر دیتا ہے
اس لئے کہ جو شخص موتیوں کا متلاشی ہے، اسے یقیناً سمندر کی تہ میں غوطہ لگانا

چاہیئے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا چاہیئے

وہ موت کی بھی پروا نہیں کرتا، وہ جسم و دماغ کی سب تکالیف کو بھول جاتا ہے

جو شخص غوطہ لگانے کے ڈر سے ساحل پر کھڑا رہتا ہے، کچھ حاصل نہیں کرسکتا

محبت کے راستہ پر گامزن ہونا آگ میں سے گذرنے کے مترادف ہے۔ ڈرنے والوں کا یہاں گذر نہیں

جو لوگ آگ میں کودتے ہیں، صرف وہی ابدی مسرت حاصل کرتے ہیں

جو لوگ دور کھڑے رہتے ہیں اور تماشا دیکھا کرتے ہیں وہ شعلوں سے جھلس جاتے ہیں

محبت انمول چیز ہے اور صرف مر کر حاصل کی جاسکتی ہے

جو لوگ مرنے کی خاطر زندگی بسر کرتے ہیں، صرف وہی اسے حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو خودی کے تمام جذبات سے مبّرا کرلیتے ہیں

وہ بہادر مرد ہیں جو خدا کی محبت میں سرشار رہتے ہیں، صرف وہی سچی محبت کرسکتے ہیں

۲

جب تک تو سچائی سے واقف نہ ہوگا اس وقت تک تیری تمام ریاضتیں بیکار ہیں بعینہٖ جس طرح سے کہ بے وقت کی بارش بیکار جاتی ہے

طہارت، مذہبی مراسم اور خیرات بھی بیکار چیزیں ہیں

سادھوؤں کا ساز و سامان کیا فائدہ دے سکتا ہے ـــ تمام جسم پر بھبوت ملنے اور لٹیں چھوڑنے سے کیا ہوسکتا ہے؟

تپسیا اور جاپ، مالا جپنا، بیتیانی پر قشقہ (تلک) لگانا اور گنگا جل پینا یہ سب باتیں کیا کام آسکتی ہیں؟
ویدوں کا علم، صرفی و نحوی قواعد اور باقی فنون کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟
اسی طرح فلسفہ اور علم ادب کس کام آسکتے ہیں؟
یہ سب باتیں محض ظاہر بیں شخص کو مطمئن کر سکتی ہیں۔ جب تک تو سچائی سے آگاہ نہ ہوگا، تیری زندگی بیکار رہے گی (یہ نرسمہا کا قول ہے)

۳

وہ میرا قیدی ہے۔ میں نے اسے خرید لیا ہے۔ ہاں میں نے اسے خرید لیا ہے
بعض کہتے ہیں کہ وہ بالکل ہلکا پھلکا ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ بے انتہا بھاری ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سے تول لیا ہے اور میں جانتی ہوں کہ میں نے اسے ٹھیک طرح سے تولا ہے
بعض کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی سستا ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ تو بے حد مہنگا ہے
بعض کہتے ہیں کہ وہ انمول ہے۔ مگر ہاں، میں نے تو پوری قیمت ادا کر دی ہے
میں نے برندابن کے بازاروں میں پوری قیمت ادا کی تھی جبکہ وہ رادھا کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا
کسی کو خبر نہیں کہ میں نے اس پر کس طرح سے قابو حاصل کیا ہے، صرف وہی جانتا ہے۔ اس لئے کہ بقول میرا بائی وہ اب تک اس عہد پر قائم ہے جو اس نے میرے پچھلے جنم میں مجھ سے باندھا تھا
وہ میرا ہے اور کسی کا نہیں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو اپنے رشتہ داروں کو

اس کی خاطر چھوڑ دیا ہے سادھوؤں کی صحبت میں رہتے رہتے میری تمام شرم و
حیا کافور ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف میرا ہے

میں رشیوں کے پاس دوڑی ہوئی گئی اور دنیا دیکھنے کی غرض سے رو دی،
میں نے محبت کے آنسو بہائے اور ان سے ابدیت کے درخت کو سینچا۔ اب وہ صرف
میرا ہے

میں نے اشیا کی تحقیق کی لیکن سوائے اس کے کچھ نہ پایا۔ اب وہ صرف میرا ہے
یہ خبر باہر پھیل گئی ہے۔ ہر شخص جان گیا ہے کہ میرا بائی اس کی باندی ہے اور
وہ اس کا آقا ہے جو کچھ مقدر میں لکھا تھا سو وہ پورا ہوا۔ اب وہ صرف میرا ہے

۴

خدا تعالےٰ بیکسوں کا والی ہے اور کمزوروں کا مددگار۔ اس نے آزمائش کے
موقعوں پر رشیوں کا ساتھ دیا

جب تک ہاتھیوں کے مالک نے خود اپنی طاقت پر بھروسہ رکھا، اسے شکست
حاصل ہوئی

لیکن جونہی وہ اپنی طاقت کو کھو بیٹھا اور کمزوری کی حالت میں خدا سے طالب
امداد ہوا، اس نے خدا کو اپنے سے قریب پایا۔ اس سے قبل کہ وہ اس کا پورا نام
بھی اپنی زبان سے ادا کر سکے، ایسی بیچارگی کی حالت میں دروپدی نے خدا کو پکارا

دشاسنا اس کے کپڑے اتارنے میں قطعاً ناکام رہا اس لئے کہ خدا خود اس
کے لئے لباس بن گیا تھا۔ یوگ کی طاقت کو آزما دیکھو، انسان کی جسمانی یا دیوی طاقت
یقیناً اکارت جائے گی

حقیقت یہ ہے کہ کمزوروں میں خدا کا نام لینے سے طاقت پیدا ہو جاتی ہے

۵

آقا، مجھے بچائیو تاکہ میں اپنی آنکھیں ایسی چیزوں پر نہ ڈالوں جو برے خیالات پیدا کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں

آقا مجھے بچائیو تاکہ میں اپنے ہونٹوں کو ایسے الفاظ سے ناپاک نہ کروں جو ناپاکی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ میرے ہونٹ سی دیئے جائیں

آقا، مجھے بچائیو تاکہ میں کوئی ایسا لفظ نہ سنوں جس سے دوسرے کا دل دکھے یا کوئی ایسا لفظ نہ سنوں جس سے دوسرے کی تحقیر ہوتی ہو۔ اس سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ میں بہرا ہو جاؤں

آقا، مجھے بچائیو تاکہ میں ان پر جو میری نہیں ہونی چاہئیں، شہوت کی نظر نہ ڈالوں۔ اس سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ میں مر جاؤں

آقا، اس احساس کی دنیا سے مکا (رام) کو بھاگ جانے کا موقع دے تاکہ تجھ میں اسے ابدی مسرت حاصل ہو جائے

۶

خدا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو دنیا کو اس قدر قیمتی بنا دیتی ہے

جو نیک بندے بہشت میں جا چکے ہیں، وہ وہاں رہنا نہیں چاہتے اس لیئے کہ وہ اس دنیا میں پھر آنا چاہتے ہیں تاکہ وہ خدا کی محبت کی تکمیل کریں

خدا کے نیک بندے پیدائش اور موت سے چھٹکارا نہیں چاہتے۔ وہ تو

بار بار پیدا ہونا چاہتے ہیں تاکہ وہ خدمت کریں اور پوجا کریں اور خدا تعالیٰ کی تعریف و تقدیس کریں اور اسے آمنے سامنے ہو کر دیکھا کریں

جس مکان میں مہاتما گاندھی فروکش تھے وہ شہر کے باہر اس مشہور ومعروف پہاڑی کے نیچے واقع تھا جسے حملہ آور افواج نے محاصرۂ دہلی کے دوران میں استعمال کیا تھا۔ جس کمرے میں وہ لیٹتے تھے اس کا رخ اسی پہاڑی کی طرف تھا اور اور اس کی جنوبی سمت میں برآمدہ تھا جہاں انہیں دھوپ کھلانے کے لئے ہر روز لیجایا جاتا تھا جب کبھی موسم اس امر کی اجازت دیتا تھا۔ پہاڑی کا وہ رخ جہاں وہ مکان واقع تھا، دہلی کی کلب کی زندگی کا جزو بنا ہوا تھا اس لئے کہ وہاں گولف کورس تھا جو سب کی توجہات کا مرکز تھا۔ اشوک کی لاٹھ جس کے پتھر پر رواداری کا خوبصورت حکم کندہ تھا اور جو زیر آسمان بلند کھڑی تھی ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ وہ ہمیں یہ بات یاد دلا دیتی تھی کہ دو ہزار پانچسو سال قبل بدھ مذہب کی تعلیمات کے باعث بنی نوع انسان مذہبی معاملات میں موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں کس طرح زیادہ روادار بنے ہوئے تھے۔ اتحاد کانفرنس میں جو مہاتما گاندھی کی خود اپنی صلح کی خواہش اور ہندو مسلمانوں میں نیک دلی پیدا کرنے کی آرزو کے ساتھ ہمدردی کے طور پر منعقد کی گئی تھی، یہ کتبہ بار بار دہرایا گیا تھا۔ کلکتہ شہر کے بشپ ڈاکٹر فاس ویسٹ کوٹ[ط] نے دوسرے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اس

ط Dr. Foss Westcott

کانفرنس میں شرکت کی تھی اور ان کی آمد باعث برکت ثابت ہوئی تھی
اس نظارہ کی صحیح تصویر کھینچنے کی غرض سے جو انتظار کی ان تکلیف دہ گھڑیوں میں روز بروز دیکھنے میں آتا تھا، میں نے اخباری مقالہ کو شائع کر دینے کی جرأت کی ہے جو روزہ کے اختتام کے قریب لکھا گیا تھا۔ چونکہ اُن دنوں میں ہر اُس بات سے جو روزہ سے متعلق ہوتی تھی، نہایت گہری دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا، لہٰذا اخبارات میں یہ مضمون بہت نقل کیا گیا۔ وہو ہٰذا:۔
دہلی میں پہاڑی کے دامن میں شہر سے دور دوسری جانب کو ایک مکان ہے جس کا نام دل خوش ہے جہاں مہاتما گاندھی نے اپنا برت رکھا تھا۔ مکان سے اوپر تاریخی پہاڑی واقع ہے جس کے گرتے ہوئے کھنڈر زبان حال سے ان لڑائیوں کی داستان بیان کر رہے ہیں جو گذشتہ ایام میں وہاں برپا ہوئی تھیں۔ اس کے بلند ترین مقام پر "غدر کی یادگار" کھڑی ہے
دل خوش کی بالائی منزل کے برآمدہ سے پشتوں اور دیواروں کے کھنڈر دکھائی دے سکتے ہیں اور ان کے قریب ہی اشوک کی لاٹھ کھڑی آسمان سے باتیں کر رہی ہے رات کی تاریکی میں ستاروں کی روشنی میں اور چاندنی رات میں یہ بلند مقامات نہایت ممیز نظر آتے ہیں۔ پہاڑی اور نیچے کے مکان کے درمیان جہاں مہاتما گاندھی خاموش پڑے ہوئے روز بروز دکھ اور تکلیف برداشت کر رہے ہیں ایک طرف دہلی میں سیزن کے زمانہ میں ہر سہ پہر کو موٹر کی قطاریں راستہ میں کھڑی نظر آتی ہیں جس سے آنے جانے کا راستہ رک جاتا ہے اور دوسری طرف گولف کھیلنے والے اپنے کھیل میں مصروف دکھائی دیتے ہیں

مہاتما گاندھی نے ایک دن سہ پہر کو مجھے برآمدہ میں طلب فرمایا۔ چند گانیوالے بھی آگئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں گانا سنوں۔ وہ دن ان کے سخت ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ ان کی کمزوری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ایک لڑکا برآمدہ کے پرلے سرے پر آہستہ آہستہ کچھ گا رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا اس عزم سے کہ بیٹھوں اور گانا سنوں، میری توجہ یکایک درد بھوگنے والے شخص کے تکلیف زدہ چہرہ پر پڑگئی۔ اس نظارہ نے مجھے تشویش میں ڈال دیا اور شروع شروع میں میں نے موسیقی کی طرف کچھ دھیان نہیں دیا۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور روشنی کی کرنیں وہاں سے آرہی تھیں اور ان کھلے میدانوں پر پڑ رہی تھیں جہاں گولف کے شائقین گولف کھیلنے میں مصروف تھے۔ پہاڑی کی بلندیاں بھی ارغوانی اور سنہری رنگوں سے رنگی ہوئی نظر آتی تھیں

آخر کار آسمان کی خوبصورتی نے میری توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیا اور میرے اندرونی خدشات ایک ایک کر کے کم ہوگئے اور اس کے بعد جب میں نے پہاڑی کی طرف نظر کی تو سالم تخیل میں ماضی کی تمام تاریخ میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس لاٹھ نے جس پر رواداری اور عدم تشدد کی تعلیم کندہ تھی میرے سامنے مذہب کے دور کو اور نیک دل راجہ اشوک کو لا کر کھڑا کر دیا۔ اس زمانہ میں جو لوگ ملک میں آباد تھے وہ انسان اور حیوان دونوں کے ساتھ مہربانی اور رواداری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ وہ یقیناً شانتی اور امن کا زمانہ تھا

لیکن قلعہ کے اُن کھنڈرات نے جن پر غدر کی یادگار قائم ہے، مجھے تاریخ انسانی کے ایک اور باب کی یاد دلادی جو خونریزی اور شدید لڑائیوں سے ملوث ہے۔ اس نظارہ کے

سورج نہایت شان کے ساتھ مغرب میں غروب ہو رہا تھا، لیکن پچھلی ساری رات پہاڑی پر بادو باراں کے حملے ہوتے رہتے تھے اور ہوائیں خوفناک شدت کے ساتھ چلتی رہی تھیں۔ گرج پہاڑی کے ارد گرد دل دہلتی ہوئی آن پہنچی تھی اور اس کی چٹانوں اور کھوؤں سے صدائے بازگشت سننے میں آئی تھی، اور دندانے دار بجلی اس کی چوٹی پر رکھیلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ میں راجہ اشوک کے اُن پُر امن ایام کی پُرسکون خوبصورتی کی جگہ جنگ کے طوفان را ایام نے لیلی تھی۔ سب سے آخر میں دوران غدر میں پہاڑی انسانی خون سے داغدار بنی اور بندوقوں اور توپوں کے گولوں نے اس کے سینہ کو چھلنی کیا

پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے کھلی جگہوں میں جہاں جدید گولف کے "لنک" بنا دیئے گئے ہیں، میں گولف کھیلنے والوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ گولف کے کلب متحرک ہو رہے تھے اور گیند میں "ہٹ" لگائے جا رہے تھے۔ طاقتور عورتیں اور طاقتور مرد آگے جا رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے گولف کے کلبوں کو ان کے پیچھے پیچھے اٹھائے لئے جا رہے تھے۔ ان کے تمام اعضا میں جسمانی پھرتی جلوہ گر تھی۔ مادی اور دنیوی طاقت کی رو ان کے سارے بدن میں جاری وساری تھی

یکایک میری نظر میرے قریب کے برآمدہ پر کمزور ڈھلی ہوئی اور مظلوم روح پر پڑی جو اپنی قوم کے گناہوں اور غموں کو اپنے دوش ناتواں پر اٹھائے ہوئے تھی۔ جذبات کے ہجوم میں "بک آف لیمن ٹیشنز" (کتاب الحزن) کی یہ عبارت یاد آگئی۔ "اے لوگو جو گذر رہے ہو، کیا تمہارے لئے اس میں کچھ عبرت موجود نہیں ہے؟ دیکھو اور معلوم کرو کہ آیا میرے غم کی طرح دنیا میں کوئی اور غم ہے" اور غور وفکر کے اُن لمحات میں مجھے ایسی

بشنا زندگی سے صلیب کا حقیقی مفہوم پورے طور پر ذہن نشین ہو گیا

سب سے آخری نظارہ تفصیلی لحاظ سے غایت درجہ دلچسپی اور اہمیت سے مملو تھا۔ اس موقع پر بھی میں اس اڈیٹوریل کو نقل کروں گا جسے میں نے روزہ ختم ہو جانے پر لکھا تھا اور تمام واقعات کو بالترتیب بیان کیا تھا

جس دن برت توڑا گیا ہے اس سے ایک دن قبل شام کو مہاتما گاندھی حیرت انگیز طور پر مسرور اور بشاش نظر آ رہے تھے۔ ان کے بہت سے گہرے دوست ان سے ملنے کے لئے آئے جبکہ وہ مکان کی کھلی چھت پر اپنے بستر پر لیٹے ہوئے آرام کر رہے تھے۔ اس وقت چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی اگرچہ مدرسے میں ابھی چار راتیں باقی تھیں

شام کی پرارتھنا کا جب وقت آ گیا تو حسب معمول انہوں نے ہر شخص کو جو مکان میں تھا بشمولیت ان کانگریسی والنٹیروں کے جو ہر وقت حاضری میں رہتے تھے؛ پکارا تاکہ وہ بھی شام کی پوجا میں حصہ لے سکیں۔ بھگوت گیتا کا وہ حصہ جو سابرمتی آشرم میں ہر شام کو گایا جاتا ہے، سب نے مل کر گایا۔ اس کی ابتدا میں تو جسمانی حواس اور خواہشات پر روح کی فتح کا ذکر ہے اور اس کے آخر میں یہ ذکر درج ہے کہ جو شخص اس طرح سے فتح پا لیتا ہے اس کے دل میں اطمینان اور شانتی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میں نے اس بشاش چہرے پر نظر ڈالی اس وقت میں اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ جو الفاظ ابھی ادا کئے گئے ہیں، ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے

گیتا کے بعد ال کرسٹنا نے کبیر جی کا ایک بھجن گایا۔ اسی شام کو کچھ دیر بعد میں نے اس کا ترجمہ مانگا اور مجھے بتایا گیا کہ اس گیت میں کبیر نے ایک تائب کی حیثیت سے خدا سے خطاب کیا ہے اور اپنے آپ کو سب سے بڑا گناہگار قرار دیا ہے۔ خدا ہی

اس کا سمجھادینا ہی ہے۔ میں نے اپنے تجربہ سے یہ بات معلوم کرلی تھی کہ تپسیا اور روزہ کے دوران میں اس قسم کے بھجنوں سے انہیں نہایت خوشی ہوتی تھی۔ اس کے بعد دینوبا نے گیتا پسند کی عجیب و غریب تفسیر بیان کی، بعد ازاں بہت دیر تک خاموشی طاری رہی ایک ایک کرکے سب دوست چلے گئے اور وہ اکیلے رہ گئے

دوسرے دن صبح کے چار بجے سے قبل ہی ہمیں صبح کی نماز کے لئے طلب کرلیا گیا۔ اس وقت چاند غائب تھا اور بہت اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مشرقی سمت سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑی کے اوپر صاف اور کھلے آسمان پر صبح کا ستارہ چمک رہا تھا، درختوں کی مدھم صورتیں جو ہوا کی حرکت سے جنبش میں آجاتی تھیں، اس کھلے کمرے میں سے جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سیاہ رنگ کی شال اوڑھے ہوئے تھے اور میں نے ان سے پوچھا کہ آیا انہیں نیند اچھی آئی تھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہاں، بلاشبہ بہت اچھی نیند آئی تھی" یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ قبل کی صبح کے مقابلہ میں بجائے کمزوری کے ان کی آواز میں اور زور آگیا تھا خاموشی کے اس مذہبی پوری تصویر کھینچنا مشکل ہے جو طویل برت کے اس آخری دن قائم رہی جبکہ ہم سب بیٹھے ہوئے گھر کے تمام افراد کی آمد کا انتظار کررہے تھے ہم سب کو یہ بات یاد تھی کہ برت کا آخری دن بالآخر آن پہنچا ہے۔ اس کمرے کی تمام کھڑکیاں جس میں وہ فروکش تھے کھلی ہوئی تھیں؛ اور اب میں بیٹھا ہوا کبھی تو اس تصویر کو دیکھتا تھا جو اندھیرے میں بستر سے لگی بیٹھی تھی اور کبھی باہر کی طرف ستاروں کو تاکتا رہتا تھا

اس صبح کی خاص پرارتھنا میں جو بھجن گایا گیا وہ تھا جو مہاتماجی کو بہت

مرغوب تھا۔ وہ گجراتی میں ہے۔ اس میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے: "خدا تک پہنچنے کا راستہ صرف بہادروں کے لئے ہے۔ بزدلوں کے لئے نہیں ہے۔ ترکِ خودی کی تکمیل لازمی ہے۔ صرف وہی لوگ جو اس کی خاطر تن من دھن قربان کر سکتے ہیں اسے پا سکتے ہیں۔ ٹھیک جس طرح سے کہ غواص سمندر میں موتیوں کی خاطر غوطہ لگاتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح بہادر روحیں خدا کی تلاش میں بہت گہرا غوطہ لگایا کرتی ہیں"

پرارتھنا کے بعد صبح کی ساعتیں بہت جلد گذر گئیں، لیکن آٹھ بجے سے پیشتر ملنے والوں کی بہت بڑی تعداد آ چکی تھی۔ کچھ تو ان کے درشن کی اجازت ملنے کے بعد ہی چلے گئے، باقی روزہ کھولنے کا انتظار کرنے کی غرض سے ٹھہرے رہے۔ دس بجے کے قریب انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا: "کیا آپ کو میرے دلپسند عیسائی بھجن کے الفاظ یاد ہیں؟"

میں نے کہا کہ "ہاں، میں ابھی گا کر سناؤں گا"

"ابھی نہیں"۔ انہوں نے جواب دیا "لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جب روزہ کھولنے کا وقت آئے اس وقت چھوٹی سی تقریب عمل میں آ جائے جس سے مذاہب کے اتحاد کا اظہار ہوتا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ امام صاحب قرآن کریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں، اس کے بعد آپ وہ عیسائی بھجن سنائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری مراد کونسے بھجن سے ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ ہیں۔

'جب میں عجیب و غریب صلیب کو دیکھتا ہوں
جس پر شان و شوکت کے بادشاہ کا انتقال ہوا'

اور اس کے آخری الفاظ ہیں۔۔

محبت جو اس قدر حیرت انگیز اور خدائی صفات سے متصف ہے
'محبت میری روح، میری جان، غرض میرا سب کچھ طلب کرتی ہے'

اور پھر سب سے آخر میں دینو بابو سے کہوں گا کہ وہ اپنشد کا کچھ حصہ پڑھ کر سنائیں اور بالکرشنا سے درخواست کروں گا کہ وہ وشنوی بھجن پڑھ کر سنائیں جس میں ایشور جی کے سچے پرستار کی تعریف کی گئی ہے

جب میں نیچے اترا میں نے کرشنا داس کو بتایا کہ کیا کیا انتظامات عمل میں آئیں گے وہ اس دن بہت بیمار تھے اور مجھے معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ روحانی طور پر شریک ہو کر بہت مسرت حاصل کریں گے اگرچہ اس دوپہر کو وہ جسمانی طور پر وہاں موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ تمام لیڈر اور دوست جمع ہو گئے تھے۔ وہ خواتین بھی وہاں جمع تھیں جو محبت کے ساتھ ان کی خدمت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ جب وقت قریب آ گیا تو میں پھر اوپر گیا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ کمرے کے تمام آدمیوں حتیٰ کہ نوکروں کو بھی شریک رہنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس سے قبل میں صبح کے وقت میں ورزش کی غرض سے اس قلی کو اندر لے آیا جو سب کی نہایت وفاداری سے خدمت کرتا تھا۔ مہاتما جی نے اس سے مہربانی اور محبت کے چند کلمات کہے اور اس کی خدمات کا اعتراف نہایت شکر گزاری کی شکل میں دیا

اب دوپہر کا وقت آن پہنچا تھا اور ساتھ ہی روزہ کھولنے کا بھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹروں کو بلایا گیا اور انہوں نے ان سب کی محنت، عقیدت اور خبرگیری کا نہایت رقت آمیز الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ حکیم اجمل خاں بڑے تھے جنہوں نے ڈاکٹر اور دوست کی حیثیت سے روزے کے ایام میں ان کی امداد کی

تھی اور ہمیشہ دل خوش کن الفاظ سے ان کو مسرور رکھا تھا۔ مولانا محمد علی جو ان کے
نہایت مہرباں اور محبت کرنے والے میزبان تھے، بعد میں آئے اور پھر بغیر کسی مزید
حکم کے سب کے سب نہایت خاموشی کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہو گئے
اور محبت کے الفاظ کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کی اور بیٹھ گئے۔ جو خواتین موجود
تھیں بستر کے قریب آن بیٹھیں۔ سوامی شردھانند چارپائی کے پایہ کے قریب
بیٹھے، دعا کی حالت میں آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو، دیش
بندھو چترنجن داس، مولانا ابوالکلام آزاد، علی برادران بہت سے دیگر اشخاص
کے ساتھ چارپائی کے قریب بیٹھے ہوئے تھے

امام صاحب نے جو جنوبی افریقہ میں اور سابرمتی آشرم میں ان کے قریب
ترین دوستوں میں سے تھے، قرآن مجید کی دلاویز سورہ فاتحہ کی اس کے پرشکوہ
الفاظ میں تلاوت فرمائی جس میں خدا کو رحمٰن و رحیم، ساری کائنات کا رب
اور بنی نوع انسان کا مددگار بتایا گیا ہے۔ سورہ کے آخر میں خدا سے دعا مانگی گئی
ہے کہ وہ نیکی کے راستہ پر چلنے اور گناہگاروں کے طریقوں سے احتساب کرنے کی
توفیق عطا فرمائے۔ اس کے بعد جیسا کہ طے ہوا تھا، عیسائی بھجن گایا گیا۔ میں اس
کی آخری آیات نقل کرتا ہوں:۔

"دیکھو، اس کے سر، اس کے ہاتھوں اور اس کے پاؤں سے
رنج اور محبت دونوں مل کر بہ رہے ہیں۔
کیا رنج اور محبت آپس میں آج تک اس طرح سے ملے ہیں
یا کبھی کانٹوں کا ایسا قیمتی تاج تیار ہوا ہے؟

اگر قدرت کی ساری سلطنت میری ہوتی
تو وہ بھی نہایت حقیر پیشکش سمجھا جاتا !
محبت جو اس قدر حیرت انگیز اور خدائی صفات سے متصف ہے
مجھ سے میری روح، میری جان، الغرض میرا سب کچھ طلب کرتی ہے"

اس کے بعد اپنشد کے چند نہایت خوبصورت اشلوک ونیو بانے گا کر سنائے جن میں سے تین اشلوکوں کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے :-

"وہی لوگ دل کے اندر کی خدائی روشنی کا احساس کر سکتے ہیں جنھوں نے ہمیشہ سچائی، مراقبہ اور زہد پر عمل پیرا ہو کر تزکیۂ نفس حاصل کیا ہے
سچائی کی انتھک تلاش کے ذریعہ قدیم رشیوں نے اپنا مطمح نظر حتیٰ کہ خدائے برحق کو ڈھونڈ لیا ہے

میرے الفاظ سے میرے خیالات کی اور میرے خیالات سے میرے الفاظ کی تردید نہیں ہونی چاہیئے۔ میری دعا ہے کہ خدائی روشنی ہر وقت میرے روبرو جلوہ گر ہے۔ میری دعا ہے کہ میرا علم انہیں مجھے دھوکہ نہ دے ! میں ہمیشہ وہی کہوں گا جو سچ ہے اور سچ ہی بولوں گا"

"اوم، شانتی، شانتی" کہنے کے بعد اور یہ الفاظ نہایت ہی احترام کے ساتھ ادا کئے گئے تھے، بال کرشنا نے گانا شروع کر دیا۔ اس نے سچے وشنوا کی تعریف میں بھجن سنایا۔" سچا وشنوا وہ ہے جو دوسروں کی مصائب سے واقف ہوتا ہے اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہے ۔ وہ ہمیشہ خدمت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، وہ کبھی شیخی نہیں بگھارتا۔ وہ ہر شخص کے سامنے جھک جاتا ہے اور کبھی

کسی کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھتا، اور ہمیشہ اپنے خیال، قول اور فعل میں پاکیزہ رہتا ہے۔ ایسے شخص کی ماں مبارک ہے۔ وہ ہر عورت کا اپنی ماں کی طرح احترام کرتا ہے۔ وہ اپنا توازن دماغی برابر رکھتا ہے اور جھوٹ سے اپنے منہ کو آلودہ نہیں کرتا اور نہ وہ دوسرے کی دولت پر لالچ بھری نگاہیں ڈالتا ہے۔ تعلق کی زنجیریں اسے مقید نہیں کر سکتیں۔ وہ ہمیشہ رام نام[۱] کے ساتھ واصل رہتا ہے۔ اس کا جسم اپنے اندر تمام مقدس مقامات رکھتا ہے۔ وہ لالچ اور دھوکہ سے مبرا ہوتا ہے اور بغض و عناد کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ ایسا شخص ہی وشنو جی کا سچا پیرو کہلاتا ہے"

جب یہ تمام حصے بلند آواز سے پڑھے جا رہے تھے اس وقت یہ خیال حیرت انگیز طریقہ سے حسین معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس موقع کے لئے قطعاً موزوں ہیں اور یہ کہ جو شخص روزہ کھولنے کے انتظار میں لیٹا پڑا ہے، اس نے تکلیف و مصیبت کے مشکل راستہ پر گامزن رہ کر قریب قریب اپنے مطمع نظر کو حاصل کر لیا ہے۔ ہر شخص ان کی موزونیت کا احساس کر رہا تھا اور ان سب کے دل ایک دوسرے کے قریب کھنچ آئے تھے

روزہ کھولنے سے پہلے مہاتما گاندھی اپنے دوستوں سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے ان سے چند الفاظ کہے اور الفاظ ادا کرتے وقت وہ جذبات سے اس قدر متاثر نظر آتے تھے کہ ان کی جسمانی کمزوری کی وجہ سے ان کی آواز مشکل سے سنائی دے سکتی تھی، صرف وہی لوگ ان کے الفاظ سن سکے جو ان سے قریب ترین تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گذشتہ تیس سال سے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ان کے لئے جاذب توجہ رہا ہے اور وہ اب تک اسے حل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا کی مرضی کیا ہے

---

[۱] خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے

لیکن آج کے دن وہ حاضرین سے درخواست کریں گے کہ وہ وعدہ کریں کہ بشرط ضرورت وہ اس مقصد کے لئے اپنی جانیں تک دے ڈالیں گے۔ ہندوؤں کو اپنے مندروں میں کامل آزادی کے ساتھ اپنی عبادت کرنے کے قابل ہونا چاہیئے اور مسلمانوں کو بھی اپنی مساجد میں کامل آزادی کے ساتھ اپنی عبادت کرنے کے قابل ہونا چاہیئے اگر یہ معمولی سی آزادی بھی ہر جگہ نہ مل سکے تو پھر ہندو مذہب اور اسلام دونوں بے معنی سی چیز بن کر رہ جائیں گے

حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی طرف سے قسم کھائی اور یکا وعدہ کیا

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری نے نارنگی کا تھوڑا سا رس پیش کیا جسے مہاتما گاندھی نے پی لیا۔ اس طریقہ سے برت کھولا گیا، اور حاضرین کے مسرت اور شکر گذاری کے جذبات اتنے عیاں تھے کہ انہیں پورے طور پر الفاظ کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا ان کی خدمت میں مبارکباد کے ہدیے پیش کئے گئے اور وہ متاثر ہوئے بغیر خاموشی کے ساتھ آرام کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں کمرہ خالی ہوگیا۔ فقط مہاتما گاندھی خاموشی کی حالت میں پڑے رہ گئے اور روزہ کھولنے سے جو تکان پیدا ہوگئی تھی وہ اسطرح جاتی رہی دوسروں کی خاطر اُن کے تکلیف بھوگنے کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کی آویزشیں ایکا یک ختم ہوگئیں اور تمام ہندوستان کو جو اطمینان نصیب ہوا وہ حقیقتاً بہت زیادہ تھا۔ ابتدا میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے برت رکھا تھا اور دعائیں مانگی تھیں، وہ پورا ہوگیا ہے۔ بلاشبہ یہ بات سچائی کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے کہ اس کے بعد سے باہمی بداعتمادی

اور عناد کے بڑھتے ہوئے طوفان کی شدت میں بہت کمی آگئی تھی لیکن جو برائیاں صدیوں سے موجود ہوں، ایسے ایک فعل سے ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ لہٰذا یہ دیکھنا تعجب انگیز نہیں کہ بغض و عناد کے گرجتے ہوئے بادل پھر فضائے آسمانی میں نمودار ہو گئے اور ایک سال سے زیادہ عرصہ کے بعد فسادات از سر نو پھر شروع ہو گئے۔ روزہ کے اختتام پر بالائی کمرے میں جن جن اشخاص نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی جان تک دینے کا حلفیہ اقرار کیا تھا، وہ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ حکیم اجمل خان اور سوامی شردھانند دونوں نے، جو کمرے میں موجود تھے اور جنہوں نے حلفیہ وعدہ بھی کیا تھا اپنے اپنے طریقوں سے مہاتما گاندھی کی آواز پر لبیک کہی ہے۔ بعض دوسرے اشخاص نے بھی جو ابھی بقید حیات ہیں، تقریباً ساری نوعیت کی عظیم الشان قربانیاں کی ہیں۔ اس طرح سے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ خود مہاتما گاندھی کے ایمان کے ایک بہادرانہ فعل کی وجہ سے حل ہونے کی منزل کے قریب آن لگا ہے

باب نوزدہم

ہندوستان کی تحریک نسواں

جو مختلف دلچسپیاں ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی توجہ کو اپنی جانب مبذول رکھتی ہیں، اُن میں بہت کم ایسی ہیں جن کا مقابلہ اس دلچسپی سے کیا جا سکتا ہے جو انہیں ہندوستان کی تحریک نسواں سے ہے۔ اُن کی پختہ رائے ہے کہ مرد اور عورتیں مساوی ہیں اور جلسوں کی اس باہمی مساوات کے بنیادی اصول سے انھوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی انحراف نہیں کیا۔ جب کبھی میں نے ہندوستان کے دیہات میں اور دنیا کے دوسرے حصص میں جہاں کہیں ہندوستانی مقیم ہو گئے ہیں، کام کیا ہے، اس وقت میں مہاتما گاندھی کے ہندوستانی پروگرام (جس میں مرکزی اتحاد بھی شامل ہے) کی تشریح اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیاں بلند کر کے جو ایک کلائی سے وابستہ ہیں کیا کرتا ہوں۔ اولاً وہ چھوت چھات کا انسداد کرنا چاہتے ہیں۔ ثانیاً وہ شراب اور منشی ادویہ کی مکمل روک تھام چاہتے ہیں اور اس کی ضرورت پر ضرور دیتے ہیں بشرطیکہ ہندوستان آزادی اور عزتِ نفس حاصل کرنے کا متمنی ہو۔ ثالثاً ہاتھ کے مرکز کی طرف اشارہ کر کے میں مرد اور عورت کے درمیان کامل مساوات کا اظہار کرتا ہوں اس لئے کہ مہاتما گاندھی کے نظریۂ زندگی

میں یہ چیز بنیادی اور مرکزی ہے۔ باقی دو پہلو ہندو مسلم اتحاد اور دیہات میں کاتنے کی گھریلو صنعت ہیں۔ جو چیز اس پنج تاخہ پروگرام کو متحد کئے ہوئے ہے، وہ اہنسا کا اصول ہے جسے مہاتما گاندھی بہ حیثیت قوم کے اخلاقی اور روحانی ترقی کی غرض سے ہر متحدہ کوشش کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اہنسا کا یہ اصول گویا بمنزلہ کلائی کے ہے جو ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو متحد رکھتی ہے

اس باب میں میں مہاتما گاندھی کے بعض نہایت نمایاں اقوال کو پیش کروں گا جن کا تعلق ہندوستان میں عورتوں کے حقوق سے ہے۔ اگر اُن خرابیوں کے متعلق جو بدکاری کے نتائج کے طور پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں داخل ہو گئی ہیں، مابعد کے اقتباسات میں باہمی بیبستی معلوم ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید زمانہ میں مہاتما گاندھی کسی اور شخص کے مقابلہ میں وہ واحد بہادر اور دلیر آدمی ثابت ہوئے ہیں جنھوں نے انگلستان کی جوزیفائن بٹلر[1] کی طرح اس تکلیف دہ اور ادق مسئلہ پر نہایت بیخوفی کے ساتھ اور صفائی سے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ معاشرتی خرابی دوسرے ممالک کے بہ نسبت ہندوستان میں زیادہ عام ہے۔ غالباً بلحاظ وسعت وہ بہت کم وسیع ہے اس لئے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی آبادی جو مجموعی طور پر ۹۰ فی صدی ہے، دیہات میں زندگی بسر کرتی ہے جہاں یہ برائی ابھی تک نہیں پہونچی۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں جو

[1] Josephine Butler.

آبادی کے صرف ۱۰ فی صدی حصہ کی نمایندگی کرتے ہیں بدکاری کی یہ شکل زیادہ پائی جاتی ہے، لیکن جدید ہندوستان اپنے بڑے لیڈروں کی وساطت سے اس مسئلہ سے براہ راست دوچار ہونے کا مصمم ارادہ کرچکا ہے، اور خود ہندوستان کی معاشرتی زندگی بشرطیکہ موجودہ اخلاقی زور شور قائم رہا، معاشرتی اور اخلاقی پاکیزگی میں غالباً نمایاں ترقی کا مشاہدہ کرسکے گی۔ تاہم کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے بڑے جدید شہروں کی اصلی صورت حالات اس بارے میں تہذیب و شائستگی کے دامن پر بدنما داغ ہے اور وہاں یہ خرابی اس قدر راسخ ہوچکی ہے کہ اس کا کلّی انسداد زیادہ سے زیادہ جرأت اور روحانی طاقت کا طالب ہے

حال ہی میں مغربی اہل قلم نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں ہندوستانی عورتوں کی موجودہ حالت کی تصویر بعض اوقات بدترین قسم کی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس امر کو نظر انداز کردیا گیا ہے کہ آب و ہوا کے مقابلہ میں گرم ملک میں عورت پن لازمی طور پر تین چار سال قبل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اہم انسانی پہلو اس وقت ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے جب کبھی ہندوستان میں صغر سنی کی شادی اور پیدائش کے بارے میں اعداد پر غور کیا جائے۔ اس کے ساتھ صغر سنی کی شادی اور صغیر سن بیواؤں کے خلاف مہاتما گاندھی سے زیادہ موثر صدائے احتجاج کسی اور نے نہ بلند کی ہوگی اور آگے چل کر جو اقتباسات دئے گئے ہیں، وہ اسی مسئلہ پر ان کی رائے کو پیش کریں گے

اپنے آشرم میں انھوں نے ہر اس اصول کو جس کی تلقین انھوں نے

پبلک کے سامنے کی ہے، عملی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ سابرمتی کی عورتیں ہر لحاظ
سے مردوں کے برابر حق رکھتی ہیں۔ وہاں کسی پردہ کی بھی رکاوٹ حائل نہیں ہے
وہاں صغرسنی کی شادیاں عمل میں نہیں آتیں۔ وہ آشرم کے مردوں کے دوش
بدوش تمام امور میں اپنی رائیں پیش کرتی ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک اسکول
میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کی بہن بھائی
کی طرح تربیت کی جاتی ہے۔ سارے مشرق میں نوعمر لڑکیوں کے لئے اس سے
زیادہ آزاد اور مکمل ماحول کا ملنا مشکل ہے جتنا سابرمتی میں دیکھنے میں آسکتا ہے
میں اس بات کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ان امور کے متعلق میں نے جو کچھ
بیان کیا ہے، ان سب باتوں میں مہاتما گاندھی اور شاعر ٹیگور ہندوستان
میں عورتوں کی آزادی اور مساوات کے اصول پر متفق الرائے ہیں۔ ذیل کے
اقتباسات بطور نمونہ کے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ مہاتما
گاندھی اس مرکزی مسئلہ پر کیا خیالات رکھتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:-

"شریمتی سرلا دیوی (کٹک) لکھتی ہیں: 'کیا آپ تسلیم نہیں کرتے کہ ہندوستان
میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ بجائے خود بیماری ہے جو
چھوت چھات کی طرح خراب ہے؟'

میں اس خیال کی ہمنوائی کرنے سے قاصر ہوں کہ عورتوں کے ساتھ جو
سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ بیماری ہے جو چھوت چھات کی طرح خراب
ہے۔' شریمتی سرلا دیوی نے اس برائی کو بہت مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان
کیا ہے۔ مبالغہ آمیزی سے ہم ایک اچھے معاملہ کو خراب کر سکتے ہیں۔ اسکے ساتھ

ہی مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے کہ صحیح قسم کے سوراج کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے کی غرض سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے زیادہ احترام کرنا سیکھیں جو ہم عورتوں اور ان کی عفت وعصمت کے لئے روا رکھتے ہیں مسٹر اینڈریوز نے اس سے کہیں زیادہ صحیح بات کہی ہے جب وہ اپنے زوردار لہجہ میں یہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی گری ہوئی (بد اخلاق) بہنوں کی شرم پر اظہار مسرت کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے

ہم سب مردوں کو اپنی گردنیں مارے شرم کے جھکا لینی چاہئے جب تک کہ ایک بھی عورت ایسی موجود ہے جسے ہم اپنی شہوت رانی کے لئے وقف رکھتے ہیں۔ میں اسے پسند کروں گا کہ مردوں کی نسل کی نسل منقطع ہو جائے بجائے اس کے کہ ہم حیوانوں سے بھی پست تر ہو جائیں اور خدا کی بہترین اور شریف ترین مخلوق کو اپنی شہوت رانی کا آلہ بنائیں لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جو صرف ہندوستان تک محدود ہو، یہ تو تمام دنیا کا مسئلہ ہے۔ اور اگر میں شہوت رانی کی جدید مصنوعی زندگی کے خلاف وعظ کہتا ہوں اور مردوں اور عورتوں سے کہتا ہوں کہ وہ اس سادہ زندگی کی طرف لوٹ جائیں جو چرخہ میں مرکوز ہے تو میں یہ بات اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ سادگی کی طرف سمجھدار طریقہ سے لوٹے بغیر ہم اس حالت سے باہر نہیں نکل سکتے جو حیوانیت سے بھی پست تر ہے

میری دلی خواہش یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی ملے۔ میں صغر سنی کی شادیوں کے خلاف ہوں۔ میں صغر سن بیوہ کو دیکھ کر لرز جاتا

ہوں اور غصہ سے کانپنے لگتا ہوں جبکہ کوئی خاوند جس کی بیوی ابھی مر چکی ہو وحشیانہ بے اعتنائی کے ساتھ دوسری شادی کر لیتا ہے۔ میں اُن والدین کی مجرمانہ بے اعتنائی پر افسوس کرتا ہوں جو اپنی لڑکیوں کو بالکل جاہل اور اَن پڑھ رکھتے ہیں اور انہیں صرف اس غرض سے پالتے ہیں کہ کسی مالدار نوجوان سے اُن کی شادی کر کے انہیں رخصت کر دیں

اس تمام رنج اور غصہ کے باوجود میں مسئلہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔ عورتوں کو ووٹ (رائے) دینے کا حق اور مساوی قانونی درجہ ملنا چاہئے۔ لیکن مسئلہ یہاں پر آکر حل نہیں ہو جاتا، اس کا آغاز تو اس نکتہ پر ہوتا ہے جہاں عورتیں قوم کے مسائل پر غور کرنے کی ابتدا کرتی ہیں

اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے میں اس گفتگو کا حال درج کر دینا چاہتا ہوں جو میرے ایک محترم مسلمان دوست[1] نے لندن میں حقوق نسواں کی ایک مشہور و معروف حامی خاتون سے کی تھی۔ وہ عورتوں کے ایک جلسہ میں شریک تھے۔ اُن کی ایک خاتون دوست انہیں ایسے جلسہ میں دیکھکر سخت متعجب ہوئی۔ دوست نے جواب دیا کہ میں اس فعل کے لئے دو بڑے اور دو چھوٹے وجوہ رکھتا ہوں۔ میرے والد کا انتقال میری شیر خوارگی میں ہو گیا تھا۔ میں اپنی زندگی میں جو کچھ بھی بن سکا ہوں وہ سب میری ماں کا طفیل ہے۔ اس کے بعد میری شادی بھی ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو میری حقیقی شریک زندگی ثابت ہوئی اور میرا کوئی لڑکا نہیں لیکن چار لڑکیاں ہیں

---

[1] یہ اشارہ مولانا محمد علی (مرحوم) کی طرف ہے۔ مترجم

اور وہ سب نابالغ ہیں جن سے مجھے بہت گہری دلچسپی ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ امر تعجب انگیز ہے کہ میں عورتوں کے حقوق کا حامی ہوں؟'

آگے چل کر دوست نے بیان کیا کہ مسلمانوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عورتوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کبھی کوئی غلط بیانی نہیں کی گئی ہوگی۔ اسلام کا قانون عورتوں کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ مرد نے اپنی شہوت رانی کی بدولت عورت کے مرتبہ کو گرادیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کی روح کی پرستش کرتا اس نے اس کے جسم کی پرستش شروع کردی ہے اور وہ اس میں یہاں تک کامیاب ہوا ہے کہ آج عورت کو معلوم نہیں کہ اس نے اُسی جسمانی زیور سے پیار کرنا شروع کر دیا ہے جو ایک حد تک اُس کی غلامی کی نشانی تھی'۔ اس کے بعد انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: 'اگر بات ایسی نہیں ہے تو ہماری گری ہوئی اور پست، بہنیں اپنی جسمانی آرائش سے اس قدر دلچسپی کیوں لیتی ہیں؟ کیا ہم مردوں نے ان کی روح کو فنا نہیں کردیا ہے؟' اس کے بعد پھر اپنی طبیعت کو سنبھالتے ہوئے فرمایا: 'میں عورتوں کے لئے محض مشین کی سی آزادی نہیں چاہتا۔ میں ان زنجیروں کو بھی توڑ دینا چاہتا ہوں جن کا اس نے خود اپنی مرضی سے اضافہ کر رکھا ہے۔ اور اسی لئے میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی لڑکیوں کی تربیت اس طرح سے کروں کہ وہ خود مختار پیشہ اختیار کرسکیں'۔

میں اس خوبصورت اور دلاویز گفتگو کو اور زیادہ طوالت دینا نہیں چاہتا۔ میں اپنے لطیف نامہ نگار سے درخواست کروں گا کہ وہ مسلمان دوست کی گفتگو

کے مرکزی خیال پر غور کریں اور پھر مسئلہ کا حل سوچیں۔ عورت کو یہ خیال کرنا بند کر دینا چاہیئے کہ وہ مرد کی نفسانی خواہشات کا ایک آلہ ہے۔ اسے مردوں کی خاطر (جس میں اس کا خاوند بھی شامل ہے) بننے اور سنورنے کے خیال کو ترک کر دینا چاہیئے بشرطیکہ وہ مرد کے ساتھ مساوات حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میں یہ خیال کرنے سے قاصر ہوں کہ سیتا نے اپنی زندگی کا کبھی ایک منٹ بھی ضائع کیا ہو اس غرض سے کہ وہ رام کو اپنی جسمانی آرائش سے خوش کریں

جنوبی ہندوستان میں جتنے ایڈریس مجھے ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ دلدوز وہ ایڈریس تھا جو دیوا داسیوں کی طرف سے دیا گیا تھا اور یہ وہ عورتیں ہیں جو دیوتاؤں کی خدمت کے پردہ میں بدکاری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایڈریس ان لوگوں کی طرف سے تیار اور پیش کیا گیا تھا جو اس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن سے یہ بدقسمت بہنیں متعلق ہیں میں نے ایڈریس پیش کرنے والے وفد کی باتوں سے یہ خیال کیا کہ اندرونی معاشرتی اصلاح کا کام جاری ہے لیکن اس کی رفتار ترقی بہت سست ہے۔ وفد کے لیڈر نے مجھ سے بیان کیا کہ خود پبلک اس اصلاح سے بے اعتنائی برت رہی ہے۔ پہلا دھچکہ مجھ کو کوناڈا میں پہونچا تھا اور جب میں نے وہاں کے مردوں سے گفتگو کی تو اس وقت میں نے نہایت صاف گوئی سے کام لیا اور کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ دوسرا دھچکہ باریسال میں پہنچا جہاں میری ان بدقسمت بہنوں کی ایک بڑی تعداد سے ملاقات ہوئی۔ خواہ وہ

دیوداسی کے نام سے یاد کی جائیں خواہ کسی اور نام سے مسئلہ میں کوئی فرق پیدا
نہیں ہوتا۔ یہ نہایت شرم اور رنج اور ذلت کا مقام ہے کہ عورتوں کی ایک
وسیع تعداد کو مردوں کی شہوت رانی کی خاطر اپنی عصمت کو بیچنا پڑتا ہے
مرد جو واضع قوانین کی حیثیت رکھتا ہے اسے اس مذلت کی نہایت خوفناک
سزا بھگتنی پڑیگی جس میں اس نے اپنے سے کمزور جنس کو ڈال رکھا ہے جب
عورت مرد کے جالوں سے آزاد ہو کر اپنی انتہائی ترقی کو پہونچے گی اور مرد کے
بنائے ہوئے قانون اور اداروں کے خلاف بغاوت برپا کرے گی (اور
بلاشبہ اس کی بغاوت غیر متشددانہ ہوگی) تو وہ یقیناً بہت موثر چیز ہوگی
ہندوستانی مرد کو ان ہزارہا بہنوں کی بدقسمتی پر غور کرنا چاہیے۔ جو اس کی
ناجائز اور بد اخلاق عیاشی کی خاطر بدکاری کی ذلت آفرین زندگی بسر کر رہی
ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ مردوں کی ایک وسیع تعداد جو ان زہر پھیلانیوالے
مکانوں کا چکر لگاتے ہیں شادی شدہ ہوتے ہیں اور اس طرح سے وہ
دوسرے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف اپنی بیویوں کے خلاف
گناہ کرتے ہیں اور دوسری طرف ان بہنوں کے خلاف گناہ کرتے ہیں جنکی عفت
کو انہیں اسی جوش کے ساتھ بچانا اور محفوظ کرنا چاہیے جو اپنے رشتہ
داروں کی عزت کو بچانے میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی برائی ہے جو ایکدن
کے لئے جاری نہیں رہ سکتی اگر ہم ہندوستان کے مرد اپنی عزت کا احساس
کرنے لگ جائیں

• میں ہر نوجوان مرد سے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ،

درخواست کروں گا کہ وہ اُن تمام امور پر غور کرے جو میں نے اوپر تحریر کئے ہیں اس معاشرتی خرابی کے بارے میں جو اخلاقی کوڑھ کا درجہ رکھتی ہے، میں نے جو کچھ باتیں معلوم کی ہیں اُن سب کو میں حیطۂ تحریر میں نہیں لاسکتا۔ اسے اپنے تخیل کی امداد سے خانہ پُری کرلینی چاہیئے۔ اور پھر اگر وہ خود اُس گناہ کا مرتکب ہو چکا ہے تو شرم اور دہشت سے اپنی گردن جھکا لینی چاہیئے اور میری ہر پاکیزہ شخص سے خواہ وہ کوئی بھی ہو، یہ درخواست ہے کہ اپنے قرب و جوار کو پاکیزہ رکھنے کی غرض سے وہ جو کچھ کرسکتا ہے، اُس سے اسے دریغ نہ کرنا چاہیئے

اُن عورتوں سے جو بدکاری کے ذریعہ اپنی روزی کماتی ہیں، میری پہلی ملاقات صوبۂ آندھرا کے شہر کوکوناڈا میں ہوئی تھی۔ وہاں اُن میں سے صرف چھ عورتوں کے ساتھ تھوڑی دیر تک ملاقات رہی تھی۔ دوسرا موقع باریسال میں پیش آیا۔ ایسی ایک سو عورتوں نے وقت مقرر کرکے ملاقات کی تھی انھوں نے پہلے سے ملاقات کرنے کی غرض سے خط بھیجدیا تھا جس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ اگرچہ ہم کانگریس کی ممبر بن گئی ہیں اور تلک سوراج فنڈ میں بھی ہم نے چندہ دیا ہے، لیکن یہ بات ہم نہیں سمجھ سکیں کہ ہم مختلف کانگریس کمیٹیوں کی ممبر کیوں نہیں بن سکتیں۔ آخر میں انھوں نے درخواست کی تھی کہ ہمیں مستقبل کی بہبودی کے بارے میں بھی اپنا مشورہ دیجئے۔ جس شخص نے مجھے یہ چھٹی لاکر دی تھی، اس نے بہت ہی پس و پیش کے بعد میرے حوالے کیا کیونکہ وہ پریشان تھا کہ آیا ایسی چھٹی سے میں خوش ہوں گا یا ناراض۔ میں نے اسے یہ کہہ کر اطمینان دلایا

کی مقدور بھر خدمت کروں
کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنی ان بہنوں کی مقدور بھر خدمت کروں
وہ دو گھنٹے جو ان بہنوں کے ساتھ بسر ہوئے مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد
رہیں گے۔ ان کی موجودگی باریسال کے مردوں کے لئے باعث صد شرم ہے
اور بنگال جس قدر جلد اس لعنت سے آزاد ہو جائے، اتنا ہی اُسکی نیک
نامی کے لئے اچھا ہوگا۔ اور جو بات باریسال پر صادق آتی ہے، وہ درحقیقت
ہر شہر پر صادق آسکتی ہے۔ میں تو مثال کے طور پر باریسال کا نام لے رہا ہوں
ان بہنوں کی خدمت کرنے کا سہرا باریسال کے چند نوجوانوں کے سر ہے۔ میں
امید کرتا ہوں کہ باریسال جلد اس امر پر فخر کرنے کے قابل ہو جائیگا کہ اس
نے اس خرابی کا واقعی استیصال کر دیا ہے
وہ تمام خرابیاں جن کے لئے مرد نے اپنے آپ کو ذمہ دار بنالیا ہے، ان
میں سب سے زیادہ ذلت آفریں، سب سے زیادہ دل ہلا دینے والی اور سب
سے زیادہ وحشیانہ وہ بدسلوکی ہے جو اس نے بنی نوع انسان کے نصف
بہتر حصہ کے ساتھ کی ہے۔ میری نظر میں جنسِ اناث کمزور جنس نہیں
ہے بلکہ وہ دونوں جنسوں میں زیادہ شریفانہ ہے۔ اور آج بھی وہ قربانی خاموش
قوت برداشت، تواضع، ایمان اور علم کا مجسم پیکر ہے۔ عورت کی الہامی بات
بسا اوقات مرد کے اعلیٰ علم رکھنے کے مغرورانہ ادعا کے مقابلہ میں زیادہ سچی
ثابت ہوئی ہے
ہمیں غلطی سے اپنے دل میں اس خیال کو جگہ نہ دینی چاہئیے کہ بدکاری
ہمارے ارتقا میں ایک ضروری چیز ہے۔ کیونکہ وہ اس قدر پھیلی ہوئی ہے اور بعض

صورتوں میں مہذب یورپ میں سلطنت کی طرف سے اس پر نگرانی رکھی جاتی ہے۔ قدیم ہندوستانی مثالوں کی بنا پر ہمیں اس خرابی کو دوام نہ بخشنا چاہئے۔ جونہی ہم نیکی اور بدی میں تمیز کرنا بند کر دیں گے اور غلامانہ طریقہ سے اس ماضی کی نقل کرتے رہیں گے جس سے ہم کماحقہ، واقف نہیں ہیں، ہماری بالیدگی رُک جائے گی۔ ہم قدیم زمانہ کی ہر شریف ترین اور بہترین چیز کے وارث ہیں اور اس پر ہمیں فخر ہے۔ ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کو بڑھا کر اپنے اس ورثہ کی بے عزتی نہ کرنی چاہیئے۔ ایک غیر تمند ہندوستان میں کیا ہر مرد کو ہر عورت کی عزت کا اُتنا خیال نہ کرنا چاہیئے جتنا وہ اپنی بہن کا کرتا ہے؟ سوراج کے معنی ہیں کہ ہم میں ایسی قابلیت پیدا ہو جائے کہ ہم ہندوستان کے ہر باشندہ کو اپنا بھائی یا اپنی بہن سمجھنے لگ جائیں

اور اس لئے مرد ہونے کی حیثیت سے میں نے ان ایک سو بہنوں کے سامنے مارے ندامت کے اپنا سر جھکا لیا۔ بعض بڑی عمر کی تھیں، اکثر بیس اور تیس برس کی درمیانی عمر کی تھیں اور دو تین بارہ برس سے کم عمر کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے راز دارانہ طریقہ سے مجھ سے بیان کیا کہ ہماری چھ لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں جن میں سب سے بڑے کی شادی انہیں میں سے ایک سے ہو جائے گی لڑکیوں کی پرورش اس طریقہ سے ہو گی کہ وہ بڑی ہو کر یہی زندگی اختیار کریں بشرطیکہ اور کوئی راستہ نہ نکلا۔ اِن عورتوں کا یہ خیال کر لینا کہ ان کی قسمت اب بہتر نہیں ہو سکتی، مجھے تیر کی طرح لگا۔ اور اس کے باوجود وہ بہت سمجھدار اور شرمیلی تھیں۔ ان کی گفتگو وقار کا پہلو لئے ہوئے تھی، اُن کے جوابات پاکیزہ

اور سیدھے سادے اور آمیزش سے معرا تھے، اور تھوڑی دیر کے لئے تو اُن کا عزم ایک ستیا گرہی کی طرح بہت استوار معلوم ہوتا تھا۔ اُن میں سے گیارہ نے دوسروں سے اپنی موجودہ زندگی کو ترک کر دینے کا مصمم وعدہ کر لیا اور کہا کہ ہم کاتنے اور بننے کے کام کو اختیار کریں گے بشرطیکہ ہمیں امداد دی گئی باقیوں نے غور کرنے کے لئے مہلت طلب کی کیونکہ وہ مجھے دھوکہ دینا نہیں چاہتی تھیں

باریسال کے شہریوں کے لئے یہ کام موجود ہے، ہندوستان کے تمام مخلص کارکنوں کے لئے یہ کام موجود ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ اس سے قبل کہ اِن بدقسمت بہنوں کو اُن کی ذلت آفرین زندگی سے الگ کیا جائے دو شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔ ہم مردوں کو اپنی شہوانی قوتوں پر قابو رکھنا سیکھنا چاہیئے اور ان عورتوں کو کوئی ایسا پیشہ سیکھ لینا چاہیئے جس کی مدد سے وہ باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ عدم تعاون کی تحریک ایک بے معنی چیز ہو جائے گی اگر اس نے ہمیں پاکیزہ زندگی بسر کرنا اور اپنے نفسانی خیالات کو قابو میں رکھنا نہ سکھایا۔ اور کاتنے اور بننے کے سوائے اور کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جسے سب لوگ اختیار کر سکیں اور ساتھ ہی یہ معلوم ہو کہ وہ اُٹا ہوا نہیں ہے۔ ان بہنوں کو، کم سے کم اُن میں سے ایک وسیع تعداد کو شادی کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے اتفاق رائے کیا کہ وہ شادی نہیں کر سکتیں۔ اس لئے انہیں ہندوستان کی سچی سنیاسنیں بن جانا چاہیئے۔ زندگی کے افکار و آلام نہ رکھتے ہوئے بلکہ صرف خدمت کا

تخیل رکھتے ہوئے وہ جی بھر کر کاتنے اور بننے کا کام کر سکتی ہیں

لیکن تم نوجوانوں سے جو میرے ارد گرد ہیں، میں جس کام کی توقع رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم میں تھوڑا بہت بہادری اور شجاعت کا احساس ہونا چاہیے۔ اگر تم میں وہ جذبہ موجود ہے تو پھر میں تمہارے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم میں سے اکثر کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم یہ مقدس وعدہ کرو کہ تم کسی ایسی لڑکی سے شادی نہ کرو گے جو بیوہ نہ ہوگی، اتم کوشش کرکے بیوہ لڑکی کی جستجو کرو گے اور اگر تمہیں بیوہ لڑکی نہ ملے تو تم شادی نہیں کرو گے۔ یہ عزم کرلو اور تمام دنیا میں اس کا اعلان کر دو، اپنے والدین کو بھی بتا دو (اگر وہ بقید حیات ہوں) یا اپنی بہنوں سے کہہ دو۔ میں انہیں تصیحح کی غرض سے انہیں بیوہ لڑکیاں کہتا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ دس یا پندرہ برس کی بچی جو اپنی مفروضہ شادی میں رضامند فریق کی حیثیت نہیں رکھ سکتی، جس نے شادی کر لینے کے بعد بھی نام نہاد خاوند کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی، یکا یک بیوہ بن جاتی ہے، در حقیقت بیوہ نہیں ہے۔ یہ لفظ کا غلط استعمال ہے، یہ زبان کا غلط استعمال ہے اور مذہب کی ہتک ہے

ہندو مذہب میں لفظ "بیوہ" اپنے اندر ایک مقدس معنی رکھتا ہے۔ میں مرحومہ مسز رامابائی راناڈے کی طرح سچی بیوہ کا پرستار ہوں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بیوہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے لیکن نو برس کی بچی کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ خاوند کو کیسا ہونا چاہئے اگر یہ سچ نہیں ہے کہ صوبہ میں ایسی بیوہ لڑکیاں موجود ہیں تو پھر

مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہیں لیکن اگر ایسی لڑکیاں موجود ہیں تو پھر تمہارا مقدس فرض
ہو جاتا ہے کہ تم کسی بیوہ لڑکی سے عقد کرنیکا مصمم ارادہ کرلو بشرطیکہ تم اس لعنت کو
دور کرنے کی خواہش رکھتے ہو۔ میں اتنا اوہام پرست ضرور ہوں کہ یہ یقین کرلوں کہ یہ تمام
گناہ جنکی ہماری قوم مرتکب ہوتی ہے، مادی دنیا میں ہم پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے
میرا عقیدہ ہے کہ ہمارے ان تمام گناہوں نے جمع ہوتے ہوتے ہمیں غلامی کی حالت تک
پہنچا دیا ہے۔ فرض کرلو کہ دارالعوام کی طرف سے ہم پر بہتر سے بہتر دستور نازل کر دیا جائے
لیکن وہ بیکار سی شے ہوگا۔ اگر اس دستور کو عمل میں لانے کے لئے موزوں اور قابل مرد اور
عورتیں نہ ملیں گی۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم اپنے آپکو اسوقت تک ایسے مرد کہہ
سکتے ہیں جو خود اپنے اوپر یا دوسروں پر حکومت کرنے کے قابل ہوں، یا ایسی قوم
کی قسمت کو بنانیوالے ہوں جو تیس کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ جبتک کہ ایک بھی بیوہ
ایسی ہو جو اپنی لازمی ضروریات کو پورا تو کرنا چاہتی ہو لیکن اُسے متشددانہ
طریقہ سے ایسا کرنے سے منع کیا جاتا ہو۔ یہ مذہب نہیں ہے بلکہ لامذہبیت
ہے۔ میں یہ بات اس لئے کہتا ہوں کہ مجھ میں ہندو مذہب پوری طرح ساری
ہے۔ یہ غلطی نہ کھانا کہ مغربی اسپرٹ میرے اندرون سے بول رہی ہے۔ میرا
دعویٰ ہے کہ وہ میری رگوں میں پاک و مقدس ہندوستان کی روح دوڑ
رہی ہے۔ میں نے بلاشبہ مغرب کی بہت سی باتوں کو اپنے اندر جذب کرلیا
ہے لیکن یہ چیز مغربی نہیں ہے، ہندو مذہب میں اس قسم کی بیوگی کو کبھی
حق بجانب ٹھہرانے کی کوئی سند موجود نہیں ہے"

باب ہشتم

گاندھی کیساتھ ایک صبح

دہلی میں برت کے زمانہ میں شانتی نکیتن سے میرا ایک شاگرد رام چندرن نامی آگیا جو ریاست ٹراونکور کے وزیر مالیات کا صاحبزادہ تھا اور میرے پاس اس غرض سے مقیم رہا کہ اگر ایسے نازک موقع پر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو اُسے وہ بجالائے۔ شانتی نکیتن میں وہ شاعر رابندرا ناتھ ٹیگور سے تعلیم حاصل کیا کرتا تھا جو وہاں عام طور پر "گوردیو" کے نام سے مشہور ہیں بعینہٖ جس طرح سے کہ مسٹر گاندھی سابرمتی میں "باپوجی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آرٹ، شادی اور مشینوں کے استعمال کے بارے میں بعض مشکل سوالات مدتِ دراز سے اُسے پریشان کئے ہوئے تھے اور وہ اُن کے متعلق مہاتما گاندھی کی رائے معلوم کرنے کے لئے بے حد پریشان تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ ذاتی طور پر مہاتما کا بہ سبب اُن کی مقدس زندگی کے بیحد معتقد تھا، تاہم وہ اپنے دل میں شانتی نکیتن کے مقابلتاً کم دہاتیانہ مطامحِ نظر کا مداح تھا

ابتدا میں اس نے اپنے سوالات کا خود مسٹر گاندھی سے حل دریافت کرنے میں بہت ہچکچاہٹ برتی لیکن جب برت ختم ہو گیا تو ایک دن صبح کو میں نے زور دیکر اسے اپنے سوالات پیش کرنے کے لئے کہا۔ بعد میں مہادیو دیسائی نے

اس نظارہ اور گفتگو کا مکمل اور صحیح حال جو ملاقات کے موقع پر موجود تھے، "ینگ انڈیا" کے لئے تحریر کردیا جو حسب ذیل ہے:-

"برت، قربانی اور دعا کے زمانہ میں جو لوگ دہلی آئے ان میں شانتی نکیتن کا ایک نوجوان طالب علم رام چندرن نامی بھی تھا۔ وہ مسٹر اینڈریوز کا ایک شاگرد ہے اور جسے اپنے استاد سے اس غرض سے اجازت لینے میں کہ برت کے اختتام کے بعد وہ کچھ عرصہ دہلی میں ٹھہر سکے، کچھ دقت محسوس نہیں ہوئی۔ آخر میں مسٹر اینڈریوز رام چندرن کو بالاخانہ پر لے گئے اور گاندھی جی سے کہا: میں نے ابھی تک آپ سے رام چندرن کا تعارف نہیں کرایا لیکن اس تمام عرصہ میں وہ ہمارے ساتھ ہی رہا ہے اور سچی محبت کے ساتھ خلوص دل سے ہماری امداد کرتا رہا ہے۔ اور میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ اس کے ساتھ گفتگو فرمالیں گے اس سے قبل کہ وہ کل شانتی نکیتن واپس چلا جائے۔ گاندھی جی نے فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کردیا

'اس کی کیا وجہ ہے کہ بہت سے سمجھدار اور ممتاز افراد جو آپ سے محبت رکھتے ہیں اور آپ کی تعریف کرتے ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ آپ نے قومی احیا کی اسکیم میں آرٹ کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی؟' رام چندرن نے پوچھا

گاندھی جی نے جواب دیا: 'مجھے افسوس ہے کہ اس معاملہ میں بالعموم میرے خیالات کو غلط سمجھا گیا ہے۔ مجھے تشریح کرنے دو۔ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ظاہری اور باطنی۔ میرے نزدیک یہ مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ کس پہلو پر زیادہ زور دیا جائے۔ ظاہری پہلو میری نظر میں بے حقیقت چیز ہے سوائے اس

حد تک کہ وہ باطن کی امداد کرتا ہے۔ تمام سچا آرٹ روح کا مظہر ہوتا ہے ظاہری اشکال کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ وہ انسان کے اندرونی جذبات کو ظاہر کرتے ہیں'

رام چندرن نے تامل کے بعد کہا: 'بڑے بڑے آرٹسٹوں نے خود یہ بات کہی ہے کہ آرٹ نام ہے دراصل آرٹسٹ کی روح کے اندرونی جذبات اور بیکلی کا جو لفظوں، رنگوں اور شکلوں کے ذریعہ ظاہر کیجاتی ہے'

گاندھی جی نے فرمایا: 'ہاں، اُسی قسم کے آرٹ کا میرے دل پر بہت اثر ہوتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے تئیں آرٹسٹ کہتے ہیں مگر اُن کے کاموں میں روح کی بلند خیالی اور بے چینی کا شائبہ تک نہیں ہوتا'

'کیا آپ کے ذہن میں کوئی مثال موجود ہے؟'

گاندھی جی نے جواب دیا: 'ہاں۔ آسکر وائلڈ[1] کی مثال لو۔ میں اس کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ جس زمانہ میں اس کے بارے میں بحث و مباحثہ ہو رہا تھا اور لوگ اسی کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہے تھے، اسوقت میں انگلستان ہی میں موجود تھا'

رام چندرن نے کہا: 'لیکن مجھے تو بتایا گیا ہے کہ آسکر وائلڈ موجودہ دور کا ایک زبردست لٹریری آرٹسٹ ہو گذرا ہے'

'ہاں، میری مشکل بس یہی ہے۔ وائلڈ صرف ظاہری اشکال میں بہترین آرٹ

---

[1] Oscar Wilde

دیکھتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ بداخلاقی کو خوبصورت بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تمام سچے آرٹ کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ روح کی اعانت کرے تاکہ وہ اپنی اندرونی حقیقت کو پہچانے۔ میں اپنے متعلق تو اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اپنی روح کی تکمیل میں ظاہری اشکال کی مطلقاً حاجت نہیں۔ لہٰذا میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میری زندگی میں کافی سچا آرٹ موجود ہے خواہ آپ میرے گرد و پیش بہترین آرٹ کے کام نہ دیکھیں۔ میرے کمرے کی دیواریں ننگی ہو سکتی ہیں اور ممکن ہے کہ سرے سے میں چھت کو بھی ہٹا دوں تاکہ میں سر پر اوپر تاروں بھرے آسمان کو دیکھ سکوں جو خوبصورتی کی نہ ختم ہونے والے پہنا میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کونسا شعوری آرٹ ایسا ہے جو اس سے بہتر نظارہ مجھے دکھا سکتا ہے جو میری نظروں کے سامنے خود بخود نظر آجاتا ہے جبکہ میں اوپر آسمان کو مع اس کے تمام چمکتے ہوئے تاروں کے دیکھتا ہوں؟ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ آرٹ کے انسانی کاموں کی میرے دل میں قدر و قیمت نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہ میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کی خوبصورتی کی ان دائمی نشانیوں کے مقابلہ میں یہ چیزیں ناکافی معلوم ہوتی ہیں۔

"لیکن آرٹسٹوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ظاہری خوبصورتی میں سچائی دیکھتے ہیں اور سچائی پا لیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سچائی کو اس طور پر دیکھا اور پا لیا جائے؟" رام چندرن نے پوچھا

گاندھی جی نے فی الفور جواب دیا: "میں اس ترتیب کو اُلٹ دینا چاہتا ہوں

میں سچائی کے ذریعہ خوبصورتی دیکھتا ہوں اور پاتا ہوں۔ تمام سچائیاں نہ صرف سچے خیالات بلکہ سچے چہرے، سچی تصاویر، سچے گیت بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں جب کبھی لوگ سچائی میں خوبصورتی پانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں سو تب آرٹ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے'

'لیکن کیا خوبصورتی سچائی سے اور سچائی خوبصورتی سے جدا کیجا سکتی ہے؟'

رام چندرن نے پوچھا

گاندھی جی نے جواب دیا: 'میں ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ خوبصورتی کیا چیز ہے۔ اگر اس کا مفہوم وہی ہے جو بالعموم لوگ سمجھتے ہیں، تو اس میں بیحد اختلافات موجود ہیں۔ کیا اچھے خد و خال کی عورت درحقیقت خوبصورت ہوتی ہے؟'

رام چندرن نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا: 'جی ہاں'

باپو نے اپنے سوال کو جاری رکھتے ہوئے کہا: 'خواہ اس وقت بھی جبکہ اس کی سیرت خراب ہو؟'

رام چندرن رُکا۔ اس نے کہا: 'تو اس حالت میں اس کا چہرہ خوبصورت نہیں ہو سکتا'

گاندھی جی نے جواب دیا: 'تم نے میرا سوال بھانپ لیا تم اب تسلیم کرتے ہو کہ محض ظاہری شکل کسی چیز کو خوبصورت نہیں بنا سکتی۔ سچے آرٹسٹ کے لئے صرف وہی چہرہ خوبصورت ہے جو اس کی ظاہری شکل سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اس کی روح کے اندر سچائی کے ساتھ چمکتا ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں

سچائی سے الگ کوئی خوبصورتی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے سچائی اپنے تئیں ایسی صورتوں میں اپنے آپ کو جلوہ گر کر سکتی ہے جو بظاہر بالکل خوبصورت نہ ہوں۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ سقراط اپنے زمانہ کا سب سے سچا آدمی تھا اور باوجود اس کے تمام یونان میں اس کے خدوخال بدترین تھے میرے خیال میں وہ خوبصورت تھا اس لئے کہ زندگی بھر وہ سچائی کا متلاشی رہا۔ اور مت کو یاد رکھنا چاہئے کہ فڈیاس[1] کو اس کی اندرونی سچائی کی قدر کرنے میں اس کی ظاہری صورت مانع نہ آسکی، اگرچہ آرٹسٹ کی حیثیت سے وہ ظاہر اشکال میں خوبصورتی دیکھنے کا خوگر تھا؛

رام چندرن نے کہا: "مگر باپو جی، نہایت خوبصورت چیزیں اکثر ایسے آدمیوں کی محنتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کی زندگیاں خوبصورت نہ تھیں"

گاندھی جی نے جواب دیا: "اس کے معنی تو صرف یہ ہوئے کہ سچائی اور غیر سچائی بعض اوقات توام پائی جاتی ہے، اچھائی اور برائی دونوں بسا اوقات ایک ساتھ ملتی ہیں۔ ایک آرٹسٹ میں بھی کبھی کبھی اشیا کا صحیح تخیل اور غلط تخیل ایک ساتھ ملتا ہے، حقیقی خوبصورت مصنوعات صرف اس وقت معرض وجود میں آتی ہیں جبکہ صحیح تخیل کارفرما ہو۔ اگر یہ لمحات زندگی میں شاذونادر ہی جلوہ گر ہوتے ہیں تو آرٹ میں بھی وہ شاذونادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں"

"باپو جی، کیا ایسی چیزوں میں بھی سچائی ہے جو بجائے خود نہ تو نیک ہیں نہ بد؟

[1] فڈیاس قدیم یونان کا سب سے بڑا بت تراش تھا۔ وہ بادشاہ کیطرف سے شہر کو خوبصورت اور مختلف دیوتاؤں کے مجسمے بنانے کے کام پر مامور تھا۔ اسکی موت ۴۳۲ سال قبل مسیح واقع ہوئی

مثلاً کیا غروبِ آفتاب میں یا ہلال میں جو رات کے وقت تاروں میں چمکتا ہے کوئی سچائی پائی جاتی ہے؟'

گاندھی جی نے جواب دیا: 'بلاشبہ۔ یہ خوبصورت چیزیں سچی ہیں جہاں تک کہ وہ مجھے اپنی موجودگی سے خالق کی یاد دلاتی ہیں۔ اگر ان میں سچائی نہ ہوتی جو مخلوق کی جان ہے تو یہ کیسے خوبصورت ہو سکتی تھیں؟ جب میں غروبِ آفتاب یا چاند کے حُسن کی تعریف کرتا ہوں تو اس وقت میری روح خالق کی عبادت میں تمام کائنات میں پھیل جاتی ہے۔ میں ان تمام مخلوق چیزوں میں اسے اور اس کی مہربانیوں کو جلوہ فرما دیکھتا ہوں لیکن طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے مناظر محض رکاوٹیں ہیں اگر وہ خالق کا تصور کرنے میں میری امداد نہ کریں۔ جو چیز میری روح کی ترقی اور اس کے پھیلاؤ میں رکاوٹ ثابت ہو، وہ مایا ہے اور دھوکہ ہے۔ ٹھیک جس طرح سے یہ جسم جو بسا اوقات نجات کی راہ میں فی الحقیقت حائل ہو جاتا ہے'

'کیا آپ ہر قسم کی مشینری کے خلاف ہیں؟' رام چندرن نے پوچھا

انھوں نے جواب دیا کہ 'میں کیسے خلاف ہو سکتا ہوں جب میں یہ جانتا ہوں کہ جسم بھی نہایت نازک قسم کی ایک مشینری ہے؟ چرخہ بجائے خود ایک مشین ہے جس چیز پر میں اعتراض کرتا ہوں وہ مشینری کیلئے لوگوں کی دارفتگی ہے نہ کہ خود مشینری۔ دیوانہ پن اس شے کے لئے ہے جسے وہ محنت سے بچانے والی مشینری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لوگ "محنت کو بچاتے" چلے جا رہے ہیں خواہ لاکھوں آدمی بیکار ہی کیوں نہ ہو جائیں اور سڑکوں پر

بچھڑنے کی وجہ سے فاقہ سے کیوں نہ مرجائیں میں خود وقت اور محنت بچانا چاہتا ہوں لیکن بنی نوع کے ایک چھوٹے سے حصہ کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے میں خود دولت کا اجتماع دیکھنا پسند کرتا ہوں لیکن صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ سب کے ہاتھوں میں۔ آج حالت یہ ہے کہ مشینری صرف چند اشخاص کی امداد کرتی ہے تاکہ وہ کروڑپتی ہو جائیں اس کی تہ میں جو قوت متحرکہ کام کر رہی ہے وہ محنت بچانے کی ہمدردی نہیں ہے بلکہ حرص ہے۔ اشیا کے اسی نظام کیخلاف میں اپنی پوری طاقت سے جنگ کر رہا ہوں"

رام چندرن نے کہا: "تو پھر باپو جی، آپ مشینری کے خلاف مشینری کی حیثیت سے جنگ آزما نہیں ہیں بلکہ اس کے برے پہلوؤں کے خلاف آپ جنگ کر رہے ہیں جو آج اس قدر کثرت سے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں"

"میں بغیر تامل کے جواب دونگا کہ "ہاں" لیکن ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس چیز کی سب سے پہلے ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سائنٹفک سچائیوں اور انکشافات حرص دہوا کے محض آلات ہی نہ بنیں۔ اس کے بعد مزدوروں کو بساط سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا اور مشینری رکاوٹ بننے کی بجائے امداد بن جائے گی۔ میں جملہ اقسام مشینری کے خلاف جد وجہد نہیں کر رہا ہوں بلکہ اسے محدود کر دینا چاہتا ہوں"

رام چندرن نے پوچھا: "اگر از روئے منطق بحث کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام پیچیدہ طاقت سے چلنے والی مشینری کا خاتمہ ہو جانا چاہئے"

گاندھی جی نے تسلیم کیا کہ "ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ ہو جائے، لیکن میں

ایک بات واضح کردینی چاہتا ہوں۔ سب سے اعلیٰ چیز جو غور و فکر کے قابل ہے وہ انسان ہے۔ مشین کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اعضائے نسلی کو خشک کردے۔ مثلاً میں چند مستثنیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سنگر سوئنگ مشین کو لو۔ یہ اُن معدودے چند مفید چیزوں میں سے ایک ہے جو ایجاد ہوئی ہیں اور خود اس ایجاد کے بارے میں ایک رومان ہے۔ مسٹر سنگر نے اپنی بیوی کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے سینے کے تکلیف دہ عمل سے پریشان ہو رہی ہیں اور انھوں نے محض ان کی محبت کی خاطر سینے کی مشین کو بہتر بنا دیا تاکہ انہیں غیر ضروری محنت سے بچائیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی محنت بچا دی بلکہ ہر اُس شخص کی محنت بچا دی جو سینے کی مشین خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے'

'لیکن اس صورت میں ان سنگر سوئنگ مشینوں کو بنانے کی غرض سے ایک کارخانہ ہونا چاہیئے اور اس میں طاقت سے چلنے والی معمولی قسم کی مشینری بھی ہونی چاہیئے' رام چندرن نے کہا

باپو نے رام چندرن کی مسرت آمیز مخالفت پر مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ 'ہاں لیکن میں اتنا سوشلسٹ ہوں کہ یہ کہوں کہ ایسے کارخانوں کو قومی سرمایہ قرار پانا چاہیئے۔ انہیں صرف نہایت اچھی شرائط پر چلانا چاہیئے نفع پیدا کرنے کی خاطر نہیں بلکہ بنی نوع انساں کو فائدہ پہونچانے کی خاطر اور قوت متحرکہ لالچ کی بجائے محبت ہونی چاہیئے۔ میں جو بات چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حالات مزدوری میں تبدیلی پیدا کردی جائے حصول دولت

کے لئے یہ دیوانہ وار جدوجہد ختم ہو جانی چاہیئے۔ اور مزدور کو اس امر کا یقین دلا دینا چاہیئے کہ اسے نہ صرف زندہ رکھنے کی خاطر مزدوری ملے گی بلکہ روزانہ اتنا کام ملے گا جو اسے مصیبت نہ معلوم ہوگا۔ ان حالات کے ماتحت مشین خود مزدور کے لئے اتنی ہی باعث اعانت ہو گی جتنی کہ سلطنت کے لئے ہو سکتی ہے موجودہ دیوانہ وار دوڑ کا خاتمہ ہو جائیگا اور مزدور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) زیادہ مرغوب اور دلفریب حالات کے ماتحت کام کرنے لگ جائیں گے۔ یہ اُن مستثنیات میں سے ایک ہے جو میرے خیال میں آئی ہے۔ سوئنگ مشین کی تہہ میں محبت کارفرما تھی۔ فرد واحد ہی وہ اعلیٰ ترین چیز ہے جس کی بہبودی کا تخیل ہمیں اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ انسان کی محنت کو بچانا انتہائی مقصد ہونا چاہیئے اور بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے ایماندارانہ جذبات کو نہ کہ حرص و طمع کو قوت متحرکہ کا کام دینا چاہیئے۔ اس طرح سے مثالاً میں ہر ایسی مشین کا خیر مقدم کروں گا جو ٹیڑھے تکلوں کو سیدھا کر دے۔ یہ بات نہیں کہ لوہار اس چیز کی بہم رسانی بند کر دیں گے بلکہ یہ کہ تکلے کے خراب ہو جانے کی صورت میں ہر کاتنے والے کے پاس سیدھا کرنے والی اپنی مشین ہو گی۔ لہٰذا محبت کو حرص و طمع کی جگہ لے لینی چاہیئے اور پھر ہر بات ٹھیک ہو جائے گی'

رام چندرن نے کہا کہ 'تیسرا سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ آیا آپ مسئلہ شادی کے خلاف ہیں؟'

باپو نے کہا کہ 'میں اس سوال کا جواب قدرے تفصیل کے ساتھ دونگا

انسانی زندگی کا مقصد نجات ہے۔ بہ حیثیت ہندو کے میرا عقیدہ یہ ہے کہ پیدائش کے چکر سے آزادی حاصل کرنے کا نام نجات ہے اس طرح سے کہ تمام جسمانی تعلقات منقطع ہو جائیں اور خدا کا وصال حاصل ہو جائے۔ اب شادی اس اعلیٰ مقصد کے حصول میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اس لئے کہ وہ جسمانی تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کر دیتی ہے۔ تجرد بہت حد تک معاون ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ وہ انسان کو کامل تسلیم و رضا کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ شادی کا عام طور سے جو مقصد سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں کی تعداد میں اضافہ کرے! اور تمہیں شادی کی تبلیغ کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اپنے آپ ہی کی افزائش کرتی ہے۔ اسے ترقی دینے کیلئے کسی ایجنسی کی ضرورت نہیں'

لیکن کیا آپ تجرد کی تبلیغ کریں گے اور ہر کس و ناکس تک اس کا پیام پہونچائیں گے؟'

گاندھی جی نے جواب دیا؛ 'ہاں'۔ رام چندرن ذرا پریشان ہو گیا۔

'تو کیا تم کو اندیشہ ہے کہ یہ تمام کائنات ختم ہو جائے گی؟ نہیں۔ انتہائی منطقی نتیجہ جو نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان معدوم نہیں ہوں گے بلکہ وہ اعلیٰ طبقہ پر منتقل ہو جائیں گے'

'لیکن کیا ایک آرٹسٹ، یا ایک شاعر یا ایک بہت زبردست ہستی آنے والی نسلوں کے لئے اپنے بچوں کی شکل میں اپنی غیر معمولی ذہنی قابلیت کا ورثہ نہیں چھوڑ جاتی؟'

باپو نے زور دیکر کہا کہ 'نہیں، بچوں سے کہیں اچھا ورثہ اس کے شاگرد ہوسکتے ہیں اور ان شاگردوں کی وساطت سے اس کے سارے تحائف جو اس نے دنیا کو دئے ہیں، ایسے طریقے سے پہونچائے جاسکتے ہیں کہ کسی اور طرح اُن کی تکمیل ممکن نہیں ہوسکتی، وہ اسپرٹ کے ساتھ روح کی شادی ہے اور بچے شاگرد کی شکل میں ظہور میں آئیں گے جو درحقیقت تلمیذ الرحمٰن ہوں گے نہیں تمہیں شادی کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہئے، وہ آپ اپنا فکر کرلے گی۔ افزائش نسل نہ کہ ارتقا اس کا نتیجہ ہوگا اس لئے کہ شہوت شادی کا نہایت اہم جزو بن گیا ہے'

رام چندرن نے کہا: 'آپ تجرد پر جو اس قدر زور دے رہے ہیں اُسے مسٹر اینڈریوز پسند نہیں کرتے'

گاندھی جی نے جواب دیا: 'ہاں، مجھے معلوم ہے یہ انکے پروٹسٹنٹ ازم (وہابیانہ خیالات) کا ورثہ ہے۔ پروٹسٹنٹ ازم نے بہت سی اچھی باتیں کی ہیں، لیکن اس کی چند برائیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تجرد کی زندگی کا مذاق اڑایا ہے'

رام چندرن نے جواب دیا کہ 'اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے ان خرابیوں کے خلاف جنگ کرنی تھی جس میں ازمنۂ وسطیٰ کے پادری مبتلا تھے'

باپو نے کہا: 'لیکن وہ سب کچھ تجرد کی بنیادی خرابی کا نتیجہ نہ تھا۔ یہ تجرد ہی ہے جس نے کیتھولک مذہب کو آج تک سرسبز حالت میں رکھا ہے'

رام چندرن کا دوسرا سوال 'کاتنے کی شرط' کے بارے میں

تھا جسے گاندھی جی نے عائد کیا تھا اور جس پر اس قدر بحث وتمحیص ہو چکی ہے
اور وہ یہ ہے کہ کسی ایسے آدمی کو نیشنل کانگریس کا ممبر نہ ہونا چاہیئے جو اپنے
ہاتھ سے نہ کاتے۔ رام چندرن نے شروع ہی میں گاندھی جی کو یقین دلا
دیا تھا کہ اگرچہ وہ خود کاتا کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے تین اور
دوستوں کی معیت میں اس وقت کاتنا شروع کیا تھا جب اُسے برت
کی اطلاع ملی تھی لیکن جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ
کانگریس کس طرح سے اپنے ممبروں کو کاتنے پر مجبور کر سکتی ہے۔
ترغیب وتحریص سے کام لینا چاہیئے نہ کہ جبر سے'

گاندھی جی نے کہا: "میں سمجھا تم تو چارلی اینڈریوز سے بھی آگے ہو۔
وہ نہیں چاہتے کہ کانگریس اپنے ممبروں کو مجبور کرے لیکن وہ رضاکارانہ
کاتنے والی انجمن کے ممبر بننے پر معترض نہ ہوں گے۔ تم سرے سے ایسوسی ایشن
ہی پر معترض ہو'

رام چندرن خاموش بیٹھا رہا

گاندھی جی نے طرزِ استدلال پر اظہار دلچسپی کرتے ہوئے کہا:۔
"اچھا تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا کانگریس یہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے
ممبروں سے کہے کہ وہ شراب نہیں پئیں گے۔ کیا وہ فعل بھی انفرادی آزادی
پر پابندی عائد کرنے کے مترادف ہوگا؟ اگر کانگریس کو یہ حق ہے کہ وہ شراب
نوشی سے منع کرے تو غالباً یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ کیوں؟
اس لئے کہ شراب نوشی کی خرابیاں عیاں ہیں۔ ہاں اچھا تو میں کہتا ہوں کہ

آج ہندوستان میں جہاں کروڑہا نفوس فاقہ کشی کے لگ بھگ زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ شاید اس سے زیادہ برائی ہے کہ غیر ملکی کپڑے کی درآمد کیجائے۔ اڑیسہ کے لکھوکھا فاقہ زدہ اشخاص کا خیال کرو جب میں وہاں گیا تو میں نے قحط زدہ اشخاص کی صورتوں کو دیکھا میں مہربان سپرنٹنڈنٹ کا شکر گذار ہوں جو ایک حرفتی ادارہ کا انچارج تھا کہ اسکی وجہ سے میں انکے بچوں سے بھی ملسکا وہ ذہین، تندرست اور بشاش لڑکے تھے اور قالینین، ٹوکریاں، وغیرہ بنانے میں مصروف تھے وہاں سوت نہیں کاتا جاتا تھا اسلئے کہ اس قسم کی بہت سی چیزیں اس زمانہ میں بیحد رائج تھیں لیکن انکے چہروں سے مسرت بخش کام کی چمک صاف طور سے نمایاں تھی لیکن جب میں قحط زدہ اشخاص کے پاس آیا تو میں نے کیا دیکھا؟ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہیں اور اور موت کے منتظر ہیں۔ وہ اس حالت میں اس لئے مبتلا تھے کہ وہ کسی حالت میں کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کام سے انکار کرنیکی صورت میں تم انہیں گولی سے مارنے کی بھی دھمکی دیتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایماندارانہ کام کرنے کی بجائے مرجانے کو ترجیح دیتے کام سے بے اعتنائی کا جذبہ شراب خواری سے زیادہ برا ہے۔ تم ایک شرابی کو کام پر لگا سکتے ہو۔ شرابی کے پاس کم سے کم دل تو رہتا ہے وہ عقل کا بھی کچھ حصہ رکھتا ہے یہ فاقہ زدہ اشخاص جو کام سے انکار کر رہے تھے محض جانور معلوم ہوتے تھے۔ اب اس قسم کے آدمیوں سے کام لینے کے سوال کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟ مجھے تو اسکے علاوہ اور کوئی طریقہ معلوم نہیں ہوتا کہ کاتنے کو عام کردیا جائے غیر ملکی کپڑے کا ہر ایک گز جو ہندوستان میں لایا جاتا ہے

روٹی کا ٹکڑا ہے جو ان فاقہ کش اشخاص کے منہ سے چھین لیا گیا ہے اگر تم میری طرح موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت کا اندازہ کرلوگے (اور وہ یہ کہ ہندوستان کے کروڑہا فاقہ کش اشخاص کو اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ خوشی اور مسرت کیساتھ اپنی روزی کما سکیں) تو پھر تم کاتنے کی شرط پر معترض نہ ہوگے'

رام چندرن کے چہرہ سے معلوم تھا کہ اسے اطمینان نہیں ہوا لیکن اس نے موضوعِ بحث بدل دیا، اور گفتگو کے ابتدائی پوائنٹ پر بحث کرتے ہوئے اسنے کہا:

'باپو جی، تو خوبصورتی اور سچائی ایک ہی چیز کی محض مختلف شکلیں نہیں ہیں؟'

گاندھی جی نے اپنے جواب کو دہراتے ہوئے کہا: 'سچائی ہی وہ اولین شے ہے جسکی تلاش کرنی چاہیئے اور خوبصورتی اور نیکی پھر خود بخود تم کو حاصل ہو جائیگی ایسی چیز کی تعلیم درحقیقت مسیح نے پہاڑی والے وعظ میں دی ہے۔ عیسیٰ (ع) میرے خیال میں بہت زبردست آرٹسٹ تھے، اسلئے کہ انھوں نے سچائی کو دیکھا تھا اور اسی کی تلقین کی تھی۔ یہی کیفیت آنحضرت (ص) کی تھی۔ فضلا کا قول ہے کہ تمام عربی زبان میں قرآن انشا پردازی کے اعتبار سے نہایت جامع کتاب ہے۔ چونکہ دونوں نے پہلے سچائی کیلئے سعی کی اسلئے قدرتی طور پر عبارت کی خوبصورتی جلوہ گر ہوگئی[1] باوجود اس کے نہ حضرت عیسیٰ (ع) نے اور نہ حضرت محمد (ص) ہی نے آرٹ پر کچھ تحریر کیا ہے یہی وہ سچائی اور خوبصورتی ہے جس کا میں متمنی ہوں، اسی کی خاطر میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور اسی کی خاطر میں مرنا پسند کروں گا'

رام چندرن نے اسکے بعد مشنیری کے بارے میں گاندھی جی کی منطقی پوزیشن کے

[1] گاندھی جی کے ان الفاظ سے یہ مطلب اخذ کرنا چاہیئے کہ وہ قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھتے۔ مترجم

متعلق اپنی مشکلات کا اعادہ کیا۔ اگر آپ سنگر سوئنگ مشین اور اپنے تکلے کو مستثنیات میں داخل کرتے ہیں تو پھر ان مستثنیات کا سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟ اس نے پوچھا

گاندھی جی نے جواب دیا: "ٹھیک اسی مقام پر جہاں فرد واحد کی اعانت کا کام ختم ہو جائیگا اور اسکی شخصیت پر حملے شروع ہو جائینگے۔ مشینری کو اعضائے انسانی کو بیکار اور معطل کر دینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے"

رام چندرن نے کہا: "کہ میں اسوقت اسکے عملی پہلو پر غور نہیں کر رہا ہوں کیا بطور نظریہ کے آپ جملہ قسم کی مشینری کو خلاف قاعدہ نہیں ٹھہراتے؟ جب آپ سینے کی مشین کو مستثنیات میں داخل کرتے ہیں تو کیا پھر آپ موٹر کار کو بھی مستثنیات میں داخل نہیں کریں گے

باپو جی نے جواب دیا کہ "نہیں، کیونکہ وہ انسان کی ابتدائی ضروریات میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کرتی، اسلئے کہ انسان کی اولین ضرورت یہ نہیں ہے کہ وہ موٹر کار کی تیزی سے لمبے لمبے رستوں کو عبور کرنے لگ جائے۔ برخلاف اس کے سوئی زندگی کے لئے ضروری اور اولین ضرورت کی چیز ہے۔ بطور نظریہ کے میں تمام مشینری کو خارج رکھنا چاہتا ہوں بعینہ جس طرح سے میں اس جسم کو مسترد کر دینا پسند کرتا ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے میں جملہ مشینری کو مسترد کر دونگا، لیکن مشینیں رہیں گی کیونکہ جسم کی طرح وہ لازمی ہیں جیسا کہ میں نے آپ سے کہا خود جسم بہترین قسم کی مشینری ہے لیکن اگر وہ روح کی بلند ترین پروازوں میں رکاوٹ ثابت ہو تو اُسے مسترد کرنا پڑیگا"

رام چندرن نے سوال کیا: "جسم ایک ضروری برائی کیونکر ہوا؟ بس

آپکی یہ بات نہیں سمجھا لیکن مجھے اپنے ابتدائی پوائنٹ کی طرف لوٹنے دیجئے۔ کیا آخر کار بعض آرٹسٹ اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ سچائی کو خوبصورتی میں یا خوبصورتی کے ذریعہ دیکھیں بجائے اسکے کہ خوبصورتی کو سچائی میں یا سچائی کے ذریعہ معلوم کریں؟

گاندھی جی نے فرمایا: "بعض لوگ ایسا کرسکتے ہیں لیکن یہاں پر بھی بعینہ وہی حالت ہے جو دوسری جگہ پر ہے۔ مجھے تو کروڑہا باشندوں کا خیال کرنا چاہئے اور کروڑہا کو ہم ایسی ٹرننگ نہیں دیسکتے کہ وہ خوبصورتی کا تخیل اس طرح سے کریں کہ سچائی کو اس میں دیکھ لیں۔ اڑیسہ کے مردوں اور عورتوں کے فاقہ زدہ پنجر کام کرنے کے اوقات میں اور خواب میں مجھے نظر آیا کرتے ہیں اور وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اُن فاقہ کش لکھوکھا انسانوں کیلئے جو چیز مفید ہے وہ مجھے سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ آؤ ہم آج سب سے پہلے زندگی کی ضروری چیزیں انہیں دیں اور پھر زندگی کی خوشنمائیاں اور خوبصورتیاں خودبخود پیدا ہو جائیں گی"

اس مقام پر طویل گفتگو ختم ہو گئی۔ اور دوسرے دن صبح کے وقت گاندھی جی کی برکات سے مالا مال ہو کر رام چندرن شانتی نکیتن واپس چلا گیا اور وہ متعجب تھا کہ اس کے اپنے گورو دیو یعنی رابندرا ناتھ ٹیگور کی تعلیم اس تعلیم سے کہانتک مطابقت کھا سکتی ہے جو ابھی حاصل ہوئی ہے اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان کتنا بنیادی فرق موجود ہے"

ملاقات کے متعلق مہادیو دیسائی کا یہ آخری جملہ ہیں جدید ہندوستان کے ایک نہایت دلچسپ تباین سے روشناس کر دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ روحانی

خصوصیات سے اسقدر پُر ہے کہ اسمیں کچھ نہ کچھ عالمگیر اہمیت پائی جاتی ہے. میں جس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ گاندھی اور ٹیگور کی طبائع اور تنظریہ حیات کا باہمی اختلاف ہے. بہر حال میں اس کی وضاحت کی کوشش کرتا ہوں

رومین رولینڈ[1] نے ایک مرتبہ خط میں ایک فوری فرزانہ ادراک کے جذبہ میں یہ بات لکھی تھی کہ "ٹیگور ہمارے زمانہ کے افلاطون ہیں اور گاندھی سینٹ پال[2]"

ٹیگور کے بارے میں تو یہ تمثیل بہت ہی دلچسپ ہے اسلئے کہ ٹیگور میں آئیڈیل روحانی خوبصورتی کی وہ تمام جامعیت اور پرجوش محبت موجزن ہے جو افلاطون کے نام کے مرادف ہے. اسکے علاوہ ان میں اور بھی باتیں موجود ہیں اور میں نے ٹیگور میں وہ جھلک دیکھی ہے جو اسکی حیرت انگیز بشرے سے ہویدا ہے یعنی وہ سنجیدگی و متانت جو مسیح کے انجیلی مرقع میں ملتی ہے. مجھے کسی شخص نے اس الہٰی سیرت کو ایسا نہیں سمجھایا جیسا کہ رابندرا ناتھ نے خود اپنی زندگی اور اپنے نمونہ سے سمجھایا ہے

مہاتما گاندھی کے متعلق میں رولینڈ کی تمثیل سے اسقدر مطمئن نہیں ہوا اگرچہ میں اس کے ساتھ ہی اسکے وزن اور مفہوم کو مانتا ہوں. اسلئے کہ گاندھی بلاشبہ ایسے آدمی ہیں جو ضمیر کے ایک ایسے عظیم الشان تلاطم میں سے گذر چکے ہیں جسے ہم لفظ "کنورشن" (قلب ماہیت) سے تعبیر کرتے ہیں. وہ انسانیت کی اعلیٰ بلندیوں پر بے تکلف اور ہموار طریقہ سے نہیں پہونچے جیسا کہ بظاہر ٹیگور پہونچے ہیں. گاندھی کیلئے گناہ کا سلبی پہلو جسے وہ تقریباً متشددانہ تزکیۂ نفس کے ذریعہ بیخ و بن سے اکھیڑ دینا چاہتے ہیں، صلیب کے سایہ کیطرح ہمیشہ نمایاں رہا ہے

[1] Romain Rolland. [2] St Paul.

اور انکے خیالات پر ہمیشہ چھایا ہوا رہتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سینٹ پال کی مانند ہیں جو چلّا کر کہتا ہے کہ "میں کیا ہی بدقسمت آدمی ہوں مجھے اس موت کے جسم سے کون نجات دلائیگا" کیونکہ گاندھی کی نظر میں انسانی جسم مع اپنی شہوانی قوتوں اور گناہوں کے ایک بدی ہے نیکی نہیں ہے۔ نجات کامل صرف اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ اس جسم انسانی سے مکمل علیحدگی عمل میں آجائے۔ تاہم انھوں نے ابھی سے عالم رویا میں اس ناقابل بیان مسرت کا احساس کرلیا ہے جو اس نجات سے پیدا ہوگی لیکن یہ عبارت ان پر بھی اتنی ہی صادق آتی ہے جتنی سینٹ پال پر کہ "ابتو ہم شیشہ میں دھندلے طریقہ سے دیکھتے ہیں لیکن اسوقت ہم رُو در رُو ہونگے! ابھی میرا علم جزدی ہے لیکن اسوقت میں اُسے اتنا جان جاؤنگا جتنا کہ میں اپنے متعلق علم رکھتا ہوں"

اس تمام جانکاہ زہد و ریاضت میں جو انہیں ناقابل یقین روز دل اور تزکیۂ نفس کے مختلف طریقوں پر آمادہ کرتی رہتی ہے، حیرت افزا شیرینی اور طفلانہ بے گناہی پائی جاتی ہے۔ جب ان چیزوں کا عملی شکل میں مشاہدہ کیا جاتا ہے جیسا کہ میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرچکا ہوں تو اسوقت صرف آسیسی کے سینٹ فرانسس[۱] کی درخشاں مثال ہی میرے ذہن میں آتی ہے، کیونکہ میں آسانی کیساتھ گاندھی کا پرندوں کے سامنے وعظ کہنے، کوڑھی کو گلے لگانے، نیم عریاں غربا کا بھدا لباس پہننے برف میں کسی بدزبان دربان کے ہاتھوں "کامل مسرت" کیساتھ بری طرح مار کھانے کی غرض سے اپنے آپکو پیش کرنیکا تصور کرسکتا ہوں۔ جب کبھی میں "لٹل فلاورز آف سینٹ فرانسس[۲]" کا مطالعہ کرتا ہوں جس کا ماحول ازمنۂ وسطیٰ سے تعلق رکھتا ہے اسوقت میں اپنے دل سے یہ کہتا ہوں

---

[۱] St. Francis. [۲] Little Flowers of St. Francis

کردو، یہ کسقدر عجیب و غریب بات ہے! لیکن میں تو محبت کی اسی زندگی کا خود گاندھی میں اور
انکے بہت سے پیرووں میں مشاہدہ کر رہا ہوں "۔ اور ٹھیک اسی موقع پر مجھے وہ باتیں
بھی ملتی ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے غیر مشابہ ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاتما گاندھی
ازمنہ وسطیٰ کے مقدس آدمیوں کی طرح سے تجرد پر نہایت گہرا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اسلئے کہ
انکے خیال میں خدا کا نہایت مسرت بخش دیدار حاصل کرنیکا یہی واحد عملی طریقہ ہے
یہاں پر کسی اور چیز کے مقابلہ میں وہ ٹیگور سے شدید اختلاف رکھتے ہیں
رابندرا ناتھ ٹیگور کی ایک مشہور نظم ہے جسکا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے:۔
"میں ترک نجات حاصل کرنیکا متمنی نہیں ہوں۔ میں مسرت کی ہزار ہا بندھنوں میں
آزادی کا معانقہ محسوس کرتا ہوں

نہیں، میں اپنے حواس کا دروازہ کبھی بند نہیں کروں گا
قوتِ باصرہ اور قوتِ شامہ اور قوت لامسکی مسرتیں تیری مسرت کو برداشت کرینگی
ہاں، میرے تمام توہمات مسرت کی روشنی میں جل جائیں گے
اور میری تمام خواہشیں پختہ ہو کر محبت کے میوے بن جائیں گی"
اس نظم میں ٹیگور گاندھی سے کوسوں دور چلے گئے ہیں جو اپنے حواس کو انتہائی
حد تک مٹا دینے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ تاہم نجات کے متعلق ایک ایسی ہی دوسری مشہور و
معروف نظم میں وہ اُنکے قریب آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں!۔
"ٹیگور کسی عبادت گذار سے چلا کر کہتا ہے: یہ رام نام جپنا اور تسبیح پھرانا چھوڑ دے
اپنی آنکھیں کھول اور دیکھ کہ تیرا خدا تیرے سامنے نہیں ہے! . . . .
وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں کاشت کر رہا ہے اور جہاں سڑک بنانیوالا

پتھروں کو بیٹھا توڑ رہا ہے۔ وہ دھوپ میں اور بارش میں تیرے ساتھ ہے اور اسکے کپڑے خاک آلود ہیں اپنا مقدس جبہ اتار کر پھینک دے اور ٹھیک اسکی طرح خاک آلود زمین پر آجا!

نجات؟ یہ نجات کہاں مل سکتی ہے؟

ہمارے آقا نے خود نہایت مسرت کے ساتھ تحلیق کی بندھنوں کو قبول کر لیا ہے۔

وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے"

اس عجیب و غریب نظم میں جدید ہندوستان کے دو مقدس بزرگ ٹیگور ہندوستان کے انتہائی مشرق میں، گاندھی ہندوستان کے انتہائی مغرب میں۔ نجات کے مسئلہ پر بظاہر ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ گاندھی ٹیگور کی طرح نہایت سختی سے اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ خدا کو ملک کے ادنٰے ترین افراد میں ڈھونڈا جا سکتا ہے

یہ تیرے بیٹھنے کی جگہ ہے اور ترے قدم وہاں آرام کرتے ہیں جہاں غریب ترین، ادنی ترین اور گم کردہ راہ افراد بستے ہیں

جب میں تیرے سامنے جھکنے کی کوشش کرتا ہوں، میری کورنش اس گہرائی تک نہیں پہونچتی جہاں تیرے پاؤں غریب ترین ادنی ترین اور گم کردہ راہ افراد میں آسودہ ہیں

غرور وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جہاں تک تو غریب ترین، ادنی ترین اور گم کردہ راہ افراد کے درمیان غریبوں کے لباس میں پھرتا ہے

میرا دل وہاں تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا جہاں تک تو غریب ترین، ادنی ترین اور گم کردہ راہ افراد کے درمیان بے کسوں کے ساتھ رہتا ہے

آج بھی مجھے وہ شام یاد ہے جبکہ ہم شام کی پرارتھنا کے وقت دریائے سابرمتی کے کنارے مہاتما گاندھی کے آشرم میں عبادت کے لئے بیٹھے ہوئے تھے! اور اس وقت انھوں نے مجھ سے ٹیگور کی کوئی نظم پڑھنے کی فرمائش کی کی تھی۔ جو نظم میں نے اس وقت پڑھی وہ متذکرہ بالا آخری نظم ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاتما گاندھی اور ان کے چیدہ پیرووں کی جماعت کی معیت میں اس آشرم میں دن کی ٹھنڈک میں خدا جلوہ گر ہے جہاں غربا کے ساتھ اس قدر محبت اور احترام روا رکھا جاتا ہے

اس واقعہ کے کئی سال بعد میں نے خود مہاتما گاندھی کو اس شام کی پرارتھنا اور رابندرا ناتھ ٹیگور کی نظم کی پڑھنت کا ذکر نہایت دل ہلا دینے والے طریقہ سے کرتے ہوئے سنا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس موقع پر انھوں نے میری طرح اس مافوق الادراک حیّ و قیوم ہستی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا

باب بست و یکم

خاتمہ

اس کتاب کے خاتمہ پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کیلئے صورت حالات کیا ہے اور کس شکل اور صورت میں مہاتما گاندھی اپنے ستیاگرہی اصولوں کو نشوونما پاتے ہوئے دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ تحریک میں جو عجیب و غریب صفت انھوں نے پیدا کر دی ہے وہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ افراد کسی مخصوص اخلاقی خرابی کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور اس کے سلسلہ میں مقاومت مجہول پیش کریں، انھوں نے ایک مکمل پروگرام وضع کیا ہے جسے "اجتماعی اخلاقی مقابلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کے ذریعہ خرابی کا تدارک عمل میں لانا چاہیئے۔ ولیم جیمز[1] نے ایک مشہور و معروف مضمون میں اس امر کی تشریح کی ہے کہ دنیا کی ایک عظیم الشان نفسیاتی ضرورت یہ ہے کہ "جنگ کا اخلاقی مترادف" دریافت کیا جائے۔ میں جتنا زیادہ مہاتما گاندھی کے روحی طاقت کے پروگرام کو عملی شکل میں دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ مقابلتاً اس قدر چھوٹے پیمانہ پر حیرت افزا طریقہ سے عملی جامہ پہنا چکے ہیں، اُسے اس سے کہیں زیادہ وسیع پروگرام کے ساتھ اور اس سے کہیں زیادہ وسیع مشکلات کے حل کیلئے استعمال کیا جا سکتا

[1] William James

ہے۔ اس صورت میں جدید تحریک کے ہر تفصیلی امر کے بارے میں مخصوص سائنٹفک طریقہ کی از سرِ نو تشریح کرنی ہو گی، اس مسئلہ پر کلیتاً سائنٹفک طریقہ سے بحث کرنے کی ضرورت ہے اس غرض سے کہ اس کی موجودہ نشو و نما میں اس کے کمزور اور طاقتور پہلو واضح ہو جائیں تاکہ وسیع پیمانہ پر ان اصولوں کا استعمال ہو سکے جنھیں وہ خود استعمال کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے اور دیگر امور کا خیال کرتے ہوئے ان کی ساری عملی زندگی کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "تلاشِ حق کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان کڑی" ہے۔

اب تک اپنے افعال میں مہاتما گاندھی کا رخ اسی جانب رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں مقاومت مجہول کے سلسلہ میں ان کی ابتدائی کوششیں مقابلتاً چھوٹے پیمانہ پر تھیں لیکن جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہ بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ مزید برآں ہندوستان میں جو اُن کے طویل غیر حاضری کی بدولت نیا ملک سا بن گیا تھا، انہوں نے بے انصافیوں کا تدارک کرنے کی غرض سے چھوٹے پیمانے پر جد و جہد کا آغاز کیا۔ پہلے پہل (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) انھوں نے چمپارن، کیرا اور ویرم گام جیسے مقامات سے ابتدا کی لیکن آخری دو تحریکیں جنھیں انھوں نے جاری کیا اور جن کا نام انھوں نے "ستیاہ گرہ" اور "عدم تعاون" رکھا، وہ بہ لحاظ وسعت سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھیں۔ تاہم تشدد شروع ہو جانے کی بدولت ان دونوں تحریکوں کو بیچ ہی میں بند کر دینے کی وجہ سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تحریکات قبل از وقت تھیں اور یہ کہ جو تیاریاں ان کے لئے کی گئی تھیں، وہ

نامکمل تھیں۔ یہ حقیقت اب واضح ہو گئی ہے کہ "اجتماعی اخلاقی مقابلہ" جیسی بڑی تحریک مکمل تیاری کے بغیر نہ تو نشوونما پا سکتی ہے اور نہ منظم ہی کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔ محض عام جذبہ کی کسی فوری لہر پر اعتماد کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ تحریک آغاز ہی میں ناکام ہو جائے۔ عدم تعاون کے زبردست طوفان میں جو ۱۹۲۰-۲۲ء تک ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برپا رہا، تحریک کا ہیجانی پہلو ہی اسکے لئے سب سے زبردست خطرہ بن گیا تھا۔ شاعر رابندرا ناتھ ٹیگور اپنے ملک کی صیانت کی حفاظت کے لئے "دو سنتری اعظم" بن گئے تھے۔ انھوں نے بتا دیا تھا کہ کسی شخصیت کی خواہ وہ کتنی ہی پرخلوص اور شریفانہ کیوں نہ ہو، اندھی تقلید بالآخر تشدد پیدا کرنے والی ثابت ہو گی اور اس طرح سے وہ ناکامی کا باعث ہو گی حالانکہ بنیاد جس پر تحریک مبنی ہے خالصتاً اخلاقی ہے

جب ہم (خواہ ایک لمحہ کے لئے ہی سہی) اُن وسیع اور تفصیلی تیاریوں کا خیال کرتے ہیں، جو جنگ جیسی متشددانہ جدوجہد کے لئے کی جاتی ہیں، اور یہ کہ شخص واحد کی زندگی کے کتنے سال ملٹری ٹریننگ (فوجی تربیت) کی نذر ہو جاتے ہیں جو اشخاص کی وسیع تعداد کے لئے عمر بھر کا پیشہ بن جاتی ہے، تو پھر یہ بات بہت زیادہ واضح ہو جانی چاہئے، کہ جنگ کو ترقی دینے کے لئے جس اخلاقی اثر کی ضرورت ہے۔ اسے محض فوری طریقہ سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ "اجتماعی اخلاقی مقابلہ" کرنے کے لئے

ہر ایسی مکمل اور سنجیدہ کوشش احتیاط اور پیش قدمی کی ضرورت ہے جس کی عالمگیر فوجی کوشش کو بالعموم ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس بارے میں مسیح (۶۱) کے الفاظ آج بھی صادق ثابت ہو رہے ہیں: "اس دنیا کے بچے روشنی کے بچوں کے مقابلہ میں اپنی نسل میں زیادہ عقلمند ہیں"

تمام مغربی دنیا میں، بہت سی رضاکارانہ انجمنیں پھیلی ہوئی ہیں جو آبادی کے مختلف حصوں سے اپیل کیا کرتی ہیں۔ بعض عورتوں سے بعض نوجوانوں سے اور بعض مردوں سے۔ انہوں نے بسا اوقات دنیا کے امنِ عامہ کے لئے بہت کچھ سرگرمی اور جوش کا اظہار کیا ہے یورپ میں ایسی رضاکارانہ منظم کوشش کو پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی طاقت کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک مغرب کو جو چیز نصیب نہیں ہوئی ہے وہ کسی ایسی زبردست روحانی شخصیت کی ما فوق الفطرت اخلاقی قوت کا مظاہرہ ہے جو ان مختلف منظم کوششوں کو باہم ملا دینے اور متعدد کر دینے کی صلاحیت رکھے اس طرح سے کہ وہ عدم تشدد کی ایک ایسی متحدہ عظیم الشان طاقتور تحریک بن جائے جو مخالفانہ قوتوں کو دنیا کی پسندیدگی کے طوفان میں بہا کر لے جائے

ضمیمۂ اوّل

جس خیال کو میں نے یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اسے ویلیز کالج کے فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر پریٹ[1] نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس مقام پر بیان کر دیا ہے جہاں وہ خود بدھ مت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

بدھ مت کے متعلق ایسی فاضلانہ کتاب لکھنا ممکن ہے جو مختلف واقعات کو عالمانہ صداقت کے ساتھ بیان کر دے اور ساتھ ہی استحکام کا ریڑھنے والے کو اس امر کے متعلق حیرت میں ڈال دے کہ ہمارے زمانہ کے سمجھدار اور روحانی اشخاص (مرد اور عورت) کس طرح سے حقیقی معنوں میں بدھ مت کے پیرو ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ اتر ہید اکرنے سے اجتناب کیا ہے اور پڑھنے والے کو صرف اس قابل بنانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بطور خود تھوڑا بہت احساس کرلے کہ بدھ مت کا پیرو ہوجانے کے بعد انسان کیا محسوس کرتا ہے۔ کسی غیر مذہب کے احساسات کو بتانے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ مصنف محض اس کے معاہدِ نظر کی تشریح کرے اور اس کی تاریخ بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اسے اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ بنیادی محسوسات سے واقف ہو، اس کے جذبات کا ہمدردانہ مطالعہ کرے، اسکی ظاہری علامات، اسکے عقیدہ، اس کے آرٹ کو سمجھے اور پھر انہی باتوں کو نہ صرف سائنٹفک تشریح کے ذریعہ بلکہ مختلف اور بالواسطہ طریقوں سے دوسروں تک پہنچا دے

---

[1] Pratt. The Pilgrimage of Buddhism

ضمیمۂ دوم

مسٹر گاندھی "درن" (یہ ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی "رنگ" کے ہیں) کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں :-

"درن کے معنی ہیں انسان کے پیشہ کے انتخاب کا قبل از وقت تعین۔ درن کا قانون یہ ہے کہ انسان روزی کمانے کے لئے اپنے بزرگوں کے پیشہ کی پیروی کرےگا۔ ہر بچہ قدرتاً اپنے باپ کے "رنگ" پر جاتا ہے یا اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے درن کو قانون توارث سمجھنا چاہیئے۔ درن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہندوؤں کے گلے زبردستی منڈھ دی گئی ہو، بلکہ ان لوگوں نے جو ان کی بہبودی کے امین تھے، قانون کو ان کے لئے دریافت کیا تھا۔ یہ انسانی ایجاد نہیں ہے بلکہ قدرت کا اٹل قانون ہے ۔ یعنی یہ اس رجحان کو ظاہر کرتا ہے جو نیوٹن[1] کے نظریہ کشش ارضی کی طرح ہر وقت موجود ہے اور اپنا عمل کر رہا ہے۔ ٹھیک جس طرح سے کہ قانونِ کشش ارضی موجود تھا اس سے قبل کہ اُسے دریافت کیا جائے، بعینہٖ یہی حالت قانونِ درن کی تھی۔ یہ بات ہندوؤں کے مقدر میں تھی کہ اس کی دریافت کا سہرا ان کے سر رہے۔ اہالیانِ مغرب نے فطرت کے بعض قوانین کی دریافت اور اُن کے استعمال سے اپنے مادی اسباب میں آسانی کے ساتھ اضافہ کر لیا ہے ٹھیک اسی طرح ہندو بھی اپنے اس اٹل معاشرتی رجحان کی دریافت سے

---

[1] Newton.

روحانی میدان میں وہ باتیں حاصل کرنے کے قابل ہو گئے ہیں جو دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئیں

ورن کا تعلق ذات پات سے کچھ بھی نہیں۔ ذات چھوت چھات کیطرح ہندو مذہب میں باہر سے آکر داخل ہوئی ہے۔ یہ تمام زوائد جن پر آج اسقدر زور دیا جا رہا ہے کبھی بھی ہندو مذہب کا جزو نہیں رہے۔ لیکن کیا اسی قسم کی بھدی بدعات عیسائیت اور اسلام میں داخل نہیں ہوئیں؟

آپ جسقدر رچاہیں ان کے خلاف جنگ کریں۔ اس ذات پات کا قلع قمع کر دیجئے جو ورن کے بھیس میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یہ ورن کا غلط استعمال ہے جس نے ہندو مذہب اور ہندوستان کو ذلیل کر دیا ہے۔ قانونِ ورن کی عدم پیروی ہی بہت وسیع حد تک ہماری اقتصادی اور روحانی بربادی کی ذمہ دار ہے۔ یہ عام بیکاری اور غربت کا ایک بڑا سبب ہے اور یہی چیز چھوت چھات اور مذہب سے دور ہٹ جانے کی ذمہ دار ہے

لیکن ابتدائی قانون کی موجودہ خوفناک اشکال اور خوفناک رسوم کے خلاف جنگ کرتے وقت خود قانون کے خلاف جنگ شروع نہ کر دیجئے“

ضمیمہ سوم

ذیل کے خط سے جسے رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک ایسے شخص کے نام بھیجا تھا جو ہندوستان میں مشنری کی حیثیت سے آنے کا ارادہ کر رہا تھا، ان خیالات کی تائید ہو جاتی ہے جنھیں مہاتما گاندھی نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کیا ہے۔ ٹیگور رقمطراز ہیں:۔

میں نے نہایت مسرت کے ساتھ آپ کا خط پڑھا۔ میں صرف ایک بات کہنی چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ: ہمیشہ اپنے اصولوں کے متعلق وعظ فرمانے کی کوشش میں نہ رہا کیجئے بلکہ اپنے آپ کو محبت کی نذر کر دیجئے۔ آپ کا مغربی دماغ فتح اور قبضہ کے خیال میں ہر وقت سرشار رہتا ہے، آپ کی اپنے مذہب میں داخل کرنے کی تکلیف دہ عادت اس کی ایک دوسری شکل ہے۔ حضرت عیسیٰ نے کبھی اپنے متعلق یا کسی خاص عقیدہ یا اصول کے بارے میں وعظ نہیں فرمایا۔ انہوں نے صرف خدا کی محبت کا وعظ فرمایا تھا۔ ایک عیسائی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ حضرت عیسیٰ جیسا ہو جائے۔ نہ کہ کسی ایسے قلی بھرتی کرنے والے کی طرح جو چائے کے کھیت میں اپنے آقا کے لئے قلی مہیا کیا کرے۔ اپنے اصول کے بارے میں وعظ کہنے میں کسی قربانی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ ایک قسم کی عیاشی ہے جو مادّی زندگی کی جملہ عیاشیوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ چیز آپ کے دل میں ایک غلط خیال پیدا کر دیتی ہے کہ آپ اپنا فرض بجا لا رہے ہیں — یہ کہ آپ باقی بنی نوع انسان سے زیادہ عقلمند اور بہتر ہیں۔ لیکن حقیقی وعظ گوئی انسانِ کامل بننے میں مضمر ہے۔ اگر نسل کا فخر

فرقہ کا فخر اور ذاتی فوقیت کا فخر آپ میں زیادہ ترقی پر ہے تو پھر دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ وہ آپ کا تحفہ مسترد کر دیں گے اور اگر انہوں نے قبول بھی کر لیا تو اخلاقی طور پر وہ اس سے مستفید نہ ہوں گے۔ اس کی مثالیں ہندوستان میں ہر روز دیکھنے میں آتی ہیں۔ روحانی اعتبار سے آپ کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ اچھے نہ ہوں۔ آپ عیسائی بغیر فرقہ کی عیسائیت کا وعظ نہیں کہہ سکتے جب تک آپ حضرات عیسیٰ جیسے نہ ہو جائیں۔ اور اس وقت آپ عیسائیت کی تبلیغ نہ کریں گے بلکہ خدا کی محبت کی جیسا کہ خود حضرت عیسیٰ نے کیا

آپ نے بار بار کہا ہے کہ آپ کا طریقہ زندگی "دیسیوں" کے طریقہ زندگی سے غالباً مختلف نہ ہوگا۔ لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا آپ اپنے آپ کو اُن لوگوں کا ایک فرد تصور کریں گے جنھیں آپ "دیسی" کے نام سے یاد کرتے ہیں، نہ صرف عادات بلکہ محبت کے اعتبار سے؟ اس لئے کہ یہ امر انتہائی ذلت آمیز ہے کہ کوئی ایسا تحفہ قبول کیا جائے جو محبت کے جذبات کے ساتھ نہ پیش کیا گیا ہو "خدا محبت ہے"۔ اور جو کچھ ہمیں اُس کے پاس سے ملتا ہے وہ ہماری برکت کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص خدا کی جگہ کو غصب کرنا چاہے اور برکات نازل کرنے والے کی حیثیت اختیار کرنے کا خواہشمند ہو اور محض خدا کی محبت پہنچانے والے کی حیثیت نہ رکھے تو پھر یہ سب باتیں محض جھوٹی نمائش ہیں

ضمیمۂ چہارم

"ینگ انڈیا" کی حال کی اشاعت میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس میں ہندوستان کے مقیم یورپین مشنریوں کے ساتھ مہاتما گاندھی کے تعلقات اور روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہو ہٰذا:-

نئے مشنری دوستوں میں ڈنمارک کا ایک جوڑا ہے مسٹر اور مسز بی جیرم[1] اور یہ دونوں نہایت ہمدردی اور انہماک کے ساتھ اپنے اور ان لوگوں کے مابین جن کی وہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، ایک سمجھوتہ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ گاندھی جی چرخہ کات رہے تھے جبکہ یہ دوست آئے

"یہ نیا چرخہ ہے اور اس سے مختلف ہے جسے ہم نے نمائش میں دیکھا تھا" مسٹر بی جیرم نے پوچھا "جی ہاں، یہ سفری چرخہ ہے۔ اگر آپ اسے تہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دواؤں کا بکس ہے اور یہ حقیقتاً دواؤں کا بکس ہی ہے جس کی ہمارے غربا کو سخت ضرورت ہے" گاندھی جی نے جواب دیا

نمائش کے بارے میں اپنے دلچسپ خیالات پیش کرنے کے بعد مسٹر بی جیرم نے اپنے کالج کے ہندوستانی عیسائی طلبا کے بارے میں بات چیت شروع کر دی انہوں نے گاندھی جی کو قدرے افسوس کے لہجہ میں مطلع فرمایا کہ "ہمارے اکثر طلبا کا لباس یورپین ہو گیا ہے" گاندھی جی نے کہا کہ "یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ عیسائیت غیر ملکی لباس اور غیر ملکی طرزِ زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ کرتی ہے

[1] Bjerrum.

مسٹر بی جیرم نے اپنی سریلی آواز میں کہا کہ "یہ صحیح ہے۔ لیکن کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ خیالات بسرعت تمام بدل رہے ہیں لیکن سیرت اور عمل میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔" اور یہ فقرہ ادا کرنے کے بعد انہوں نے کلکتہ کی ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے دوستوں کے تجارب بیان کئے۔ مسٹر بی جیرم نے پوچھا کہ "کیا ہم جان سکتے ہیں کہ اگر مشنریوں کو ہندوستان میں رہنا ہے تو آپ کے خیال میں ان کے کام کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے؟"

گاندھی جی نے فرمایا کہ "البتہ انہیں اپنے طرز عمل میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ آج وہ لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ بائیبل اور عیسائیت کے بغیر ان کی نجات ناممکن ہے۔ یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو برا بھلا کہا جائے اور صرف اپنے ہی مذہب کے متعلق یہ بیان کیا جائے کہ وہی نجات کا ضامن ہے۔ ایسے طرز عمل میں پوری تبدیلی کی سخت ضرورت ہے۔ انہیں لوگوں کے روبرو اپنے تئیں اسی طرح پیش کرنا چاہیئے جیسا کہ وہ ہیں اور یہ دیکھ کر مسرور ہونا چاہیئے کہ ہندو بہتر ہندو بن رہے ہیں اور مسلمان بہتر مسلمان۔ انہیں ابتدا سے کام کرنا پڑے گا اور جو باتیں ان کی زندگی میں بہترین ہیں انہیں انہی کی مطابقت میں عمل کرنا پڑے گا۔ اس طرح وہ اپنے کام کو زیادہ مفید بنالیں گے اور پھر جو کچھ وہ لوگوں کو تعلیم دیں گے اور پیش کریں گے اس کی قدر و منزلت کی جائے گی اور اس کے بارے میں تنگ دستبہ اور عناد کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مختصر یہ کہ انہیں لوگوں کے روبرو

ان کا مربی بنکر نہیں بلکہ ان جیسا بنکر جانا چاہیئے، ان پر احسان دھرنے
کے لیے نہیں بلکہ ان کی خدمت کرنے کے لئے اور ان کے درمیان
کام کرنے کے لئے۔"

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ چین، جاپان اور ہندوستان میں
حال ہی کے سالوں میں وہاں کے کلیساؤں میں جدید قومی ذمہ داریوں
کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے جو بجائے خود انتہائی روحانی اہمیت
رکھنے والا واقعہ ہے

ذیل کے اقتباس سے بھی جو مہاتما گاندھی کے جنوبی ہندوستان
کے حال کے دورہ سے متعلق ہے، اس امر کا اظہار ہو جاتا ہے کہ ہندوستان
کا عیسائی کلیسا قومی زندگی میں آج کل کیا نیا حصہ لے رہا ہے :-

"حال کے دورہ کا ایک ممتاز پہلو وہ حقیقی مگر محتاط دلچسپی ہے جو ہندوستانی
عیسائیوں نے کھدر کی تحریک سے لینی شروع کر دی ہے۔ ملنے دلی کے مقام میں
انہوں نے گاندھی جی کی خدمت میں ایک خاص ایڈریس پیش کیا جس میں انہیں
یہ یقین دلایا گیا کہ خواہ اس سے قبل انہوں نے قومی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ
نہ کیا ہو، لیکن اب انہوں نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گاندھی جی نے اس
وعدہ کی بہت قدر کی اور فرمایا :-

"عیسائیت یا کسی اور مذہب کو قبول کر لینے کے معنی یہ نہیں ہونے
چاہئیں کہ ہماری قومیت بدل گئی ہے۔ قومیت کو تنگ خیال اور محدود
نہ ہونا چاہیئے اور نہ اسے کسی شخص کے مذہبی عقائد کی نقیض ہونا چاہئے

جو قومیت خالص خود غرضی پر اور دوسری اقوام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے جذبہ پر مبنی ہوگی، وہ ایک ایسی برائی ہے جس سے اجتناب لازمی ہے۔ لیکن میں صحت بخش، پسندیدہ قومی روح کے بغیر بین الاقوامی تعلقات کا تصور تک نہیں کرسکتا۔"

مدورا اور ٹیوٹی کورن میں ہمارے میزبان عیسائی تھے اور کھدر کی تحریک کے لئے جو خوبصورت ترین تحفہ انہوں نے دیا تھا وہ سونے کی صلیب تھی جو سویڈن کی ایک مشنری خاتون نے پیش کی تھی جسے اس نے ۲۵ برس تک پہنا تھا اور اس نے اسے ایک مقدس مقصد کے لئے اس لئے دے دیا تھا کہ وہی چیز اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی تھی۔ اس سلسلہ میں میں ٹیوٹی کورن کے بشپ کے تحفہ کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو سیپ اور سونے کی خوبصورت صلیب کی شکل میں تھا جو اگرچہ کھدر کی ترویج کے لئے نہیں دیا گیا تھا تاہم وہ ہمدردی کا تحفہ تھا جو بشپ موصوف کو گاندھی جی کے کام کے ساتھ تھی

ضمیمۂ پنجم

مہاتما گاندھی کی ذیل کی تحریر یہ معلوم کرنے میں مفید ثابت ہوگی کہ عیسائیت اور ہندو مذہب کے بارے میں اُن کا طرزِ عمل کیا ہے:-

"میں نے مشنریوں کے چند جلسوں میں انگریز اور امریکن مشنریوں سے یہ بات کہنے کی جرأت کی ہے کہ اگر وہ ہندوستان کو مسیح (ع) کی تعلیم دینے سے احتراز کرتے اور محض اسی قسم کی زندگی بسر کرتے جس کی تلقین انہیں پہاڑی کے وعظ میں کی گئی ہے تو ہندوستان ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی بجائے اپنے فرزندان کے درمیان ان کے رہنے سہنے کو نظرِ استحسان سے دیکھتا اور ان کی موجودگی سے براہ راست فائدہ اٹھاتا

یہ نقطۂ نظر رکھتے ہوئے میں اپنے امریکہ کے دوستوں کو ہندو مذہب کے بارے میں کیا تعلیم دے سکتا ہوں؟ میں اس امر پر اعتقاد نہیں رکھتا کہ لوگ دوسروں کو اپنے مذہب کے بارے میں تلقین کیا کریں اس غرض سے کہ انہیں اپنے مذہب میں لے آیا جائے۔ مذہب کو کسی تلقین کی ضرورت نہیں۔ اسکا اظہار طریقۂ زندگی سے کرنا چاہیئے اور پھر خود بخود اسکی تبلیغ ہونے لگیگی علاوہ ازایں میں اپنے آپ کو ہندو مذہب کی تفسیر کرنے کے قابل نہیں پاتا سوائے ایک طریقہ کے یعنی یہ کہ اپنی زندگی کے ذریعہ اس کی تفسیر کروں۔ اور اگر میں ہندو دھرم کی تفسیر اپنی تحریر کے ذریعہ نہیں کرنا چاہتا تو پھر یہ بھی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ میں عیسائیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کروں۔ لہٰذا میرے لئے جو واحد چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ میں نہایت اختصار کیساتھ

یہ بیان کر دوں کہ میں ہندو کیوں ہوں

چونکہ میرا عقیدہ تو ریت پر ہے اور چونکہ میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہؤا ہوں، میں ہندو مذہب پر قایم ہوں۔ اگر میں دیکھوں کہ ہندو مذہب میرے اخلاقی احساس کے مطابق نہیں ہے یا یہ کہ وہ میری روحانی نشوونما کے مخالف ہے تو مجھے اسے ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن تحقیق و چھان بین کے بعد میں نے معلوم کر لیا ہے کہ جن مذاہب سے مجھے واقفیت ہے، اُن میں وہ سب سے زیادہ بُردبار ہے۔ اس لئے کہ وہ ہندو کو اظہار خودی کے لئے سب سے زیادہ مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ چونکہ وہ کوئی علیحدگی سکھانے والا مذہب نہیں ہے اس لئے وہ اپنے پیرؤں کو نہ صرف اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ باقی تمام مذاہب کا احترام کریں بلکہ یہ کہ وہ ان سب کی اچھایئوں کی تعریف کریں اور جو اچھی بات دیکھیں اسے اپنے میں جذب کر لیں اہنسا یا عدم تشدد تمام مذاہب میں مشترک چیز ہے۔ یہ بات کہتے وقت میں جین مذہب اور بدھ مذہب کو اس سے الگ نہیں کرتا بلکہ اسی کی شاخیں قرار دیتا ہوں۔ ہندو نہ صرف تمام انسانی زندگی کی وحدت پر عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ ہر جاندار چیز کی وحدت پر بھی

گائے کی پرستش عظمت کا احساس انسانی تخیل کے ارتقا کے سلسلہ میں ہندو دھرم کیجانب سے عجیب غریب پیشکش ہے۔ اسکے ذریعہ درحقیقت تمام زندگی کی وحدت اور اس لئے اُس کے تقدس کا عملی اقرار کیا گیا ہے۔ تناسخ کا عظیم الشان مسئلہ اسی عقیدہ کا براہ راست نتیجہ ہے بالآخر یہ کہ اصول ورن آشرم کی دریافت انتھک تلاش حق کا نہایت شاندار نتیجہ ہے

ضمیمہ ششم

حسب ذیل ہدایات مہاتما گاندھی نے وائیکوم کے ستیاگرہیوں کو اُس وقت دی تھیں جبکہ وہ بنفسِ نفیس ان سے ملنے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کی غرض سے تشریف لائے تھے:۔

"یہ تحریک ہندوؤں کے لئے سرتاپا مذہبی ہے۔ ہم ہندو مذہب کے دامن پر سے سب سے بڑا دھبہ دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس تعصب کے خلاف ہم جنگ کر رہے ہیں وہ مدتوں سے موجود ہے۔ مندر کے گرد و پیش کی سڑکوں کو (جنھیں ہم پبلک کہتے ہیں) اچھوتوں کے لئے کھول دینے کی تحریک بڑی جنگ میں محض ایک چھوٹے سے معرکہ کی حیثیت رکھتی ہے اگر ہماری جدوجہد وائیکوم میں سڑکوں کے کھلنے پر ختم ہو جانے والی ہوتی تو آپ یقین رکھئے کہ میں ہرگز ہرگز اس کے لئے اپنا سر نہ کھپاتا۔ یہ سچ ہے کہ راستہ کھلنا چاہیئے۔ اسے کھلنا پڑے گا۔ لیکن وہ تو آنے والے انجام کا آغاز ہوگا۔ وہ انجام یہ ہے کہ تراونکور بھر کی ایسی سڑکوں کو کھلوانا چاہیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم متوقع ہیں کہ ہماری کوششیں ہر شعبہ میں اچھوتوں کی عام حالت کی ترقی پر منتج ہوں گی۔ اس کے لئے عظیم الشان قربانی کی ضرورت ہوگی، کیونکہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ تشدد کر کے اپنا کام نکالیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ جبر کے ذریعہ تبدیلی خیالات عمل میں لائی گئی ہے

اور اگر ہم مذہبی امور میں جبر کو داخل کر دیں گے تو ہم خودکشی کر رہے ہونگے۔ یہی روحی
ہیں یہ تحریک اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر جاری رکھنی چاہیئے۔ یہی روحی
قوت کے معنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا آپ ہر قسم کی تکلیف سہنے کے قابل ہیں
جو آپ کو مقصد تک پہنچنے کی راہ میں برداشت کرنی پڑے گی؟
تکلیف برداشت کرتے وقت بھی آپ کے دل میں اپنے دشمنوں کے
خلاف کسی قسم کی مخالفت کا شائبہ تک موجود نہ ہونا چاہیئے۔ یہ کوئی مکینیکل
فعل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ محسوس کریں کہ
آپ اپنے دشمنوں سے محبت کر رہے ہیں اور اس کام کو آپ یوں انجام
دے سکتے ہیں کہ آپ ان کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ اپنے مقاصد میں اتنے
ہی ایماندار ہیں جتنے ایماندار بننے کا آپ لوگوں کو دعویٰ ہے۔ میں جانتا
ہوں کہ یہ کام مشکل ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ کل مجھے بھی یہی دقت پیش
آئی تھی جبکہ میں ان دوستوں سے گفتگو کر رہا تھا جو مندر کی سڑکوں سے
اچھوتوں کو خارج رکھنے کے بارے میں اپنے حقوق پر مصر تھے۔ میں اقرار کرتا
ہوں کہ ان کی گفتگو کی تہ میں خود غرضی کو دخل تھا۔ ایسی صورت میں میں
انہیں اپنے مقصد میں کس طرح سے ایمانداری کی سند دے سکتا ہوں؟
میں نے کل بھی اس بات پر غور کیا اور آج صبح بھی اور میں اس حل پر پہنچا
ہوں۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا: "کس بات میں ان کی خود غرضی مضمر
تھی؟" یہ سچ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اغراض رکھتے ہیں جن کی تکمیل انہیں کرنی
ہے۔ لیکن ہم بھی تو اپنے اغراض رکھتے ہیں۔ صرف اپنے اغراض کے بارے

میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پاکیزہ اور بے غرض ہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ خود غرضی کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں شروع ہوتی ہے؟ بعض اوقات بے غرضی بھی خود غرضی کی پاکیزہ ترین شکل سمجھی جاتی ہے،

میں یہ بات محض محبت کی خاطر نہیں کہتا۔ لیکن درحقیقت میرے محسوسات بھی یہی ہیں۔ میں ان کی دماغی کیفیت پر انہی کے نقطۂ نظر سے غور کر رہا ہوں نہ کہ اپنے نقطۂ نظر سے۔ جونہی ہم اپنے دشمنوں کی طرح معاملات پر غور کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ دنیا کی تین چوتھائی مصائب اور غلط فہمیاں فوراً غائب ہو جائیں گی اگر ہم اپنے دشمنوں کی جگہ پر بیٹھکر ان کے نقطۂ خیال کو سمجھ لیں گے۔ اس وقت یا تو ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ متفق ہو جائینگے یا کم سے کم ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کریں گے۔ فی الحال ہمارا ان کے ساتھ فی الفور اتفاق رائے کر لینے کا مسئلہ درپیش نہیں ہے اس لئے ہمارے مطامحِ نظر بنیادی طور پر ان سے مختلف ہیں۔ لیکن ہم ان کے ساتھ حسنِ اخلاق سے کام لے سکتے ہیں اور یقین کر سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی درحقیقت ان کے دل میں ہے

وہ اچھوتوں کے لئے راستے کھولنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ان پر ظاہر کر دیں کہ وہ غلطی پر ہیں اور یہ کام ہمیں تکلیفیں سہکر انجام دینا چاہیئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ عقل سے اپیل کرنے کا وہاں کوئی اثر نہیں ہوتا جہاں تعصبات مدتہائے دراز سے موجود ہوں اور بظاہر مفروضہ

مذہبی اسناد پر مبنی ہوں۔ عقل کو تکلیف کے ذریعہ طاقت بہم پہنچانی چاہئے
اور تکلیف عقل کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ لہٰذا ہمارے افعال میں جبر کا
شائبہ تک نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیں بے صبر نہ بننا چاہیئے اور ہمیں ان ذرائع پر
جنھیں ہم اختیار کر رہے ہیں اٹل عقیدہ رکھنا چاہیئے

اگر آپ روحی طاقت پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ یقیناً اس قسم کی
تکالیف میں خوشی محسوس کریں گے اور پھر آپ کو اپنی حالت کے بارے
میں کوئی بے آرامی معلوم نہ ہوگی جبکہ آپ روز بروز چلچلاتی دھوپ میں
کھڑے ہوکر اپنا فرض منصبی بجا لائیں گے۔ آپ کو تھک کر یہ بات نہ کہنی
چاہیئے کہ "کب تک؟" آپ کو کسی حالت میں بدمزاجی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے
یہ تھوڑا سا کفارہ ہے جسے آپ ہندو مذہب کے گناہ کی یادداشت میں ادا
کر رہے ہیں

میں جانتا ہوں کہ یہ سب باتیں آپ کو سخت اور تکلیف دہ معلوم ہونگی
ممکن ہے کہ جس طریقہ سے میں نے انہیں پیش کیا ہے اس سے دشواری پیدا
ہو گئی ہے، لیکن میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کسی اور طریقہ سے اسے پیش کر سکوں
اس لئے کہ میں غلطی پر ہوں گا اگر میں آپ کو یا اپنے تئیں دھوکہ دے کر یہ
یقین دلا دوں کہ یہ کام آسان ہے

ہمارے مذہب میں بہت کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بہ حیثیت
قوم کے ہم سست ہو گئے ہیں۔ خود غرضی ہمارے ہر فعل میں غالب
ہے۔ ہم میں جو لوگ بڑے ہیں ان میں باہمی حسد پایا جاتا ہے۔ ہم ایک

دوسرے کے ساتھ بہت ہی غیر فیاضانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔ روحی قوت نام ہے تلاشِ حق کا اور اس مصمم ارادہ کا کہ سچائی پر پہنچے بغیر ہم دم نہیں لیں گے۔ میں تو صرف اتنا اعتماد کر سکتا ہوں کہ جو کچھ کام آپ انجام دے رہے ہیں، اس کی اہمیت کا آپ پورا پورا اندازہ کر لیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں گے، تو اس صورت میں آپ کا راستہ آسان ہو جائے گا اس لئے کہ پھر آپ مشکلات سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیں گے اور امید افزا ہنسی ہنسیں گے جبکہ ہر ایک شخص حالتِ مایوسی میں ہو گا

ضمیمہ ہفتم

جنگ بوئر کے دوران میں "انڈین اسٹریچر بیئرر کور" (مریضوں اور زخمیوں کو میدان جنگ سے لانے والی ہندوستانی کور) میں مسٹر گاندھی نے جو حصہ لیا تھا، اس کے متعلق "پریٹوریا نیوز" کے ایڈیٹر مسٹر ویئر اسٹینٹ[1] نے ذیل کا مضمون تحریر کیا ہے:-

مسٹر گاندھی سے میری پہلی ملاقات اسپیون کوپ جانے والی سڑک پر ہوئی جبکہ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء میں برطانوی افواج کی افسوسناک واپسی ہو چکی تھی۔ اس سے قبل کی سہ پہر کو میں نے ہندوستانی خچروں کی ٹرین کو کوپ کی ڈھلوانوں کے اوپر ان مصیبت زدہ سپاہیوں کے لئے پانی لیجاتے ہوئے دیکھا تھا جو سطح مرتفع پر بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے۔ خچر بڑے بڑے تھیلوں میں پانی لیجاتے تھے جو ان کی دونوں جانب لٹکے رہتے تھے اور ان کے آگے آگے ہندوستانی ہوتے تھے۔ بندوقوں کی خوفناک آتش فشانی جو سطح مرتفع پر ان کی آمد کا خیر مقدم کرتی تھی، سواروں کی اس عجیب و غریب جماعت کی ہمتوں کو پست نہیں کرتی تھی۔ جو آہستہ آہستہ آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔ اور جب ایک ہندوستانی کام آجاتا تھا تو دوسرا خاموشی کے ساتھ خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے آگے بڑھ آتا تھا۔ اسکے بعد مریضوں اور زخمیوں کو اٹھانے والی کور کا جسے نیٹال میں مسٹر گاندھی نے منظم کیا تھا خوفناک فرض شروع ہوا

[1] Vere Stent.

ایسے ہی مواقع پر ہندوستانیوں نے اپنے صبر اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا اور ان میں سب سے زیادہ جس شخص نے ایسا کیا وہ گاندھی کی ذات تھی ۔ رات بھر کام کرنے کے بعد جس نے زیادہ جسیم اشخاص کی صحت کو جواب کر دیا تھا، میں صبح کے وقت گاندھی سے ملا جو سڑک پر بیٹھے ہوئے فوجی بسکٹ کھا رہے تھے۔ بلرؔ کی فوج کا ہر ایک شخص سست اور تھکا ہوا تھا اور ہر چیز پر دل سے لعنت برسا رہا تھا لیکن گاندھی کا طرز عمل ان مصائب سے غیر متاثر رہا، ان کی گفتگو سے حقیقی مسرت اور اعتماد ٹپکتا تھا اور ان کی آنکھوں سے محبت

انہوں نے ایک بات تو اچھی کی ۔ وہ غیر رسمی ملاقات تھی اور وہ بالآخر دوستی میں تبدیل ہوگئی ۔ میں نے نیٹال کے معرکوں میں جنگ کے متعدد میدانوں میں انہیں اور ان کی غیر تربیت یافتہ کور کو دیکھا۔ جب کبھی کہیں امداد پہنچائی ہوتی تھی ان کی کور وہاں موجود رہتی تھی۔ ان کی سیدھی سادی بہادری کئی جانوں کے ضائع ہونے کا باعث ہوئی اور بالآخر ایک حکم شائع ہوگیا جس کی رو سے انہیں خاص میدانِ جنگ میں جانے کی ممانعت کر دی گئی ۔ اس وقت گاندھی نے محض اپنا فرض منصبی ادا کیا تھا اور حال ہی میں ایسی قسم کے موقع پر جبکہ ہندوستانی تحریک سے ہمدردی رکھنے والے یورپینوں کو ڈنڈ دیا گیا تھا اور جبکہ اُن کے ہزارہا ہموطنوں اور بہت سے یورپینوں نے ان کی خدمت میں شریفانہ ہدیۂ احترام پیش کیا تھا، اس تمام واقعات پر اُن کا اپنا تبصرہ محض اتنا تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ انکا محض فرض منصبی تھا

Buller.

ضمیمہ ہشتم

۱۹۲۱ء کے آخر میں تمام ہندوستان میں ایک افواہ زور شور سے پھیل گئی تھی جو مہاتما گاندھی کے ان الفاظ کا نتیجہ تھی کہ اگر انہیں ایک سال کے اندر اندر سوراج حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو وہ کھانا پینا ترک کر دیں گے اور اس طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں گے۔ آخر کار وہ مجبور ہو گئے کہ اُس افواہ کی تردید ذیل کے الفاظ میں کر دیں:۔

"احباب نے مجھے درد انگیز الفاظ میں خطوط لکھے ہیں اور مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں ماہ جنوری میں خودکشی نہ کروں اگر اس وقت تک سوراج حاصل نہ ہو اور خواہ میں اپنے آپ کو قید خانہ کی چار دیواری کے اندر محبوس پاؤں میں دیکھتا ہوں کہ زبان صرف غیر مکمل طریقہ پر میرے خیالات کا اظہار کرتی ہے بالخصوص جبکہ خیال پریشان یا نامکمل ہو

غلط فہمی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے تقریباً انسانِ کامل سمجھا جاتا ہے۔ چند دوست گیتا کے بارے میں میری عقیدتمندانہ محبت سے واقف ہیں انہوں نے مجھے اس کی چند آیات بھیجی ہیں جو میری حالت پر صادق آتی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح سے میری حرکت سے خودکشی کی دھمکی دینا در اصل اس تعلیم کی تردید کرنا ہے جس پر عمل پیرا ہونے کی میں اپنی زندگی میں کوشش کر رہا ہوں۔ میرے یہ تمام ناصح اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ میں محض متلاشی حق ہوں۔ میں اس کی تلاش کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں

اور بس. لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ابھی تک حق معلوم نہیں ہوا۔ سچائی کا مکمل طور پر معلوم کر لینا اپنے آپ کو پہچان لینے اور اپنی قسمت جان لینے کے مترادف ہے. میں رنجیدہ طریقہ سے اپنی خامیوں سے واقف ہوں اور اسی میں میری طاقت کا راز مضمر ہے ، اس لئے کہ انسان کے لئے یہ بات شاذ و نادر ہی ممکن ہے کہ وہ اپنی حد بندیوں سے واقف ہو جائے

اگر میں انسانِ کامل ہوتا تو یقیناً میں اپنے پڑوسیوں کی مصائب کو دیکھ کر وہ باتیں محسوس نہ کرتا جو آج میں محسوس کر رہا ہوں۔ کامل انسان کی حیثیت سے میں ان کا اندراج کرتا ، ان کے لئے دوا تجویز کرتا ، اور اپنی اٹل سچائی کی طاقت سے میں مجبور کرتا کہ اسکا استعمال کیا جائے۔ لیکن ابھی تک میں شیشہ میں سے صرف دھندلے طریقہ سے دیکھ سکتا ہوں ، اور اس لئے مجھے آہستہ آہستہ اور پیچ در پیچ طریقوں سے لوگوں کے دلوں میں یقین پیدا کرنا ہے اور پھر بھی کامیابی ہمیشہ میرا ساتھ نہیں دیتی۔ جب یہ حالت ہو تو میں یقیناً انسان نہ ہوں گا اگر ملک کی ساری ممکن العلاج مصیبت کا علم رکھتے ہوئے اور خدائے عالم کے سایہ کے ماتحت محض ہڈیوں کے پنجروں کے نظارہ کی موجودگی میں میں ہندوستان کے کروڑ ہا بے زبان باشندوں کے ساتھ اظہار ہمدردی نہ کروں

اس مصیبت میں بتدریج کمی پیدا ہونے کا خیال مجھے زندہ رکھ رہا ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ مصائب و تکالیف ، خوشی و غم ، سردی و گرمی کا تمام احساس رکھنے کے باوجود میں صرف کان تک پہنچ سکا ہوں اور دل تک ابھی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ سال کے آخر میں میں لوگوں کو چرخہ کے پُرامن انقلاب

کے ذریعہ حصول سوراج کے موجودہ امکان کے بارے میں اتنا ہی مایوس پاؤں جتنے وہ آج ہیں، یہ بھی فرض کرلیجئے کہ جو جوش و خروش گذشتہ بارہ مہینوں میں دیکھنے میں آیا ہے وہ محض جوش ہی ہے اور پروگرام کے بارے میں مستقل عقیدہ کی حیثیت نہیں رکھتا، اور آخر میں فرض کیجئے کہ مصالحت کا پیغام انگریزوں کے دلوں کی گہرائیوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکا تو کیا مجھے اپنی اندرونی کشمکش کی نیکی کی طرف سے مشکوک نہ ہو جانا چاہیئے اور یہ محسوس نہ کرنا چاہیئے کہ میں اب تحریک کی رہنمائی کرنے کے قابل نہ رہا؟ سچے آدمی کی حیثیت سے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا مجھے اپنے خالق کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ سربسجود نہ ہونا چاہیئے اور اس سے دعا نہ مانگنی چاہیئے کہ وہ اس بیکار جسم کو لیلے اور مجھے خدمت کرنے کا بہترین ذریعہ بنائے؟

سوراج کے معنی تبدیلیٔ حکومت کے نہیں ہیں، یہ تو صرف ظاہری صورت ہے۔ جس اہم چیز کے لئے میں کوشاں ہوں وہ لوگوں کے دلوں کی تبدیلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ چھوت چھات کی غلطی دور کرنے، ہندوؤں کو ہندو مسلمانوں کو باہمی دشمنی کو خیرباد کہنے اور قومی زندگی کے ایک دائمی جزو کے طور پر دلی دوستی قبول کرنے، ہندوستان کی اقتصادی نجات کے حصول کے واحد ذریعہ کے طور سب کو چرخہ اختیار کرلینے اور آخر میں سب کو یہ عقیدہ رکھنے کے لئے کہ ہندوستان کی آزادی صرف عدم تشدد ہی میں مضمر ہے، صدیوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قوم کی طرف سے مخصوص دانشمندانہ اور آزادانہ حیثیت سے اس پروگرام کو اختیار کرلینے کے یہ معنی ہیں کہ اسے حقیقی سوراج مل گیا ہے۔ اسکے

بعد ظاہری علامت یعنی انتقالِ اختیارات یقینی طور پر ملے گا۔ بعینہٖ جس طرح سے ایک بیج کا بشرطیکہ اسے ٹھیک طرح سے بو دیا جائے، نشو و نما پا کر تناور درخت بن جانا یقینی ہے

قارئینِ کرام محسوس کریں گے کہ پونا میں پہلی مرتبہ میرا چند دوستوں کو اتفاقیہ طور پر وہ جملہ کہنا دراصل میری خامیوں کا اقرار تھا اور اس بڑی تحریک کے لئے جس کی بظاہر رہنمائی میں کر رہا ہوں، اپنی عدم قابلیت کے احساس کا اظہار تھا۔ میں نے مایوسی کے کسی اصول کی تبلیغ نہیں کی۔ برخلاف اس کے میں نے اپنے آپ کو کبھی پُرامید نہیں پایا جتنا کہ میں اب پا رہا ہوں کہ ہم اسی سال سوراج کا اہم حصہ حاصل کر لیں گے۔ ساتھ ہی میں نے عملی تخیل پسند شخص کی حیثیت سے یہ بیان کیا ہے کہ مجھے اپنے آپ کو اس بڑے مقصد کی رہنمائی کے قابل نہیں سمجھنا چاہیئے جس کے بارے میں مجھے خود بے اعتمادی کا احساس ہو۔ گیتا کی تعلیم کہ "بغیر غرض کے کام کرنا چاہیئے" یہ معنی رکھتی ہے کہ سچائی کا سرگرمی سے تعاقب کیا جائے اور عدمِ اہلیت کے انکشاف کے بعد پسپائی عمل میں لائی جائے

میں نے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میں "ذاتِ حق" ذات میں گم ہو جاؤں اور کمہار کے خدائی ہاتھوں میں مٹی کا محض ڈھیلا بن جاؤں تاکہ میری خدمت زیادہ یقینی ہو جائے اور میری اندرونی خواہشاتِ نفسانی کی طرف سے کوئی رکاوٹ حائل نہ کی جائے

ضمیمۂ نہم

ذیل کا خط مجھے مہاتما گاندھی نے سابرمتی جیل سے اپنی قید کے ابتدائی ایام میں ارسال کیا تھا:۔

"میرے پیارے چارلی۔۔

مجھے آپ کا خط ملا۔ آپ نے بہت ٹھیک کیا کہ اپنے کام کو نہیں چھوڑا۔ آپ کو یقیناً گرودیو (یعنی رابندرا ناتھ) کی خدمت میں جانا چاہیئے اور جب تک انہیں آپ کی ضرورت ہو، آپ کو ان کے پاس رہنا چاہیئے۔ میں یقیناً پسند کروں گا کہ جب کبھی آپ کو فرصت ملے آپ سابرمتی آشرم میں چلے جائیں اور وہاں کچھ عرصہ قیام کریں۔ لیکن میں آپ سے توقع نہیں کروں گا کہ آپ مجھ سے جیل میں آکر ملیں۔ میں پرندہ کی طرح بشاش ہوں۔ جیلخانہ کی زندگی کے بارے میں (بالخصوص ستیا گرہی کے لئے) میرا مطمح نظر یہ ہے کہ بیرونی دنیا سے تمام تعلقات یکقلم منقطع ہو جائیں۔ وزیٹر سے ملنے کی اجازت ایک رعایت ہے۔ اور مقاومت مجہول کرنے والے کو نہیں چاہیئے کہ وہ کسی رعایت کا طالب ہو یا رعایت سے مستفید ہو۔ جیلخانہ کے ڈسپلن کی مذہبی اہمیت ترک رعایت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ آنے والی قید میرے لئے سیاسی فائدہ سے معلوم ہوگی۔ اگر یہ قربانی ہے تو اسے پاکیزہ ترین نوعیت کی قربانی ہونا چاہیئے

اخلاص و محبت کے جذبات کے ساتھ

آپ کا

موہن"

ضمیمۂ دہم

ذیل کا خط جسے قدرے مختصر کر دیا گیا ہے، مہاتما گاندھی کی جانب سے حکیم اجمل خاں صاحب کے نام لکھا گیا تھا جو نیشنل کانگریس کے صدر تھے جبکہ وہ خود گرفتار ہو گئے تھے۔

"میں یہ خط آپ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے چیئرمین اور اس بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے یا زیادہ بہتر طریقہ سے تمام ہندوستان کے لیڈر کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں

میں آپ کو یہ خط اس لئے بھی لکھ رہا ہوں کہ آپ مسلمان لیڈروں میں نمایاں ترین افراد میں سے ہیں، لیکن سب سے بڑھکر میں آپ کو ایک محترم دوست کی حیثیت سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے ۱۹۱۵ء سے آپ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اور ہمارے روز افزوں تعلق نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آپ کی دوستی کو اپنے لئے خزانہ کی طرح قیمتی خیال کروں۔ ایک پکے مسلمان کی حیثیت سے آپ نے اپنی عملی زندگی سے ثابت کر دیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے

ہم سب کو احساس ہے اور اتنا احساس کبھی نہیں ہوا کہ اس اتحاد کے بغیر ہمیں آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس اتحاد کے بغیر مسلمانانِ ہندوستان مسئلہ خلافت میں بھی اتنی امداد نہیں پہنچا سکتے جتنی وہ پہنچانی چاہتے ہیں۔ اگر ہم الگ الگ رہے تو ہمیں ہمیشہ غلام

رہنا پڑے گا۔ لہٰذا یہ اتحاد ایسی حکمت عملی (پالیسی) کا حکم نہیں رکھتا کہ جب کبھی ہمارے لئے مناسب ہو ہم اسے مسترد کر دیں۔ ہم صرف ایک ہی حالت میں اسے مسترد کر سکتے ہیں اور وہ اس وقت جبکہ ہم سوراج سے تنگ آ گئے ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد ہمارا مذہب ہونا چاہیئے جو ہمیشہ کے لئے اور جملہ حالات کے ماتحت قایم رہنا چاہیئے

ساتھ ہی وہ اتحاد ایسا ہونا چاہیئے کہ اقلیتوں کے لئے باعث خطرہ نہ ہو جن میں پارسی، عیسائی، یہودی اور بہادر سکھ سب شامل ہیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک کو کچلنے کی کوشش کریں گے تو ایک نہ ایک دن ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا پڑے گا۔ جناب حکیم صاحب، میں آپ کا گرویدہ اس لئے بھی ہو گیا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ ہندو مسلم اتحاد کے حقیقی مفہوم پر ایمان رکھتے ہیں

یہ اتحاد اس وقت تک ناممکن الحصول ہے جب تک کہ ہم عدم تشدد کو مضبوط پالیسی کی حیثیت سے اختیار نہ کر لیں۔ میں اُسے پالیسی کہتا ہوں، کیونکہ وہ ~~ہن~~ اتحاد کے قیام تک محدود ہے۔ لیکن اس سے یہ مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ تیس کروڑ ہندو اور مسلمان جو تھوڑے دنوں کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متحد ہو گئے ہیں، دنیا کی تمام طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور اس لئے انہیں انگریز حکمرانوں کے ساتھ اپنے معاملات میں تشدد استعمال کرنا ایک بزدلانہ فعل سمجھنا چاہیئے۔ اب تک ہم نے اپنی سادہ لوحی کی بدولت اُن سے اور ان کی توپوں سے خوف کھایا ہے۔ جونہی کہ ہم نے اپنی متحدہ

طاقت کا احساس کر لیا اس وقت ہم اسے نامردی خیال کریں گے کہ ہم اُن سے خوف کھائیں یا ان پر وار کرنے کا خیال کریں۔ اس لئے میں اپنے اہلِ ملک کو یہ بات ذہن نشین کرانے کے لئے متفکر اور بے صبر ہوں کہ وہ اپنی کمزوری کا خیال کر کے نہیں بلکہ اپنی طاقت کا احساس کر کے عدم تشدد پر عمل پیرا ہوں لیکن میں اور آپ دونوں جانتے ہیں کہ ہم میں ابھی تک یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ طاقتور ہوتے ہوئے ہم عدم تشدد پر عمل پیرا ہیں۔ اور ہم یہ ایسا نہیں کر سکے ہیں اس لئے کہ ابھی تک ہندو مسلم اتحاد پالیسی کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ابھی تک دونوں کے دلوں میں بے اعتمادی اور اس کے نتیجہ کے طور پر خوف موجود ہے۔ مگر میں مایوس نہیں ہوا ہوں۔ جو ترقی ہم اس سلسلہ میں کر چکے ہیں وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ایک نسل کا کام اٹھارہ مہینے میں انجام دے لیا ہے۔ لیکن ابھی اس سے زیادہ بیشمار کام کرنا باقی ہے۔ نہ تو یہ دونوں قومیں اور نہ عامۃ الناس یہ محسوس کر سکے ہیں کہ ہمارا اتحاد اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ہمارے نتھنوں کے لئے سانس

اس اتحاد کے لئے ہمیں مقدار کی بجائے صفت پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہمیں ایسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی کافی تعداد مل جائے جو ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دائمی دوستی پر مجنونانہ اعتقاد رکھتے ہوں تو پھر عامۃ الناس میں اسی اتحاد کی روح پھیلنے کے لئے ہمیں زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم میں سے چند اشخاص کو ابتدا میں

صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم خیالات، الفاظ اور اعمال میں تشدد قبول کئے بغیر اپنے سیاسی مطمح نظر کی تکمیل میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں آپ سے عاجزی کے ساتھ درخواست کروں گا کہ ہماری صفوں میں ایسے کارکن داخل نہ ہونے پائیں جو اُس لازمی سچائی کی پوری اہمیت کو اچھی طرح سے نہ سمجھتے ہوں جسے میں نے آپ کے روبرو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اکثریت کی حکومت کے ذریعہ ایک زندہ اعتقاد پیدا نہیں کیا جا سکتا

میرے خیال میں سارے ہندوستان کے اتحاد کی ظاہری علامت اور اس امر کی ظاہری نشانی کہ عدم تشدد کو قبول کر لیا گیا ہے، بلا شبہ چرخہ ہے۔ صرف وہی لوگ جو ہندو مسلمانوں میں غیر متشددانہ روح اور ابدی دوستی قائم کرنے پر عقیدہ رکھتے ہوں، ہر روز اور مذہبی اسپرٹ کے ساتھ کام کرینگے۔ عام طور پر ہاتھ سے کاتنا اور عام طور پر ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کی تیاری اور استعمال حقیقی اتحاد اور عدم تشدد کا بڑا (اگرچہ قطعی نہیں) ثبوت متصور ہوگا۔ اور وہ گونگے اور بے زبان عامۃ الناس کے ساتھ زندہ تعلق کی ایک زبردست یادگار ہو گی۔ کوئی چیز امکانی لحاظ سے ہندوستان کے لئے اتنی زندگی بخش ثابت نہیں ہو سکتی جتنی یہ چیز ہو سکتی ہے کہ تمام ہندوستان چرخہ کو روزمرہ کی لازمی چیز قرار دے لے اور گھر کے کتے ہوئے کپڑے کے استعمال کو ایک فرض عین سمجھ لے

میں آج ایک کارکن کو بھی تخریبی کام پر ضائع نہیں کروں گا جبکہ تعمیری کام کی ایسی زبردست مقدار ہمارے پاس کام کرنے کی غرض

سے موجود ہے۔ لیکن تخریبی نشر و اشاعت کے کام میں مزید وقت صرف کرنے کے خلاف شاید سب سے زیادہ قطعی استدلال یہ حقیقت ہے کہ عدم رواداری کی روح (جو تشدد کی ایک قسم ہے) اس قدر مستولی کبھی نہیں ہوئی جتنی کہ آج کل ہو رہی ہے۔ معتدل خیالات والے سیاسی حضرات ہم سے الگ ہو گئے ہیں، وہ ہم سے ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ بیوروکریسی سے کہیں خراب بیوروکریسی کے قیام کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس قسم کے خوف کی ہر وجہ کو دور کر دیں۔ ہمیں ان کو اپنی طرف ملانے کی غرض سے اپنے مسلک سے ذرا آگے بھی بڑھ جانا چاہیئے۔ میں اس نکتہ پر زور نہ دیتا اگر ہر شخص آپ کی طرح یا میری طرح یہ سمجھ لیتا کہ عدم تشدد کی جو قسم ہم نے کھائی ہے وہ کٹر سے کٹر دشمن کے لئے بھی عاجزی اور نیک دلی کی مظہر ہے۔ یہ ضروری روح خود بخود پیدا ہو جائے گی اگر ہندوستان میرے کہنے کے مطابق تعمیری کام کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دی"

ضمیمۂ یازدہم

اپنڈلیسائیٹس کے عمل
ب مہاتماگاندھی سیسون ہاسپٹل واقع پونہ میں اپنڈلیسائیٹس کے عمل
راحی کے بعد بہت زیادہ بیمار ہوگئے تو اس وقت انہوں نے مجھے "ینگ انڈیا"
ل ایڈیٹری کا چارج لے لینے کے لئے حکم دیا۔ ذیل کا مقالۂ افتتاحیہ سے اس
تباین کا اندازہ ہو جائے گا جو اس وقت لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھا:۔
مہاتماگاندھی کا یہ زبردست اعتقاد ہے کہ انسان میں ایک ایسا جوہر لطیف ہے جسے
محبت کے ذریعہ فتح کیا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے تحریک عدم تعاون کی
ابتدا منافرت کے جذبہ کے ماتحت نہیں بلکہ محبت کے جذبہ کے ساتھ کی۔ اسی بنا
پر انہوں نے سچی محبت کی صفائی کے ساتھ اس جج سے گفتگو کی جس نے انہیں
قیدخانہ بھیجا تھا۔ اسی سبب سے انہوں نے "ینگ انڈیا" کے کالموں میں باربار
حکام وقت کے لئے اپنے پیش نظر مقصد کی وضاحت کے سلسلہ میں مقالات لکھے
تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ
دیکھنا کس قدر الم انگیز ہے کہ انگلستان میں ان کے خیالات کو غلط طریقہ سے سمجھا گیا ہے
اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ جو الزام مہاتماگاندھی نے ہندوستان کی برطانوی
حکومت پر قایم کیا ہے اس کا معنٰی کیا ہے تو اس کا جواب ایک فقرے میں دیا جا
سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے خلاف غربا پر ظلم کرنے کا الزام لگایا ہے۔ جو بیان
انہوں نے اپنے مقدمہ کے موقع پر دیا اس میں برطانوی راج کی مذمت اس فقرہ
کے ذریعہ کی تھی کہ وہ غربا پر ظلم کرتا ہے۔ کبھی کی محض ڈھانچہ رکھنے والی صورتیں

ات میں دیکھی تھیں وہ ہمیشہ ان کے
کیلئے بھی انہیں فراموش نہیں کرسکے۔ انہوں
شراب خواری اور منشیات کی تجارت کا
شریک ہوجائیں اور کاتنے اور بننے کی گھریلو
ں کی تعمیر کرنے میں مصروف ہوجائیں تو وہ
شغل کرنے لگ جائیں گے، لیکن ایسی ادنیٰ خدمت
م کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوا وہ اپنے ہی مربیانہ طریقہ
نہیں کریں گے۔ شاہی شہر دہلی کی بھڑکیلی شان و شوکت
ان کے خیالات پر مستولی تھی۔ وہ اس سادہ حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے میں غافل رہے
کہ اس کی تمام عیاشانہ شان و شوکت عزبار پر مزید بار ہوگی۔ انہوں نے اس پرخطیر
رقمیں صرف کیں یہاں تک کہ خزانہ خالی ہوگیا اور اس کے بعد انہوں نے کمی پورا کرنے
کی غرض سے نمک کے محصول کو دگنا کر دیا۔ قدیم دہلی کے کھنڈروں پر نئی دہلی کی تعمیر
میں جو کروڑہا روپیہ لگایا گیا ہے، اسے صرف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا لیکن بجائے
اس کے کروڑہا نیم فاقہ کش باشندوں کے لئے واحد ضرورتِ زندگی پر ٹیکس عائد
کر دیا گیا

مدتہائے دراز کی غلامی کے باعث ایک کمزوری ایسی پیدا ہوگئی ہے جس نے افسوس
ہے کہ خود ہندوستان کے دماغ کو متاثر کر دیا ہے اور جو نام و نمود کی جیسا کہ نئی دہلی کی
تعمیر سے ظاہر ہے اس بھدی خواہش کی تائید کرتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس کا نام
"غلامانہ ذہنیت" رکھا ہے۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی اسے منہ کھولے ہوئے مجبور

کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جو گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں جا نیکے عادی ہیں جب کبھی سرکاری افسران جلوس کی شکل میں ان کی سرپرستی کرتے ہیں یعنی شاہی دربار، بادشاہی دورے شاہی نمائشیں، سلطنت برطانیہ کی نمائشیں یہ سب ملک کی دولت کھینچنے لئے جا رہی ہیں اور زمانۂ حال میں انکی کثرت ہو گئی ہے تاکہ عامۃ الناس کی گھٹتی ہوئی توجہ کو پھر اپنی جانب کھینچا جا سکے

لیکن ہندوستان کا روحانی دل ان بھڑکیلی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ خاموشی کے ساتھ سیوون اسپتال (پونہ) میں اس واحد تھکے ہوئے مظلوم کی خدمتیں ہدیۂ احترام پیش کر رہا ہے جو ملاحوف ظاہر کئے موت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ نئی دہلی کا نام معمول جانے کے بعد بھی مدتہائے دراز تک ان کا نام زندہ رہے گا اور لوگ انکے ترانے گایا کریں گے۔ جب اسکی ساری عمارتیں گر کر خاک ہو جائینگی اسوقت مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ کہہ کر مہاتما گاندھی کا نام بتایا کرینگی کہ وہ ہندوستان کے بڑے بڑے بات دہندگان میں سے ایک تھے

کیونکہ ایک روحانی شہر بھی ہے جسکی وہ رہنما ہونیوالے ڈھانچے میں سے تعمیر کر رہے ہیں۔ اسکی بنیادیں گہرے اور صحیح طریقہ سے خدا کی سلطنت میں قایم کر دی گئی ہیں غربا کے کسی ظلم کو اسکی تعمیر میں کوئی دخل نہیں۔ حاجتمندونکے ساتھ محبت، عقیدتمندانہ خلوص اور خدمت اسکی گلکاریاں ہیں، اسکے حدود کے اندر کوئی فوجی شان و شوکت حکمران نہیں ہے، لیکن صرف انسانی روحوں کا صلح جو یانہ اتفاق وہاں حکمران ہے نسل اور رنگ کے اختلافات وہاں موجود نہیں ہیں۔ وہاں کے اتحاد و اتفاق میں مذہبی مباحث کی آویزش نظر نہیں آتی۔ یہ سلطنت دل ہے

ضمیمۂ دوازدہم

حسب ذیل قرارداد طویل برت کے زمانہ میں اتحاد کانفرنس منعقدہ دہلی میں بالاتفاق منظور ہوئی تھی۔ چیئرمین نے کرسی صدارت سے اسے پیش کیا تھا اور کانفرنس کے تمام ممبران نے مہاتما گاندھی کے روزہ کی یاد میں اسے کھڑے ہوکر منظور کیا تھا:-

• یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کے برت پر اپنے گہرے رنج اور اپنی عمیق تشویش کا اظہار کرتی ہے۔

• ہماری پختہ رائے ہے کہ ضمیر اور مذہب کی مکمل آزادی بنایت ضروری چیز ہے اور اس لئے ہم عبادتگاہوں کی خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں، بے حرمتی کی اور اسی طرح نیا مذہب قبول کر لینے یا پھر اسی کی طرف لوٹ جانے کی بنا پر کسی شخص کی ایذا رسانی یا تکلیف دہی کی بھی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ اور مزید برآں ہم لوگوں کو بالجبر اپنے مذہب میں داخل کرنے کی تمام کوششوں کو یا دوسرے مذاہب کے حقوق کو نقصان پہنچا کر اپنے مذہبی شعار کی ادائگی یا بالجبر ادائگی کو مذموم سمجھتے ہیں۔

• ہم مہاتما گاندھی کو یقین دلاتے ہیں اور اس بات کا پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی انتہائی کوششیں ان اصولوں کو ترقی دینے میں اور ان سے سرمو انحراف کی خواہ کسی اشتعال کے ماتحت ہی ایسا کیوں نہ کیا جائے، مذمت کرنے میں صرف کردیں گے۔